اردو زبان ـ مسائل اور امکانات

ترتیب و تدوین

سید شوکت علی شاہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

maablib.org

اردو زبان ـ مسائل اور امکانات

(مقالات عالمی اردو کانفرنس ملتان ۱۹۹۴ء)

ترتیب و تدوین

سید شوکت علی شاہ

مجلس تقریباتِ ملی

بہ اشتراک

مجلس زبان دفتری ملتان

جملہ حقوق محفوظ

اشاعت اول : اگست ۹۴ء

تعداد : ایک ہزار

قیمت : ۲۵۰ روپے (دو سو پچاس روپے)

ناشر : مجلس تقریبات ملی پاکستان

پروڈکشن : پلس کمیونی کیشنز لاہور۔ فون ۱۹-۳۶۱۰

پرنٹر : سلور لنک پریس۔ لاہور

انتساب

میاں محمد نواز شریف
وزیر اعظم پاکستان
کے نام

maablib.org

فہرست

عرض مرتب	سید شوکت علی شاہ	9
مقدمہ	ڈاکٹر طاہر تونسوی	13
عالمی اردو کانفرنس 1992ء		
خطبہ استقبالیہ	سید شوکت علی شاہ	19
خطبہ صدارت (نشست اول)	غلام حیدر وائیں (وزیر اعلیٰ پنجاب)	25
خطبہ صدارت (نشست دوم)	(ملک سلیم اقبال)	31
	وزیر اطلاعات و ثقافت پنجاب	
پاکستان میں نفاذ اردو کا مسئلہ	احمد ندیم قاسمی	35
اردو زبان بھارت کے تناظر میں	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ	39
پاکستان کا دفتری نظام اور اردو	ڈاکٹر جمیل جالبی	51
بھارت میں اردو	ڈاکٹر خلیق انجم	57
ہندوستان میں اقبالیات آزادی کے بعد	پروفیسر جگن ناتھ آزاد	71
اردو میں سائنسی تعلیم	اشفاق احمد	107
اردو - قومی رابطے کی زبان	پروفیسر پریشان خٹک	117
اردو کے لئے انگریزی کی ضرورت	ڈاکٹر عرش صدیقی	121

اردو کی ترقی میں علمی و ادبی اداروں کا کردار | ڈاکٹر سلیم اختر | 135
اردو تحقیق کی روایت اور صورت حال | ڈاکٹر سید معین الرحمٰن | 141
اردو کی ترویج میں صحافت کا کردار | محمد صلاح الدین | 149
ہمارا ذریعہ تعلیم اور اردو | ڈاکٹر آغا سہیل | 159
اردو کی ترویج میں علمائے دین کی خدمات | صاحبزادہ حامد سعید کاظمی | 165
اردو زبان اور ہماری تعلیم و تربیت | سید مشکور حسین یاد | 183
پاکستانی کلچر اور اردو زبان | ڈاکٹر انوار احمد | 191
اردو زبان میں ترجمے کی روایت | ڈاکٹر مرزا حامد بیگ | 197
اردو اور ہمارا قومی تشخص | ڈاکٹر محمد امین | 217
ایران میں اردو | آقائے شاہ رخ عرب شاہی | 225
چین میں اردو | لیوان وے شوائے | 231
ناروے میں اردو | جمشید مسرور | 233

ضمیمے:۔

(ا) عالمی اردو کانفرنس کی قرار دادیں | 239
(ب) عالمی اردو کانفرنس - خطوط و تحریروں کے آئینے میں | 243

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض مرتب

پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد ہماری قومی زبان اردو نے جس طرح کسمپرسی کے عالم میں کبھی انصاف طلب نگاہوں سے اربابِ بست و کشاد کو دیکھا ہے اور کبھی امداد طلب نظروں سے اہلِ وطن کو پکارا ہے ' وہ ہماری قومی تاریخ کا ایک المناک باب ہے۔۔۔۔ خاص طور پر ہمارے مغرب زدہ طبقے نے جو غیریت' مخاصمت اور عدم توجہی اس زبان کے ساتھ رَوا رکھی ہے اس کی کہیں مثال نہیں ملتی' ایک طویل جد و جہد اور قربانیوں کی خونچکاں داستان رقم کرنے کے بعد ایک نئی مملکت تو وجود میں آگئی لیکن فکر و نظر آزاد نہ ہوسکی۔ غلامانہ ذہنیت نہ بدلی' حاکمانہ روش' سرگشتہ خمارِ رسوم و قیود رہی۔ ایک انتہائی قلیل لیکن منظم و موثر گروہ پیر تسمہ پا کی طرح قوم کے حواس اور اعصاب پر سوار رہا۔

پاکستان غالباً" دنیا کا واحد ملک ہے جہاں پر اونچے طبقے میں اردو اور اس کا پڑھنا اور لکھنا معیوب سمجھا جاتا رہا۔ کسی کی علمیت کی تعریف ان الفاظ میں کی جاتی "یار وہ پڑھا لکھا آدمی ہے اسے اردو زبان بالکل نہیں آتی" اعلیٰ سروسز تک رسائی' ترقی کے مواقع سماجی حیثیت اور مرتبے ایک ایسی زبان کے مرہونِ منت رہے جس سے اس ملک کی پچانوے فی صد آبادی قطعی طور پر نابلد اور ناآشنا تھی۔ لیکن ایک طویل

عرصے تک قوم کو طفل تسلیاں دی جاتی رہیں کہ اردو کو جلد ہی اس کا جائز مقام دلایا جائے گا ایک مدت تک اہلِ وطن اس پُر فریب وعدۂ فردا پر اعتبار کرنے کے خوگر ہو گئے۔

یہ امر مسلّمہ ہے کہ دنیا میں کوئی قوم اپنی زبان کے بغیر ترقی کی منازل طے نہیں کر سکتی۔ اردو کو جسے ایک ارب لوگ بولتے، پڑھتے، لکھتے یا سمجھتے ہیں، محض اس لئے طاقِ نسیاں میں نہیں رکھا جاسکتا کہ اس میں جدید سائنسی علوم کو اپنے اندر سمونے یا جذب کرنے کی سکت نہیں ہے۔ اس مدقوق منطق کا اس وقت بھی سہارا لیا گیا جب لاطینی زبان میں لکھے گئے علوم کو انگریزی کے قالب میں ڈھالا جا رہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اب بھی ستر فی صد سائنسی علوم دیگر زبانوں میں ہیں، تو کیا یہ ضروری ہے کہ انگریزی کے ساتھ ساتھ روسی، چینی، جرمنی، فرنچ، اطالوی اور ہسپانوی زبانیں بھی پڑھی جائیں؟ در اصل جب ہم اردو کی ترقی اور ترویج کی بات کرتے ہیں تو انگریزی کی اہمیت سے انکار نہیں کرتے۔ کسی بھی زبان کا جاننا ایک احسن اور مفید بات ہے۔ اس سے فکر کو جِلا ملتی ہے اور اذہان کے کئی بند در وا ہوتے ہیں یہ زبانیں ضرور سیکھیں لیکن اردو کی قیمت پر یا اردو کی قربانی دے کر نہیں، پہلے اپنی قومی زبان سیکھیں، اس پر فخر کریں اور پھر جو زبان بھی سیکھیں گے وہ سونے پر سہاگہ ثابت ہوگی۔

جب بھی قومی درد رکھنے والے صاحبِ اقتدار نے اردو کو دفتری زبان بنانے کی سنجیدہ کوشش کی تو مفاد پرستوں نے یہ کہہ کر طنز کا طوق اس کے گلے میں ڈال دیا کہ وہ اَن پڑھ ہے یا احساسِ کمتری کا شکار! ——— جناب غلام حیدر وائیں، وزیرِ اعلیٰ پنجاب اس اعتبار سے مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے تمام رکاوٹوں کی پرواہ کئے بغیر، بیک جنبشِ قلم یہ فرمان صادر فرمایا ہے کہ تمام دفتری کام قومی زبان میں کیا جائے اور انہیں تمام "سمریاں" اردو میں بھجوائی جائیں۔ ملتان میں عالمی اردو کانفرنس کا انعقاد اسی تناظر میں ہوا۔ ایک عرصہ سے کراچی، راولپنڈی اور لاہور میں عالمی اردو کانفرنس منعقد کرانے کے چرچے ہو رہے تھے اس سلسلے میں مجھے اور میرے رفقاء کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا وہ اب ماضی کا حصہ بن چکی ہیں۔ رکاوٹوں کے دام ہر

موج میں کئی نہنگ منہ کھولے کھڑے تھے، لیکن اہلِ ملتان اور اہلِ وطن نے ہر سازش کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور بالآخر کشتیٔ اردو، کشتیٔ نوح کی طرح ڈولتی، پھسلتی ساحلِ مراد تک جا پہنچی۔ یہ ایک تاریخی واقعہ تھا جس کی ملکی اور عالمی سطح پر بڑی پذیرائی ہوئی۔ کانفرنس میں شریک ملکی اور غیر ملکی دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں نے جس طرح اس عمل کو سراہا وہ ہمارے لئے ایک قابلِ فخر سرمایہ ہے۔

میں نے اپنے اختتامی خطبے میں اس بات کا اعلان کیا تھا کہ کانفرنس میں پڑھے جانے والے مقالات کو کتابی شکل میں محفوظ کر دیا جائے گا تاکہ اردو زبان کے بارے میں تحقیق کرنے والوں کے لئے یہ مواد یکجا ہو جائے اور دستاویز کی شکل میں موجود ہو۔ مقامِ مسرت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میری یہ کوششیں رنگ لائیں اور ان مقالات کو "اردو زبان۔ مسائل اور امکانات" کے نام سے شائع کیا جا رہا ہے۔ مقالات کے آخر میں دو ضمیمے بھی ہیں ایک ضمیمہ کانفرنس کی منظور کردہ قرار دادوں پر مشتمل ہے جبکہ دوسرے ضمیمے میں عالمی اردو کانفرنس کے بارے میں وہ آراء اور خطوط شامل کئے گئے ہیں جن سے اس کانفرنس کے انعقاد، اس کی افادیت اور اردو زبان کی اہمیت پر بھرپور روشنی پڑتی ہے امید ہے کہ یہ دستاویز اردو زبان کے بارے میں ایک بھرپور حوالے کا کام دے گی اور اردو کے لئے مزید کام کرنے کی تحریک بھی پیدا کرے گی۔

اردو کانفرنس کے انعقاد کے سلسلے میں جن احباب نے ہمارے ساتھ تعاون کیا ہے میں ان سب کا شکر گزار ہوں ڈاکٹر طاہر تونسوی نے اس سلسلے میں کافی محنت کی ہے اور اس کتاب کا مقدمہ لکھ کر اسے مزید اہم بنا دیا ہے۔

اگر ہم کامیاب رہے ہیں تو اس میں تمام دانشوروں اور ہمدردوں کا حصہ نمایاں ہے ہم نے انتہائی خلوص کے ساتھ قوم کو ایک بار پھر یہ یاد دلانے کی کوشش کی ہے کہ اردو کو اس کا صحیح مقام دلانے کا مقصد ابھی مزید سعی و جہد کا متقاضی ہے۔

مجھے اس موقع پر اعتراف کرنا ہے کہ جناب غلام حیدر وائیں وزیر اعلیٰ پنجاب کی مدد، معاونت اور رہنمائی کے بغیر اس کانفرنس کا انعقاد ممکن نہ تھا۔ جناب غلام حیدر

دائیں کی اردو زبان سے محبت محض ایک جذباتی رویہ نہیں ہے بلکہ وہ شعوری طور پر اردو زبان کو اس کا صحیح مقام دلانے کی شدید آرزو رکھتے ہیں ان کا یہ رویہ ہم سب کے لئے حوصلے اور امید کا سرچشمہ ہے۔

جناب محمد نواز شریف' وزیر اعظم پاکستان کے نام اس کتاب کا انتساب ان سے میری جذباتی وابستگی ہی کا عکاس نہیں بلکہ اردو کے استحکام کے لئے ان امیدوں کا مظہر بھی ہے جو مجھے ان کی ذات سے ہمیشہ رہی ہیں۔

سید شوکت علی شاہ
کنوینر عالمی اردو کانفرنس ملتان

manglib.org

مقدمہ

ملتان میں عالمی اردو کانفرنس کے انعقاد کو بہت سے لوگ ایک خواب سمجھتے تھے۔ ایسا خواب جس کی تعبیر ممکن نہیں، تاہم ۲۳ اپریل ۱۹۹۲ء بروز جمعرات انہوں نے کیا ساری دنیا نے دیکھا کہ عالمی اردو کانفرنس بڑے طمطراق سے ہوئی اور لمحۂ موجود تک اس کی بازگشت سنی جا رہی ہے اور جب تک اس خطۂ ارض پر اردو بولنے والا ایک بھی شخص موجود ہے اس کا حوالہ ضرور آئے گا۔ عالمی اردو کانفرنس کے خواب کو عملی تعبیر دینے والے دانشور ادیب، سفرنامہ نگار سید شوکت علی شاہ ہیں جن کے بارے میں سید ضمیر جعفری نے لکھا ہے "جرمنی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جرمنی کئی قیصر تو پیدا کر سکتا ہے۔ مگر دوسرا گوئٹے پیدا نہیں کر سکتا۔ اسی طرح تلہ گنگ ڈپٹی کمشنر، بلکہ جرنیل تک تو کئی پیدا کر سکتا ہے مگر دوسرا شوکت علی شاہ شاید ہی پیدا کر سکے۔"

(مکتوب بنام طاہر تونسوی)

اسی طرح قتیل شفائی نے عالمی اردو کانفرنس کے بارے میں رائے دیتے ہوئے کہا ہے:

"عالمی اردو کانفرنس اور مشاعرہ ایک نثر نگار کے خلوص و عمل کی شاعری ہے اور اس نثر نگار کا نام ہے سید شوکت علی شاہ۔ یہ معتبر نام ملتان کی ادبی اور ثقافتی تاریخ کا حصہ تو بن ہی چکا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ان کے ہاتھوں لگایا ہوا یہ درخت آگے چل کر ایسے لذیذ پھل پیدا کرے گا جو اہلِ ملتان ہی نہیں پورے پاکستان کو اپنے باغبان کی یاد دلاتے

رہیں گے۔"

اس میں کوئی شک بھی نہیں عالمی اردو کانفرنس کا انعقاد ایسا قابلِ قدر کارنامہ ہے جس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے! اس لیے کہ قومی زبان کے نفاذ کے اہم ترین مسئلے پر گفتگو کرنے کے لئے دنیا بھر سے اردو کے بہی خواہوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا آسان کام نہیں مگر سید شوکت علی شاہ نے ایسا کر دکھایا ہے اور سنگین مخالفتوں کے باوجود اور راہ میں حائل بے پناہ رکاوٹوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس قومی فریضے کو اپنے انجام تک پہنچایا۔ ان کا یہ کارنامہ بلاشبہ اردو ادب کی تاریخ میں سنہرے حرفوں سے لکھا جائے گا۔ اور ان کا شمار بھی اردو کے محسنین میں ہو گا۔

اردو ہماری قومی زبان ہے ہماری تہذیب اور کلچر کا ایک توانا نشان۔ تحریک پاکستان اور قیامِ پاکستان کی جدو جہد میں اردو بھی برابر کی شریک رہی ہے اسی لئے حضرت قائد اعظمؒ نے ارشاد فرمایا تھا کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو اور صرف اردو ہو گی۔ اردو کی جامعیت اور وسعت پذیری کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کرۂ ارض پر جہاں بھی انسانی وجود موجود ہے وہاں اردو ضرور بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اقوامِ متحدہ کے ادارہ یونیسکو کے ایک سروے کے مطابق دنیا بھر میں سمجھی اور بولی جانے والی زبانوں میں انگریزی اور چینی کے بعد یہ تیسری بڑی زبان ہے اور اس کے سمجھنے اور بولنے والوں کی تعداد پچاس کروڑ سے کم نہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

مقتدرہ قومی زبان نے ڈاکٹر وحید قریشی کی ہدایت پر غیر ممالک میں اردو کے سلسلے میں جو پمفلٹ شائع کئے ہیں ان کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

ترکی میں اردو (کرنل مسعود اختر شیخ) کویت میں اردو (محبوب امین نجمی) جاپان میں اردو (ڈاکٹر تبسم کاشمیری) متحدہ عرب امارات میں اردو (محمد کبیر خان) قطر میں اردو (ڈاکٹر گوہر نوشاہی) مصر میں اردو (ڈاکٹر عبدالستار جوہر پراچہ) برطانیہ میں اردو کے چار سال (ڈاکٹر انعام الحق جاوید) چین میں اردو (کوثر جمال) سعودی عرب میں اردو (محمد حنیف شاہد) مشرقی ممالک میں قومی زبان کے ادارے (عطش درانی) مغربی ممالک میں ترجمے کے قومی اور عالمی مراکز (عطش درانی) قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح اپنے ملک میں اردو کی ترویج

و ترقی کے لئے جو کام ہوا ہے اس کے بارے میں جو پمفلٹ شائع ہوئے ہیں ان میں چترال میں اردو (عنایت اللہ فیضی) بلوچستان میں نفاذ اردو (ڈاکٹر انعام الحق کوثر) آزاد کشمیر میں نفاذِ اردو (پروفیسر ایوب صابر) اردو اور بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان (ڈاکٹر طاہر تونسوی) جامعہ کراچی میں اردو (طارق محمود) اردو اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی (بشیر محمود اختر) خصوصی مطالعے کے لائق ہیں اسی طرح ڈاکٹر جمیل جالبی کی ادارت میں مقتدرہ قومی زبان کے رسالے "اخبارِ اردو" نے اکتوبر نومبر ۱۹۹۰ء (حصہ اول) اکتوبر ۱۹۹۱ء (حصہ دوم) کے شمارے بیرونی ممالک میں اردو کے حوالے سے شائع کئے ہیں اس کی براعظم وار تفصیل بڑی دلچسپ اور حوصلہ افزاء ہے۔

متحدہ عرب امارات ' ملائشیا ' افغانستان ' برما ' نیپال ' قطر ' ایران ' جاپان ' چین ' سعودی عرب ' سری لنکا ' مالدیپ ' کویت ' بھارت ' مقبوضہ کشمیر ' خلیج ' بنگلہ دیش ' روس ' ترکی ' (براعظم ایشیا)

جرمنی ' برطانیہ ' اطالیہ ' ناروے ' چیکوسلواکیہ ' فرانس ' ڈنمارک ' پرتگال ' ہالینڈ ' سویڈن (براعظم یورپ)

نیروبی ' جوہنسبرگ ' صومالیہ ' مصر (براعظم افریقہ)

شکاگو ' شمالی امریکہ ' کینیڈا (براعظم امریکہ)

آسٹریلیا (براعظم آسٹریلیا)

اسی طرح فروری مارچ ۱۹۹۲ء کا عالمی اردو کانفرنس نمبر ماریشس بھی قابلِ ذکر ہے۔ اس سے اردو کی وسعت اور مقبولیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ان سب کے پس منظر میں جب ہم ملتان کی عالمی اردو کانفرنس کو رکھ کر دیکھتے ہیں تو ایک حوصلہ مندانہ صورتِ حال سامنے آتی ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد پہلی بار اس سطح کا اکٹھ ہوا ہے اور اس سنجیدہ قومی مسئلے پر گفتگو کا ڈول ڈالا گیا ہے اور پھر سید شوکت علی شاہ نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں جس جرأت مندی سے نفاذِ اردو کی راہ میں حائل عوامل کا تذکرہ کیا اور پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ جناب غلام حیدر وائیں نے اپنے خطبۂ صدارت میں جس والہانہ انداز میں نفاذِ اردو کے عملی اقدامات کا ذکر کیا اس کی بنا پر یہ اُمید کی جاسکتی ہے کہ اس کانفرنس کی بدولت پاکستان

میں اردو کا چرچا ضرور ہوگا اور اسے اس کا آئینی حق بھی مل جائے گا۔

اشفاق احمد نے اسی لئے مجھے اپنے ۳ جون ۱۹۹۳ء کے خط میں لکھا ہے۔

"آپ کی کانفرنس کی دھوم لاہور میں زیادہ رہی کہ جو لوگ اس میں شریک نہ ہو سکے اب تک کفِ افسوس مل رہے ہیں لیکن کانفرنس کی اس دھوم کو "دھام" میں بدلنے کا سہرا چیف منسٹر کے سر ہے کہ وہ جہاں بھی اردو کا ذکر آتا ہے۔ اس کانفرنس کا آنکھوں دیکھا حال ضرور بیان کرتے ہیں"۔

یوں دیکھا جائے تو عالمی اردو کانفرنس نے پورے ملک میں نفاذِ اردو کے سلسلے میں ایک ہلچل مچادی ہے اور ایک لحۂ فکریہ مہیا کیا ہے۔

عالمی اردو کانفرنس کے کامیاب انعقاد کے بعد سید شوکت علی شاہ نے ایک قابلِ قدر اقدام یہ کیا کہ کانفرنس میں پڑھے جانے والے مقالات کو کتابی شکل میں ترتیب دے دیا ہے اور اگرچہ جناب احمد ندیم قاسمی اور پروفیسر پریشان خٹک اپنی بعض دفتری اور نجی مجبوریوں کی بنا پر کانفرنس میں شریک نہ ہو سکے تاہم ان کے مقالات اس کتاب میں شامل کر لئے گئے ہیں جو ایک اچھی بات ہے۔ "اردو زبان ـــــ مسائل اور امکانات" مقالات کے موضوعات اور معیارات کے تناظر میں ایک مستند دستاویز ہے اور ان کے عنوانات سے ہی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اردو کے بارے میں کس قدر جان دار اور شاندار طریقے سے مقالے تحریر کئے گئے ہیں۔ نفاذِ اردو کے سلسلے میں حائل دشواریوں کا ذکر کیا گیا ہے اردو کے علمی و ادبی اداروں کی کارکردگی کا جائزہ لیا گیا ہے اور غیر ممالک میں اردو کی ترویج کے سلسلے میں کی جانے والی کوششوں کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے اس اعتبار سے یہ ایک مکمل خاکہ ہے جس میں بھرپور رنگ بھرا گیا ہے اور اردو زبان کی ایک واضح تصویر سامنے آگئی ہے۔ سید شوکت علی شاہ کی یہ مرتبہ کتاب اردو زبان و ادب پر کام کرنے والوں کے لئے ایک حوالے کا کام دے گی اور اس میں شامل مقالات کے مطالعے سے اردو کے بارے میں گفتگو کرنے اور نفاذِ اردو کے مباحث سمیٹنے میں خاصی مدد ملے گی اور پھر یہ کتاب اردو کی ترویج اور ترقی کے لئے بھی پیش خیمہ ثابت ہوگی۔ میں سید شوکت علی شاہ کو عالمی اردو کانفرنس کے کامیاب انعقاد اور اس اہم ترین کتاب کی ترتیب و تدوین پر

وزیر اعلیٰ پنجاب جناب غلام حیدر وائیں عالمی اردو کانفرنس سے خطاب کر رہے ہیں

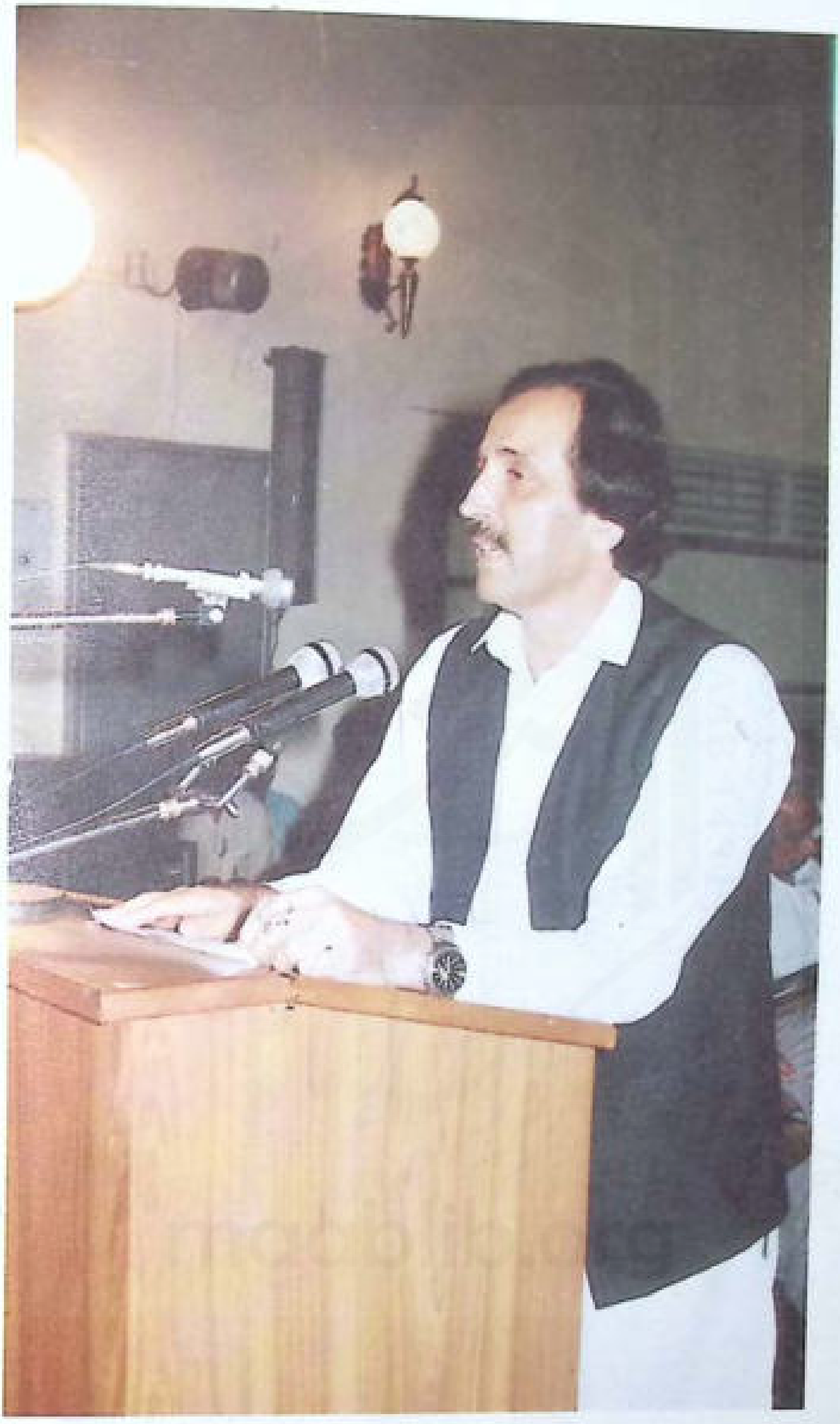

میزبان سید شوکت علی شاہ خطبہ استقبالیہ پیش کر رہے ہیں

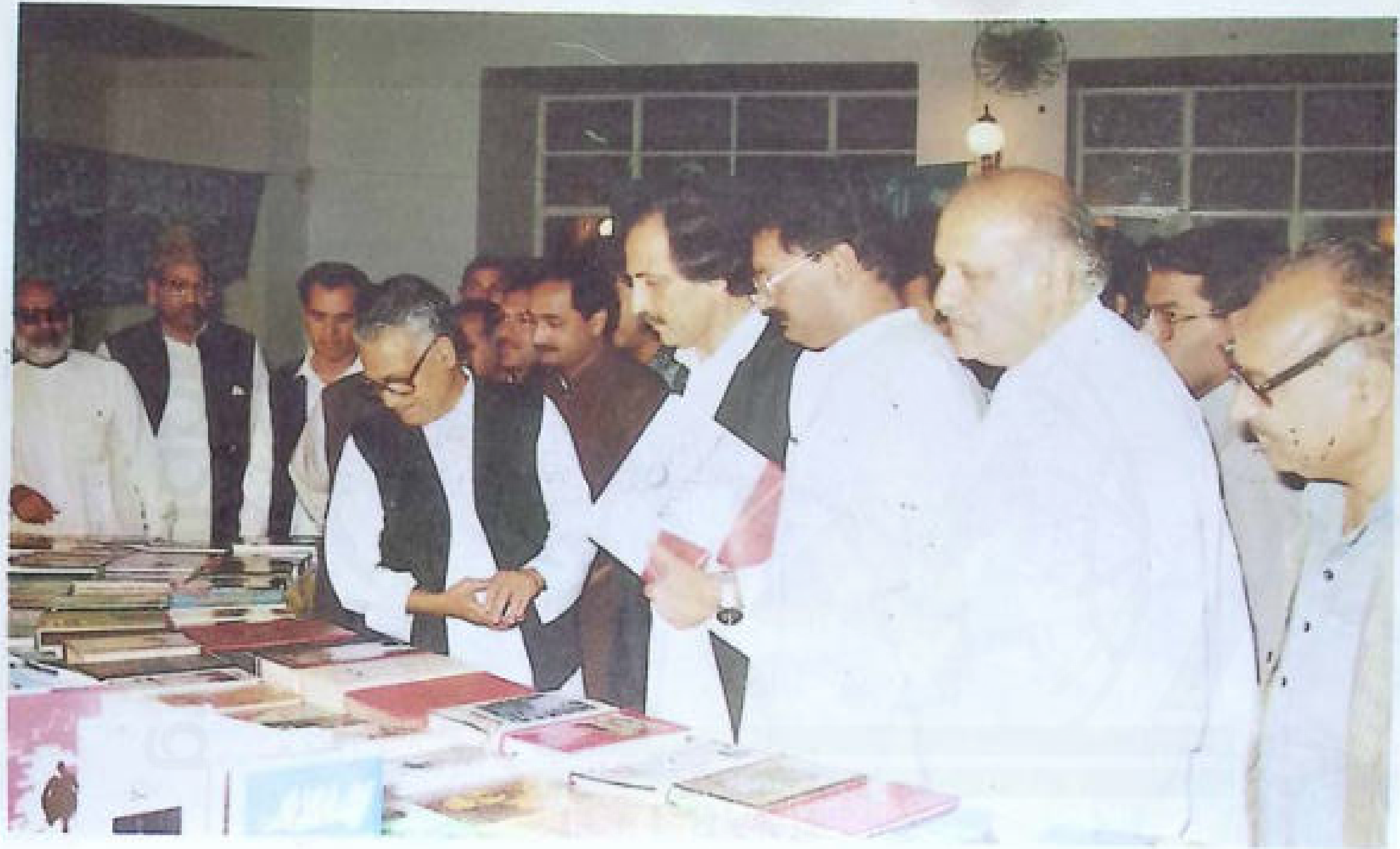

عالمی اردو کانفرنس ۔ کتابوں کی نمائش وزیر اعلیٰ پنجاب غلام حیدر وائیں اور دیگر شرکاءِ نمائش کا اہتمام جناب اے کریم ملک ایڈیشنل رجسٹرار
بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی نے نہایت خلوص سے کیا)

عالمی اردو کانفرنس (سٹیج پر ڈاکٹر جمیل جالبی' ڈاکٹر سلیم اختر' غلام حیدر وائیں (وزیر اعلیٰ پنجاب)' سینیٹر حامد رضا گیلانی' میزبان سید شوکت علی شاہ اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ)

میزبان سید شوکت علی شاہ سپاس نامہ پیش کر رہے ہیں

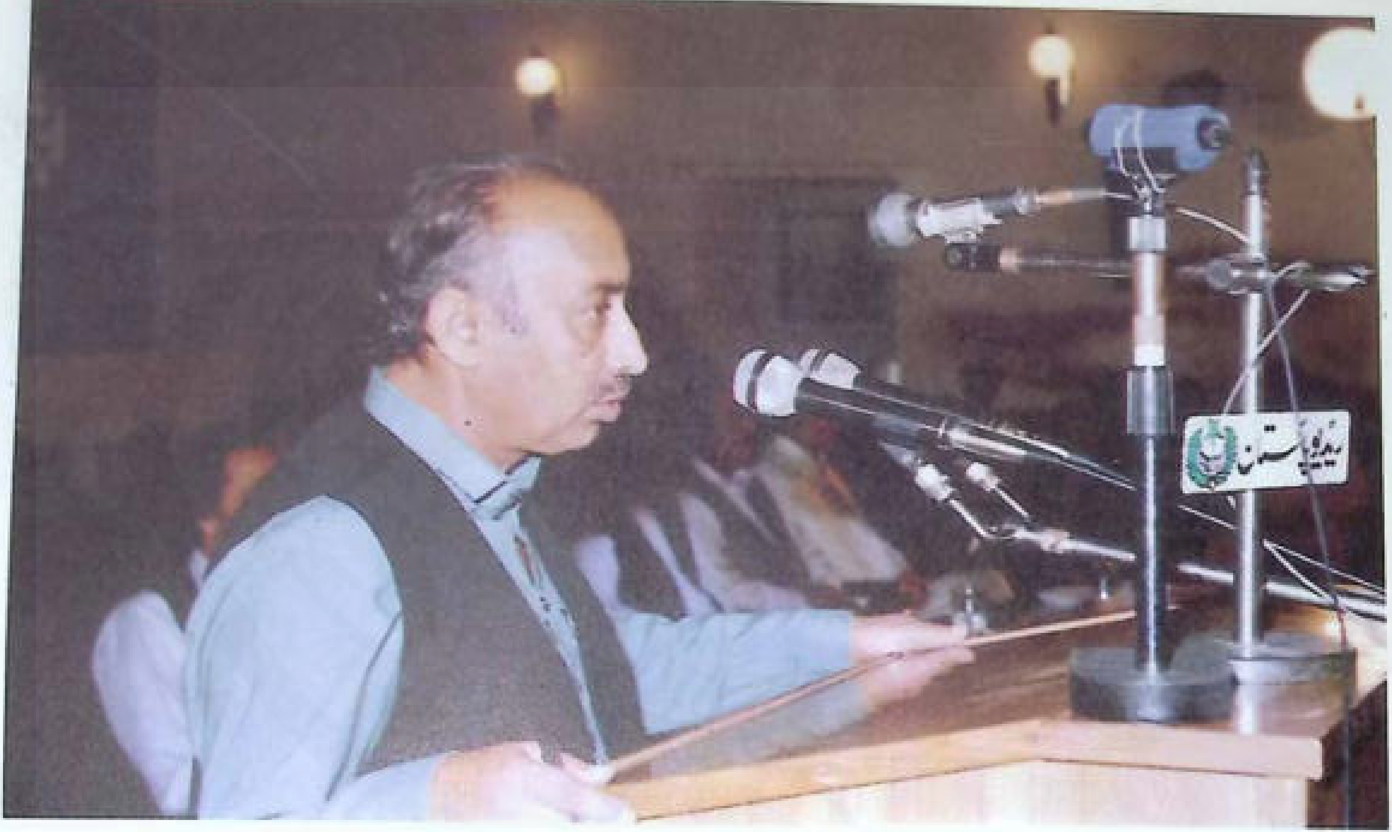

ڈاکٹر طاہر تونسوی اظہار خیال کر رہے ہیں

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ تقریر کر رہے ہیں

ڈاکٹر خلیق انجم (بھارت) تقریر کر رہے ہیں

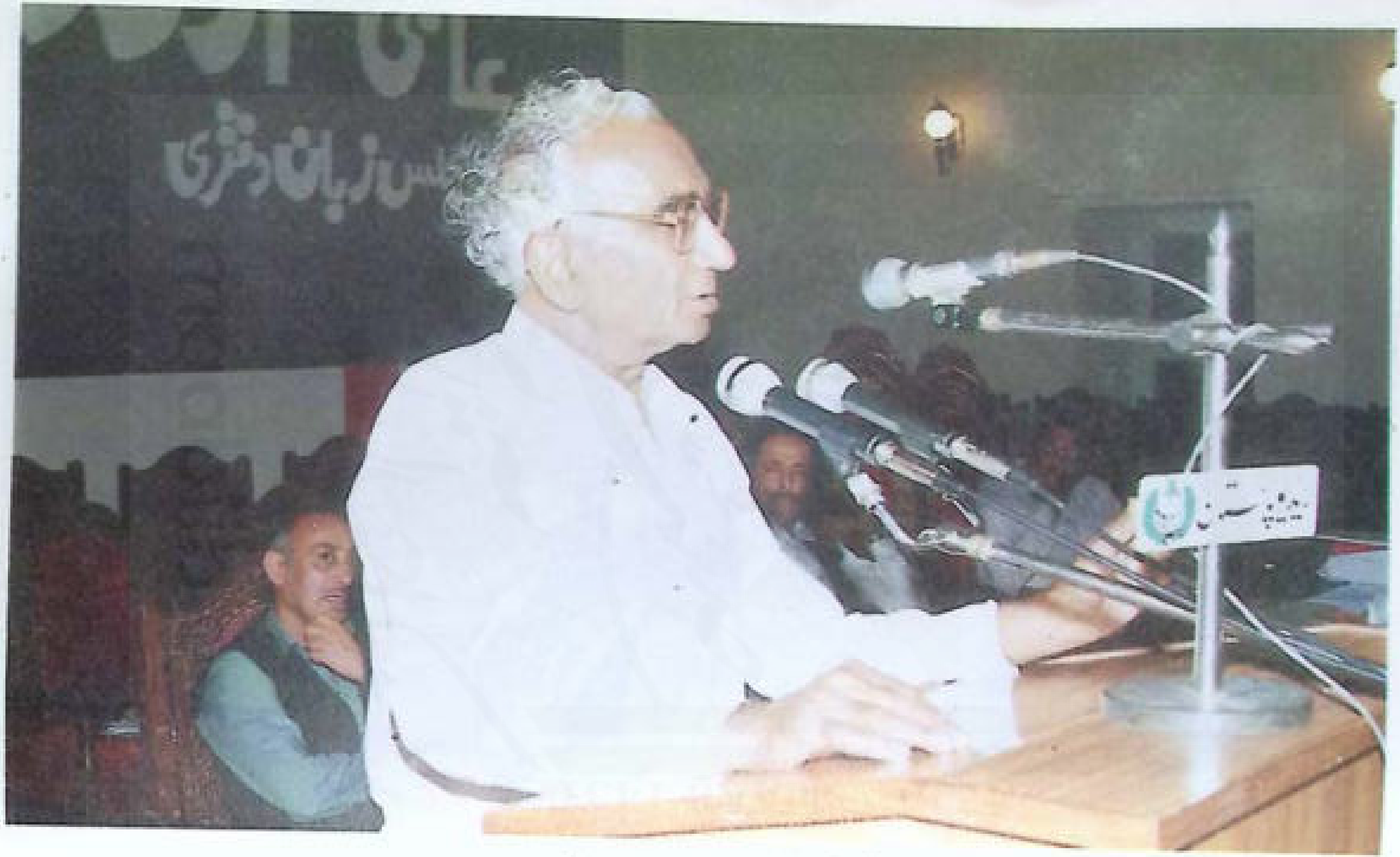

پروفیسر جگن ناتھ آزاد (بھارت) خطاب کر رہے ہیں

جناب ڈاکٹر وحید قریشی اظہار خیال کر رہے ہیں

جناب اشفاق احمد اپنا مقالہ پڑھ رہے ہیں

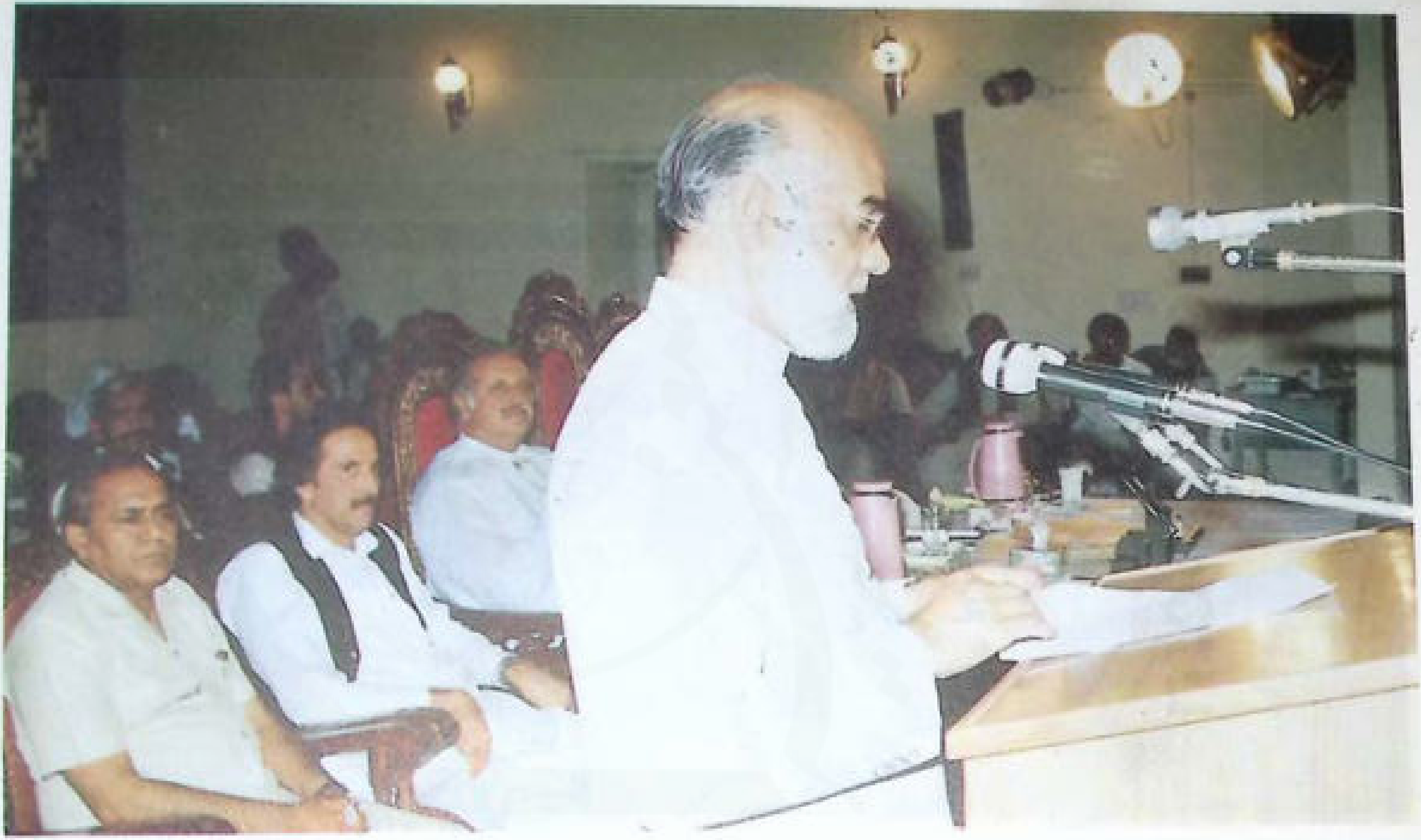

جناب محمد صلاح الدین "مدیر تکبیر" اپنا مقالہ پڑھ رہے ہیں۔

ڈاکٹر عرش صدیقی اظہار خیال کر رہے ہیں

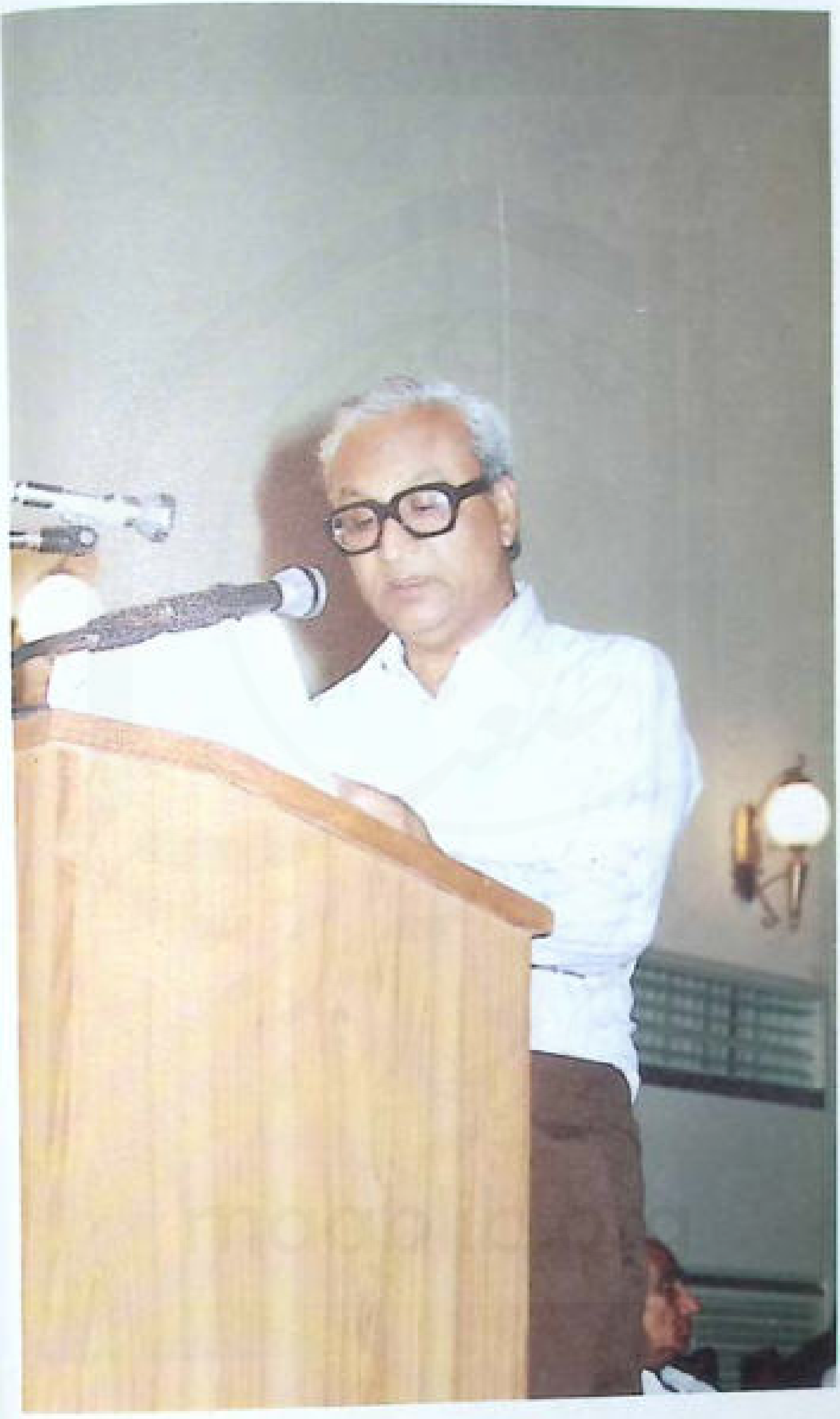

ڈاکٹر سلیم اختر اپنا مقالہ پیش کر رہے ہیں

عالمی اردو کانفرنس کے شرکاء۔ نامور ادیب و شاعر نمایاں ہیں

عالمی اردو کانفرنس کے شرکاء - گوشہ خواتین

دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ ان کی یہ عظیم کاوش تاریخِ ادبِ اردو میں آفاقی قدروں کی حامل ہوگی اور جب تک اردو زندہ ہے۔ کانفرنس اور اس دستاویزی کتاب کے حوالے سے سید شوکت علی شاہ کا نام بھی زندہ رہے گا اور اہلِ وطن کے علاوہ دنیا بھر کے اردو دان طبقے سے انھیں خراجِ تحسین ملتا رہے گا۔

ڈاکٹر طاہر تونسوی
پرنسپل گورنمنٹ کالج سول لائنز ملتان
سیکرٹری عالمی اردو کانفرنس، ملتان

ملتان : ۱۰ / جون ۱۹۹۲ء

maablib.org

maablib.org

خطبۂ استقبالیہ

جناب صدر، محترم مہمانانِ گرامی، معزز خواتین و حضرات!

السلام علیکم! ملتان کی یہ روشن صبح آج اس اعتبار سے کچھ زیادہ تابناک نظر آ رہی ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں نامور محقق اور دانشور، زلفِ اردو سنوارنے یہاں تشریف لائے ہیں، میں آپ کو اہلِ ملتان اور اپنی طرف سے خوش آمدید کہتا ہوں۔ ہم عوامی وزیرِ اعلیٰ جناب غلام حیدر وائیں کے بھی تہہِ دل سے سپاس گذار ہیں کہ ہماری دعوت قبول کرتے ہوئے وہ یہاں تشریف لائے اور اس طرح اُن کی آمد سے اس محفل کو یک گونہ رخشندگی ملی۔ ملتان اس حوالے سے بھی خوش قسمت ہے کہ آج یہاں پہلی بار عالمی اردو کانفرنس منعقد کی جا رہی ہے۔

خواتین و حضرات!

ملتان از منۂ قدیم سے علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے مدینۃ الاولیاء کے ناطے اسے اسلام کی ترویج کے سلسلے میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانی نے یہاں ایک یونیورسٹی قائم کی جو مبلغین کی جماعتیں تیار کرتی تھی۔ امیر خسرو، فخر الدین عراقی اور طالب آملی جیسے دانشور ایک عرصہ تک یہاں مقیم رہے اگرچہ فارسی اس خطے کی سرکاری زبان رہی تاہم مقامی زبانوں کے میل جول سے اردو کی داغ بیل بھی یہیں پڑی۔ اس حوالے سے ممتاز محقق حافظ محمود شیرانی کی کتاب "پنجاب میں اردو" دیکھی جا سکتی

ہے خاص بات یہ ہے کہ اردو کی ابتدائی شکلوں کے جو نمونے اس کتاب میں دیے گئے ہیں ان کا تعلق خطۂ ملتان سے ہے۔ ڈاکٹر مہر عبدالحق کا پی ایچ ڈی کا مقالہ "ملتانی زبان اور اس کا اردو سے تعلق" بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

ملتان کی علمی' ادبی حیثیت کا تذکرہ شیخ محمد اکرام کی آبِ کوثر اور موج کوثر میں بھی موجود ہے اور اس کے تاریخی' دینی و علمی نقوش مولانا نور احمد فریدی کی "تاریخ ملتان" شیخ اکرام الحق کی "ارضِ ملتان" سید اولاد علی گیلانی کے "مرقعِ ملتان" اور منشی عبدالرحمٰن کی "ملتانِ ذیشان" میں دیکھے جا سکتے ہیں اسی طرح ملتان کی ادبی صورتِ حال کا جائزہ ڈاکٹر طاہر تونسوی کی کتاب "ملتان میں اردو شاعری" سے لیا جا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ملتان کی علمی' ادبی' دینی اور تاریخی حیثیت مسلّم ہے اور عہدِ قدیم سے اب تک کسی نہ کسی حوالے سے کام ہوتا رہا ہے۔ ڈاکٹر سہیل احمد خاں نے لکھا ہے:

"شہرِ ملتان نے اپنی آنکھوں سے ہزاروں زمانوں کو بجھتے اور روشن ہوتے دیکھا ہے۔ اس رستے سے تاریخ کے کئی لشکر گرد اڑاتے ہوئے گذرے ہیں آج بھی اس شہر کا آسمان اور اس کی زمین گزری ہوئی صدیوں کے واقعات دہراتے ہیں۔ دھوپ آج بھی یہاں ننگی تلواروں کی طرح چمکتی ہے۔ آندھیاں شہر کی گلیوں سے خاک اڑاتے ہوئے لشکروں کی طرح گذرتی ہیں اور راتوں کو ہواؤں میں گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں آتی ہیں۔ خاک و خون میں لتھڑے ہوئے ان ہی زمانوں میں شاعروں اور صوفیوں کی وہ صدائیں بھی گونجی ہیں جنھوں نے انسانیت کو محبت کا درس دیا ہے۔ محبت کی یہ ہری کونپل ہر زمانے کے خاکستر سے پھوٹتی ہے۔ قدیم ملتان اور صنعتی یلغار کی زد میں آیا ہوا ریستورانوں' دھواں اگلتی چمنیوں' جلتی بجھتی ٹریفک کی بتیوں اور اپنے مکینوں میں اکیلے پن کا خوف پیدا کرنے والا نیا ملتان' یہ ملتان کے شاعر کی معنوی جدلیات ہے۔"

اور اسی ملتان میں ہم نے آج عالمی اردو کانفرنس کی داغ بیل ڈالی ہے۔ اردو جو ہماری قومی زبان ہے اردو جو برِ صغیر پاک و ہند میں اسلامی تشخص کی آئینہ دار ہے۔ اردو جو تحریکِ پاکستان اور قیامِ پاکستان کا بہت بڑا حوالہ ہے اور جس کے لئے حضرت قائداعظمؒ نے ڈھاکہ میں 21 مارچ 1948ء کو عوام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"میں آپ کو صاف طور پر بتا دوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہو گی اور کوئی دوسری زبان نہیں۔ جو کوئی آپ کو غلط راستے پر ڈالے وہ درحقیقت پاکستان کا دشمن ہے ایک سرکاری زبان کے بغیر کوئی قوم نہ تو مضبوط بنیادوں پر متحد و یکجا رہ سکتی ہے اور نہ ہی بحیثیت قوم اپنا کردار ادا کر سکتی ہے۔ دوسرے ملکوں کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے پس جہاں تک سرکاری زبان کا تعلق ہے پاکستان کی زبان اردو ہو گی"۔

گذشتہ پینتالیس برسوں سے اردو ہماری قومی زبان بھی ہے اور سرکاری زبان بھی۔ اردو کے دفتری زبان ہونے کا خواب ابھی تک پوری طرح شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا' اس کی وجوہات کا پس منظر و پیش منظر کیا ہے' اس کے بارے میں دانشور حضرات ہی اظہارِ خیال فرمائیں گے مجھے تو آپ سب کو ایک بار پھر یاد دلانا ہے کہ اردو کے استحکام کے لئے ابھی ہم سب کو مل کر بہت کچھ کرنا ہے۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو ہماری روز مرہ زندگی میں بحیثیت قومی زبان رائج ہے ہم روز مرہ کی گفتگو' نجی کاروبار اور ذاتی مراسلت اسی زبان میں کرتے ہیں۔ ایسے تعلیمی ادارے جہاں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے' وہاں بھی بوقتِ ضرورت اردو استعمال کی جاتی ہے۔ سرکاری دفاتر اور عدالتوں میں اظہارِ مدعا اردو زبان میں ہی کیا جاتا ہے۔ اسی طرح تمام صوبوں میں بسنے والے لوگوں کے درمیان رابطے کی زبان اردو ہی ہے' اس کے باوجود المیہ یہ ہے کہ اردو کو اعلیٰ سطح پر بحیثیت قومی اور سرکاری زبان اختیار نہیں کیا جا رہا۔ اس کے کیا اسباب ہیں اس سلسلے میں مجھے عرض یہ کرنا ہے کہ اعلیٰ سرکاری سطح پر نیم دلانہ رویہ اپنایا جاتا ہے' ملک میں ایک ایسا با اثر طبقہ موجود ہے جو اردو کا نفاذ نہیں چاہتا اور اس ضمن میں بہت سی باتیں کی جاتی ہیں۔ بہت سے بہانے تراشے جاتے ہیں کہ اردو کمتر اور غیر ترقی یافتہ زبان ہے۔ اردو میں دفتری اور سرکاری معاملات کا اظہار آسانی سے ممکن نہیں۔ اردو میں علمی اصطلاحات کا متبادل موجود نہیں' اردو اس جدید ٹیکنالوجی سے محروم ہے جو انگریزی زبان کے پاس ہے۔ اردو میں ٹائپ اور کمپیوٹر کے ماہرین کی کمی ہے۔ ان اعتراضات کے مثبت جوابات کئی بار دیئے جا چکے ہیں مگر صورتِ حال جوں کی توں ہے۔ جہاں تک میرا ذاتی خیال ہے اردو کے نفاذ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہمارا احساسِ کمتری ہے اور سچ تو یہ ہے

کہ یہ ہماری بیوروکریسی ہے جس کی اردو سے واقفیت محدود ہے اور جو اپنے اظہار کی عادت میں تبدیلی پسند نہیں کرتے یا تبدیلی نہیں کرنا چاہتے اور جنہوں نے اپنی اولاد کی تربیت بھی انگریزی نہج پر کی ہے۔ انگلش میڈیم تعلیمی ادارے اور ایسے تعلیمی ادارے جن کا الحاق بیرونی ممالک کے تعلیمی اداروں سے ہے متذکرہ رویے کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔ ملک میں تمام اعلیٰ ملازمتوں کے لئے مقابلے کے امتحانات انگریزی میں ہوتے ہیں۔ اس بات سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ ہمیں انگریزی کی اہمیت سے انکار ہے البتہ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم انگریزی کو اردو کے نفاذ میں رکاوٹ نہ بننے دیں۔ اس سلسلے میں چند تجاویز پیش کرنے کی جسارت کروں گا۔

1- پہلی گذارش تو انتظامیہ سے ہے کہ وہ اردو سے محبت پیدا کریں اور اردو کو ہر سطح پر رائج کرنے کی کوشش کریں ان کی مخلصانہ کوششوں سے یہ مرحلہ آسان ہو جائے گا۔

2- ملک میں دوہرے نظامِ تعلیم کی حوصلہ شکنی ہونی چاہئے ایک ہی ذریعہ تعلیم و تدریس ہونا چاہئے۔

3- اسی طرح اعلیٰ امتحانات اردو ہی میں لئے جائیں۔

4- پاکستان کے آئین میں اردو کے نفاذ کی جو تاریخ مقرر ہے اس میں بار بار تبدیلی نہ کی جائے اور اس بار کی رعایت کو آخری تصور کیا جائے اگر ایسا ہو جائے تو مجھے یقین ہے کہ پاکستان میں اردو یقینی طور پر نافذ ہو جائے گی۔

ہم وزیر اعلیٰ پنجاب جناب غلام حیدر وائیں صاحب کے ممنون ہیں کہ انہوں نے وزارتِ اعلیٰ کا چارج سنبھالتے ہی حکم دیا کہ انہیں تمام تلخیصات اردو زبان میں بھیجی جائیں ان کے اس حکم نامہ سے ایک دفعہ تو سیکریٹریٹ کے دَر و بام لرز اٹھے۔ اس کی غلام گردشوں میں ایک بھونچال سا آ گیا۔ کئی اندیشہ ہائے دُور دراز دامن گیر ہوئے، ہزار وسوسوں نے ذہن کے زندان سے سر باہر نکالا۔ احباب کا تامّل، تردد، تگ و دو کچھ بھی تو وائیں صاحب کے پائے استقامت کو متزلزل نہ کر سکی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ یہ مردِ درویش ٹس سے مَس نہیں ہو رہا تو پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ He Means Business ——— سب نے بے بسی سے کندھے اچکائے۔

اب جبکہ اس سلسلے میں مثبت پیش رفت ہو چکی ہے ہمیں امید ہے وائیں صاحب اپنا جہاد جاری رکھیں گے اور اردو کو قومی زندگی میں اس کا جائز اور اصل مقام دلائیں گے۔

سید شوکت علی شاہ
(کنوینر عالمی اردو کانفرنس)

maablib.org

maablib.org

خطبہ صدارت عالی جناب غلام حیدر وائیں صاحب، وزیر اعلیٰ پنجاب

عالمی اُردو کانفرنس کے منتظم حضرات ۔۔۔۔ پاکستان، بھارت، ایران، چین، برطانیہ، امریکہ اور ناروے سے تشریف لائے ہوئے اردو کے محسنین، خواتین و حضرات!

عالمی اُردو کانفرنس کی اس پُروقار تقریب میں جہاں ملک ملک اور پاکستان بھر سے نامور ادیب، دانشور اور مفکر حضرات تشریف لائے ہوئے ہیں، ان سب کے گراں قدر خیالات کے اظہار کے بعد علمی کم مائیگی کا احساس رکھنے والے مجھ جیسے شخص کو آخری مقرر کے طور پر مائیک کے اس پل صراط پر کھڑا کر دینا میرے ساتھ زیادتی کے مترادف دکھائی دیتا ہے اور اس کی تلافی، اظہارِ خیال کے دوران، شاید مجھ جیسا شخص اس کانفرنس کی عظمتوں کے تناظر میں نہ کر سکے۔ بہرحال آج کی یہ شاندار کانفرنس ہر حوالے سے یادگار ہے کہ اس میں تحقیقی

مقالات کے ذریعہ اردو جیسی عظیم عالمگیر زبان کی تاریخ اس کے حال اور اس کے مستقبل کے بارے میں بہت ہی حوصلہ افزا باتیں کہی گئیں اور نفاذِ اردو کے سلسلے میں پُر اعتماد خیالات کا اظہار کیا گیا۔ میں اس پس منظر و پیش منظر میں اپنی کم علمی کا اعتراف کرتے ہوئے اردو کے محسنوں اور قدر دانوں کی خدمت میں اپنے خلوص بھرے جذبات کے ساتھ یہی عرض کر سکتا ہوں کہ۔

اپنا دل پیش کروں اپنی وفا پیش کروں
کچھ سمجھ میں نہیں آتا تمہیں کیا پیش کروں!

خواتین و حضرات ـــــ اردو عصرِ حاضر کے جملہ تقاضوں کو پورا کرنے والی زبان ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی رابطوں اور ناطوں کو قریب تر لانے والی زبان بھی ہے۔ میری نظر میں جو زبان برِ صغیر سے غلامی کے آثار مٹانے کی جدّوجہد میں سب سے زیادہ مؤثر اور شریک رہی ہے وہ اردو ہی ہے' یہ وہی زبان ہے جو آج بھی شدید تلخیوں کے باوجود بھارت و پاکستان کو ایک دوسرے کے قریب تر لانے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ اور مجھے یہ کہنے دیجئے کہ جب تحریکِ پاکستان اور قیامِ پاکستان کی تمام تر جدّوجہد میں اردو ہمہ وقت شریکِ سفر رہی ہے تو پھر اس سے زیادہ اس زبان کی عظمت کو اور کیا خراجِ تحسین پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کے علاوہ اردو کی عظمتوں کے کئی اور روشن اور ناقابلِ فراموش حوالے بھی موجود ہیں۔ دنیا کی تمام چھوٹی بڑی زبانوں کی خصوصیات یہ ہیں کہ وہ ان زبانوں کے عالموں' مفکّروں' ادیبوں' دانشوروں اور مورّخوں کو تاریخ لکھنے کی استطاعت فراہم کرتی ہیں لیکن میری اور آپ کی اردو زبان کی عظمت یہ ہے کہ برِ صغیر پاک و ہند میں اس نے تاریخ لکھنے کا نہیں بلکہ مسلمانانِ ہند کی تاریخ بنانے میں بھرپور کردار ادا کیا اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے اس لئے بھی کہ اردو نے صرف ہماری تاریخ بنانے ہی کا نہیں بلکہ پاکستان کا جغرافیہ بھی بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جو زبان غالب' ذوق' علامہ اقبالؒ' جوش' فیض' ہری چند اختر' فراق گورکھ پوری اور احمد ندیم قاسمی جیسی نابغہِ روزگار شخصیات کے ذہن و فکر اور رشحاتِ قلم کا ذریعہ بنی۔ جسے اس زبان کے قابلِ فخر اور مایہ ناز سپوتوں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ' پروفیسر جگن ناتھ آزاد' مسز سروجنی نائیڈو اور ڈاکٹر خلیق انجم جیسے روشن دماغوں نے مشکل

ماحول کے باوجود اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا۔ یہ وہ شخصیات ہیں جن پر اردو ہمیشہ ناز کرتی رہے گی میری رائے میں ان کے ہمراہ اور بھی لاتعداد دانشوروں کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ اردو کے ایسے روشن چراغ ہیں' جن کی ضیاء کبھی ماند نہیں پڑے گی۔

خواتین و حضرات ۔۔۔۔ اردو کی اس سے بڑی عظمت اور کیا ہو سکتی ہے کہ آج مدینتہ الاولیاء ملتان میں دیس دیس سے اس کے پرستار جمع ہوئے ہیں اور پاکستان کے کونے کونے سے اردو کے شیدائی تشریف لائے ہوئے ہیں' اور یہاں اس کے مستقبل کی لویں درست کرنے' اس کی روشنی کو تیز تر کرنے اور اس پُروقار اردو عالمی مجلس کو سجانے کا ذریعہ بنے ہیں' میں اردو کے ان محسنوں' شیدائیوں اور پرستاروں کو ان کی اردو کے سلسلے میں ناقابلِ فراموش خدمات پر ہدیۂ سلام پیش کرتا ہوں کہ نفاذِ اردو کے سلسلے میں ان کی یہ قابلِ قدر تحریک جاری و ساری رہے گی' ایسے حالات میں' مَیں بھی اس سفر میں قدم بقدم ان کے ساتھ ہم رکاب ہونے کا عہد کرتا ہوں۔

خواتین و حضرات ۔۔۔۔ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ اردو تاریخ ساز زبان ہے اور عالمی اردو کانفرنس کے ان تاریخی لمحات میں اگر کوئی صنعت کار بیٹھا ہے تو میں اس سے مخاطب ہوں' اگر کوئی زمیندار بھائی بیٹھا ہے تو میں اس کو پکار رہا ہوں' اگر کوئی تاجر ہے تو میں اس سے ہمکلام ہونے کی جسارت کر رہا ہوں' اگر کوئی سیاستدان ہے تو میرا روئے سخن اس سے بھی ہے' اگر انتظامیہ کا بڑے سے بڑا "وہ کچھ" ہے جو آج وہ ہے تو اس سے بھی مخاطب ہوں اور یہ بات بہانگ دہل کہہ رہا ہوں کہ آج ہم جو کچھ بھی ہیں اس میں اردو کی خدمات کا نمایاں حصہ شامل ہے۔ ان خدمات کے اعتراف کا کم سے کم تقاضا یہ ہے کہ زندگی کے کسی بھی لمحے' آزادی کا سانس لیتے ہوئے اسے نہ تو فراموش کیجئے اور نہ ہی اسے نظرانداز کیجئے۔ اشفاق احمد صاحب نے درست فرمایا ہے کہ اردو ہماری قومی تاریخ کا ایک درخشندہ باب ہونے کے باوجود آج اپنے ماحول میں ایک تلخ پہلو بھی رکھتی ہے اور وہ اردو کا نہیں بلکہ اس طبقے کا ہے جو انگریزی کو احساسِ برتری اور اردو کو احساسِ کمتری کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ میرے خیال میں اب اس اندازِ فکر اور سوچ کو بدلنا ہو گا۔ ہمیں آج کے مراعات یافتہ طبقے' جوان نسل' آج کی انتظامیہ' آج کے سیاست دان' صنعت کار' تاجر' کاشتکار کسان اور

نوجوان کو یہ عرض کرتا ہے کہ۔

تو بھی بدل فلک کہ زمانہ بدل گیا

ہمیں اب اپنے اندازِ فکر کو بدلنا ہو گا اور قومی زندگی کی عظمتوں کو اپنے پُراعتماد مستقبل کے لئے اپنی عملی زندگی میں سمونے کے لئے اپنا قبلہ درست کرنے کا عملاً آغاز کرنا ہو گا۔

پاکستان کے سب سے بڑے صوبے کے خادمِ اوّل کے طور پر جب میں نے وزارتِ اعلیٰ کا قلمدان سنبھالا تو انگریزی اور اردو کے درمیان برتری اور کمتری کے ماحول میں 'مَیں بھی چند روز کے لئے ایک عجیب قسم کے احساس میں مبتلا رہا اور اس کشمکش میں 'مَیں نے محسوس کیا جیسے کوئی میرے ضمیر سے ہمکلام ہو کر کہہ رہا ہو کہ۔

ہے شوق ضبطِ شوق میں دن رات کشمکش
دل مجھ کو مَیں ہوں دل کو پشیماں کئے ہوئے

مگر وزارتِ اعلیٰ کا قلمدان سنبھالنے کے بعد مجھے جلد ہی شدت سے یہ احساس ہوا کہ ہمارا انگریزی دان طبقہ جو ہماری انتظامیہ کا بہت محترم حصہ ہے' ان کے ذہن کو انگریزی کے سوا اور کچھ نہیں بھاتا اور جب میں نے ان کی ارسال کردہ سرکاری خط و کتابت کو پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کی تو مجھے ان میں انگریزی کے خوبصورت جملے تو نظر آئے مگر اس میں کوئی نئی سوچ اور کوئی تازہ فکر دکھائی نہ دی' اس صورتِ حال میں 'مَیں نے ان کو صاف الفاظ میں یہ کہنے کی جسارت کی کہ اردو ہماری قومی زبان ہے۔ یہ کمتری کا نہیں بلکہ برتری کا احساس دلاتی ہے اس لئے آئندہ دفتری زبان کے طور پر تمام سیکرٹری حضرات مجھے اپنے اختصاریے اردو میں بھجوانے کا آغاز کریں۔

اور معاً" یہ خیال بھی میرے ذہن میں ابھرا کہ اگر مجھ جیسا انگریزی کے نہ جاننے کا جان بوجھ کر اعتراف کرنے والا اور کم علمی کے احساس کا شکار شخص' جس نے اردو اور غربت کے وقار کو کبھی اپنی زندگی میں رسوا نہیں ہونے دیا' اس کے اعترافِ کم مائیگی کے باوجود اگر قدرت چاہے تو اسے ایسے مقام پر بٹھادے اور سادگی اور کسمپرسی کے ماحول میں بھی وزارتِ اعلیٰ کا اعزاز بخش دے تو پھر آپ ہی بتائیں کہ پھر ہمیں مصنوعی برتری کے انداز اختیار کرنے

کی کیا ضرورت ہے؟

خواتین و حضرات ــــــ میں سمجھتا ہوں کہ اب وقت آگیا ہے کہ ہمیں اپنی روایات کی شمع کو مزید فروزاں کرنے کے لئے عملی اقدامات کرنے ہوں گے اور اردو جو عصرِ حاضر کے تمام تقاضوں کو پورا کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے، کے نفاذ کے سلسلے میں ہمیں قطعی طور پر کسی احساسِ کمتری میں مبتلا ہونے اور رہنے کی قطعاً" کوئی ضرورت نہیں۔

معزز سامعین!

میں جب تک پنجاب میں اس عہدہ پر ہوں میرا یہ مشن، میری یہ کوشش، تمنا اور یہ آرزو رہے گی کہ پاکستان اور خاص طور پر پنجاب میں اردو کو حقیقی معنوں میں سرکاری اور عوامی دونوں سطحوں پر بروئے کار لایا جائے اور اس سلسلے میں مَیں آپ جیسے اہلِ دانش و اہلِ قلم احباب سے رہنمائی حاصل کرنے کی استدعا کرتا ہوں۔

میں اس عالمی اردو کانفرنس کے حوالے سے وطنِ عزیز کے ہر فرد پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں اردو کو پاکستان کی قومی زبان، اردو کو عالمی زبان، اسے رابطوں کی زبان، پیار و محبت کی زبان، قومی یکجہتی کی زبان کے طور پر اختیار کرنے کے لئے آخری حد تک جاؤں گا۔

مجھے امید ہے کہ عالمی اردو کانفرنس کا یہ پُروقار اجتماع ہماری اس قابلِ فخر عالمی زبان کی عظمتوں کو مزید آگے بڑھانے کا ذریعہ بنے گا اور آج کے اس عالمی اجتماع میں دانشوروں نے جو قابلِ قدر مقالات پڑھے ہیں وہ محض کتابوں میں محفوظ نہیں رہیں گے بلکہ عملی طور پر ہماری زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہونے کا سامان بھی فراہم کریں گے۔

آخر میں ــــــ مَیں اس عالمی اردو کانفرنس کے منتظمین کا شکرگزار ہوں جنہوں نے مجھے اس تاریخی اور یادگار کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی اور اپنے خیالات کے اظہار کا موقع فراہم کیا۔ میں اس مجلس کو سجانے والے روشن چراغوں، اردو کے محسن بھائیوں اور بہنوں کے علاوہ باہر کی دنیا اور ملک بھر سے آئے ہوئے دانشوروں، شاعروں، ادیبوں اور شہریوں کا بھی شکرگزار ہوں کہ انہوں نے اردو کے لئے اپنے دل میں درد محسوس کیا اور یہاں تشریف لائے۔

میں اردو کی بھرپور کامیابی کے لئے دعاگو ہوں اور اردو کے حوالے سے اس پُریقین شعر

پر اپنے جذبات اور خیالات ختم کرتا ہوں کہ ۔

جو ابر یہاں سے اٹھے گا وہ سارے جہاں پر برسے گا
ہر جوئے رواں پر برسے گا ہر کوہ گراں پر برسے گا

پاکستان پائندہ باد

ملک سلیم اقبال

خطبۂ صدارت (نشست دوم)

محترم مندوبین عالمی اردو کانفرنس

معزز خواتین و حضرات!

ملتان کو آج یہ شرف حاصل ہو رہا ہے کہ یہاں پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار قومی زبان اردو کی ترقی و فروغ کی خاطر عالمی اردو کانفرنس اور عالمی مشاعرہ جیسی شاندار اور تاریخی تقریبات منعقد ہو رہی ہیں جن میں نہ صرف ملک بھر کے دانشور، اہلِ قلم، ادیب، شاعر، صحافی اور نقاد حصہ لے رہے ہیں بلکہ اردو زبان سے متعلق موضوعات پر اردو کانفرنس کے دونوں اجلاسوں میں جو قیمتی، پُر مغز اور فکر انگیز مقالات و مضامین پیش کئے گئے ہیں وہ یقیناً" منزلِ مراد تک پہنچنے میں مشعلِ راہ ثابت ہونگے۔

میں عالمی اردو کانفرنس اور عالمی مشاعرے میں پاکستان بھر سے آئے ہوئے محترم دانشور حضرات اور خصوصاً" ان مہمان دانشوروں، اہلِ قلم، ادیبوں اور شاعروں کو خوش آمدید کہتا ہوں جو بیرونِ پاکستان سے یہاں تشریف لائے اور اس کانفرنس کو با معنی و با مقصد بنانے میں اپنے گراں قدر افکار و خیالات سے نوازا۔ میں ان دونوں عالمی تقریبات کا

کامیاب اور شاندار اہتمام کرنے پر مجلس تقریباتِ ملّی اور مجلسِ زبانِ دفتری کے تمام اراکین اور خصوصاً ان تقریبات کے اصلی روحِ رواں اور ناظمِ اعلیٰ سید شوکت علی شاہ جو نہ صرف ڈپٹی کمشنر ہیں بلکہ صاحبِ تصنیف، صاحبِ طرز ادیب اور دانشور بھی ہیں کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ میں منتظمینِ تقریبات کا ممنون بھی ہوں کہ انہوں نے مجھے اس پُروقار عالمی اردو کانفرنس کے دوسرے سیشن میں بحیثیت صدرِ مجلس مدعو کیا اور اس طرح اہلِ علم و دانش کے خیالات و افکار سننے کا ایک خوشگوار موقع فراہم کیا۔

ملتان میں عالمی اردو کانفرنس جس ملّی جذبے اور قومی لگن سے منعقد کی گئی ہے وہ قابلِ ستائش بھی ہے اور قابلِ تقلید بھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اردو نہ صرف ہماری قومی زبان ہے بلکہ ہمارا قومی تشخص، ملّی یگانگت اور اتحاد و یکجہتی کا بھی بہت اہم ذریعہ ہے۔

معزز حضرات! اردو کا دامن وسیع اور کشادہ ہے نیز اس میں وہ تمام تر صلاحیتیں موجود ہیں جو ہمیں علم و ہنر اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے ہر شعبے اور میدان میں پوری طرح مدد دے سکتی ہیں۔ اردو ہماری تہذیب و ثقافت کی آئینہ دار بھی ہے اور ہماری سرکاری دفتری زبان بننے کی بھی ہر اعتبار سے اہل اور مستحق ہے۔ حکومت کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے میں فخریہ طور پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ اسلامی جمہوری اتحاد اور پاکستان مسلم لیگ کے منشور میں اردو کو ملک بھر میں اس کا جائز مقام دینے کا پُرخلوص عزم اور ارادہ شامل ہے اور اس سلسلہ میں تمام تر عملی اقدامات کئے جا رہے ہیں۔

پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ جناب غلام حیدر وائیں خاص طور پر اس سلسلے میں گہری دلچسپی لے رہے ہیں۔ وہ پاکستان مسلم لیگ کے انتہائی سرگرم کارکن اور پنجاب مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری بھی ہیں۔ ان کی فعّال قیادت و رہنمائی میں پاکستان مسلم لیگ، جس طرح پوری سرگرمی سے فلاحی اور معاشرتی بہبود کے کاموں میں مصروف ہے۔ وہاں ان کا زبانِ اردو کا پرستار ہونا بھی ان کے عمل و کردار سے آشکارا ہے۔ انہوں نے دفتری امور، سرکاری خط و کتابت اور حکومت کے انتظامی معاملات میں تمام تر مراسلت قومی زبان اردو میں کرنے کی خصوصی ہدایات جاری کی ہوئی ہیں۔ ان کی ہدایات کے تحت صوبہ بھر میں

ڈپٹی کمشنر صاحبان کی سرکردگی میں ضلعی مجالس زبانِ دفتری قائم ہیں جو اپنے اجلاسوں میں اردو کو دفتری زبان کے طور پر اپنانے کے سلسلہ میں جناب غلام حیدر وائیں کی ہدایات کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر مفید تجاویز اور سفارشات صوبائی مجلس زبانِ دفتری کو ارسال کرتی رہتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ملتان میں عالمی اردو کانفرنس کا انعقاد اس سمت میں ایک بہت بڑا قدم ثابت ہوگا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ حکومت اس کانفرنس میں پیش کی جانے والی تجاویز و سفارشات پر عمل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گی اور اس سے بابائے قوم حضرت قائد اعظم رحمتہ اللہ علیہ کا وہ خواب بھی شرمندۂ تعبیر ہو جائے گا جس کا اظہار انہوں نے ڈھاکہ کے ایک جلسۂ عام میں برملا کیا تھا کہ پاکستان کی قومی زبان اردو اور صرف اردو ہوگی۔ مجھے یہ جان کر بھی خوشی ہوئی ہے کہ عالمی اردو کانفرنس کے منتظمین نے اس موقع پر پڑھے جانے والے قیمتی مضامین و مقالات کو کتابی شکل میں شائع کرنے کا عزم کیا ہوا ہے۔ میں بحیثیت وزیر اطلاعات و ثقافت پنجاب منتظمین عالمی اردو کانفرنس کو اس سلسلہ میں اپنی وزارت کی طرف سے بھرپور تعاون کا یقین دلاتا ہوں اور اپنی پُرخلوص دعاؤں اور تمناؤں کا تحفہ ان کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

میں آخر میں ایک بار پھر جناب سید شوکت علی شاہ اور عالمی اردو کانفرنس کے جملہ منتظمین کا تہہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھے آج کی اس پُروقار محفل میں دعوتِ شرکت سے نوازا۔

پاکستان زندہ باد

قومی زبان اردو۔ پائندہ باد

maablib.org

احمد ندیم قاسمی

پاکستان میں نفاذِ اردو کا مسئلہ

اردو ہماری قومی شناخت ہے مگر اپنی اس قومی شناخت کے ساتھ ہمارے حکمرانوں نے افسوسناک بدسلوکی کی ہے۔ ویسے تو انگریز اور دوسری یورپی اقوام ایشیا اور افریقہ کے قریب قریب ہر ملک پر سالہا سال تک مسلط رہیں۔ مگر احساسِ کمتری کا جو ٹیکہ انگریز نے ہماری ہیئت اجتماعیہ کے رگ و پے میں دوڑایا اس کی کوئی اور مثال شاید ہی مل سکے۔ ایشیا اور افریقہ کے یہ ممالک یا تو ہمارے ساتھ آزاد ہوئے یا کچھ عرصہ پہلے یا بعد میں انہوں نے غیر ملکی استبداد کا جوآ اپنی گردنوں سے اتار پھینکا مگر آزاد ہونے کے بعد وہ قومی زبان کے سلسلے میں ہماری طرح کسی مخمصے میں مبتلا نہیں ہوئے بلکہ فوراً یا پھر چند برس بعد انہوں نے دفاتر اور مدارس میں اپنی قومی زبان رائج کر دی ہم احساسِ کمتری کے کچھ زیادہ ہی شدید مریض تھے' اس لئے ہم آج آزادی کے پینتالیس سال بعد بھی اپنی قومی شناخت کو پس پشت ڈالے ہوئے ہیں بلکہ اسے چھپاتے پھرتے ہیں کہ کوئی دیکھ نہ لے اور یہ نہ کہے کہ یہ کیسے قدامت پسند لوگ ہیں جو ابھی تک ایک ایسی زبان بولتے اور لکھتے ہیں جو دائیں سے بائیں لکھی جاتی ہے۔ اس دردناک احساسِ کمتری کی بے شمار مثالیں ہیں مگر سب سے بلیغ مثال یہ ہے کہ آج ہمارے سکولوں' کالجوں اور دانش گاہوں میں ان طلباء کا

مذاق اڑایا جاتا ہے جو "بے چارے اردو میڈیم کے تعلیم یافتہ ہیں اور جو اردو یا دوسری پاکستانی زبانیں بولتے ہیں اور انگریزی نہیں بول سکتے حالانکہ جو انگریزی نہیں بولتا' اسے اس صدی میں سانس لینے تک کا حق حاصل نہیں ہونا چاہئے"۔

اگر ہماری بیوروکریسی اردو کے نفاذ کی راہ میں حائل ہے تو اس کا سبب بھی یہی ہے کہ یہ لوگ نہ صرف انگریز استعمار کے تربیت یافتگان ہیں بلکہ قیامِ پاکستان کے بعد بھی اُن کو اِس نوع کی تربیت دی گئی ہے کہ وہ اردو کو بیروں اور چوکیداروں کی زبان قرار دیتے ہیں اور جب بھی اردو کو بحیثیت قومی و سرکاری و تعلیمی زبان رائج کرنے کی تحریک اٹھتی ہے تو ہمارے یہ بیوروکریٹ اپنے برطانوی طرزِ عمل سے ایسی تحریک کی کمر توڑ دیتے ہیں بصورتِ دیگر آخر کیا وجہ ہے کہ قومی پارلیمنٹ میں اردو کے نفاذ کی جو حد مقرر کی جاتی ہے' اسے بھی دَرخورِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا اور اردو کے نفاذ کے حتمی اعلان کو بھی کئی سال گزر جاتے ہیں مگر کسی کے ضمیر میں کھٹک نہیں ہوتی اور کسی جبیں پر بَل نہیں پڑتا۔

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہم نفسیاتی لحاظ سے مریض لوگ ہیں اور بظاہر آزاد کہلانے کے باوجود ذہنی طور پر غلام ہیں اور اس غلامی پر رضامند ہیں۔ میں نے ایک بار یہ شعر کہا تھا۔

بے وقار آزادی ' ہم غریب ملکوں کی
تاج سر پہ رکھا ہے ' بیڑیاں ہیں پاؤں میں

مگر یہ بیڑیاں صرف پاؤں میں نہیں ہیں' ہمارے ذہنوں اور ضمیروں کو بھی انہی بیڑیوں نے جکڑ رکھا ہے اور ہم آگے نہیں بڑھ رہے بلکہ واپس جا رہے ہیں

اردو کے نفاذ کی راہ میں ایک اور بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ ہم پاکستان کی دوسری زبانوں کا احترام کرنا نہیں جانتے۔ ہمارے کروڑوں عوام پنجابی' سندھی' پشتو' بلوچی' سرائیکی' بروھی' کشمیری اور متعدد دوسری زبانیں بولتے ہیں ان کی ماؤں نے انہی زبانوں میں انہیں لوریاں دی ہیں۔ وہ انہی زبانوں کے ثقافتی ماحول میں پلے بڑھے ہیں۔ اس لئے ان زبانوں کے بھی ہم پر بے حد و حساب حقوق ہیں۔ ہم ان کی حق تلفی کر کے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکیں گے۔ اگر ان زبانوں کو اردو کی قربان گاہ کی بھینٹ چڑھانا ہے تو پھر یاد

رکھیے کہ پاکستان میں اردو کبھی نافذ نہیں ہو سکے گی۔ اردو کا تو مزاج ہی ایسا ہے کہ وہ گرد و پیش بولی جانے والی زبانوں سے بڑی فراخ دلی کے ساتھ استفادہ کرتی آئی ہے۔ آج بھی اس میں پاکستان کی دیگر زبانوں کے الفاظ نہ صرف شامل ہو رہے ہیں بلکہ اردو میں نفوذ کرتے جا رہے ہیں۔ چنانچہ ہمیں ان تمام پاکستانی زبانوں کو ان کا حق دینا ہوگا۔ ابتدائی تعلیم میں ان زبانوں کی افادیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ پھر جب بچوں کے شعور کی آنکھیں کھلیں گی تو وہ اردو اور انگریزی بھی سیکھنے اور پڑھنے لگیں گے' مگر ان کی مادری زبانوں سے کترا کر نکل جانے کی حکمت عملی ہمیں ایک دائرے میں گھمانے کے سوا کچھ بھی نہیں کرپائے گی۔

انگریزی عالمی زبان ہے۔ کرۂ ارض آہستہ آہستہ سکڑ اور سمٹ رہا ہے اور ہمیں یہ عالمی زبان ضرور سیکھنی چاہئے مگر کرۂ ارض پر ایک نظر ڈالنے ہی سے آپ کو معلوم ہوجائے گا کہ انگریزی کی عالم گیری تسلیم کرنے کے باوجود جرمنوں' فرانسیسیوں' اطالویوں' مصریوں' عراقیوں' شامیوں' روسیوں' چینیوں' جاپانیوں' ملائشیوں' انڈونیشیوں ------ غرض سب کی اپنی اپنی قومی زبانیں ہیں۔ وہ یہی زبان بولتے اور انہی زبانوں میں لکھتے ہیں اور انہی میں اپنے بچوں کو تعلیم دیتے ہیں اور ترقی یافتگی کے معاملے میں تقریباً" یہ سب ہم سے آگے ہیں' مگر ہم ہیں کہ اپنی قومی زبان کو رابطے کی زبان بھی تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ کسی آزاد قوم کے لئے یہ کتنا بڑا سانحہ اور کتنا عظیم المیہ ہے۔ خدا ہمارے حکمرانوں اور حاکموں اور دانشوروں اور ماہرینِ تعلیم کو عقل دے۔

maablib.org

maablib.org

پروفیسر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

اردو زبان بھارت کے تناظر میں

اپنی زبان کس کو پیاری نہیں لگتی۔ اس بارے میں طرف داری برحق، لیکن "سخن فہمی" بھی ضروری ہے اردو کی زلفِ گرہ گیر کے ہم سب اسیر ہیں۔ اردو کے حسن و خوبی کا تذکرہ کون نہیں کرتا۔ اس کے لطف و اثر اور شیرینی اور دل نشینی کی کشش کون محسوس نہیں کرتا۔ کون نہیں جانتا کہ اردو ہندستان کی، بلکہ اس برِّصغیر کی یا جنوبی ایشیا کی ایسی زبان ہے جس میں اخذ و قبول کا حیرت انگیز ملکہ ہے اور جس کا دامن طرح طرح کے پھولوں سے بھرا ہے، اور جس کی جادو اثری میں "شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی" تینوں کا ہاتھ ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اردو نے ہند آریائی کا دودھ پیا ہے اور اسی دھرتی پر پلی بڑھی ہے۔ کون نہیں جانتا جب نئی تاریخی حقیقتیں ابھرتی ہیں تو نئے سماجی تقاضے پیدا ہوتے ہیں، اور نئی سچائیاں وجود میں آتی ہیں۔ اردو ایسی ہی ایک سچائی ہے، لسانی، سماجی اور تہذیبی سچائی جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے صدیوں کے سابقے اور اختلاط و ارتباط سے وجود میں آئی۔ اس وقت اس کا کوئی نام نہیں تھا۔ کوئی بھی سچائی جب جنم لیتی ہے، اس کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ سچائیوں کو نام تو اس وقت ملتا ہے جب وہ خانہ زاد ہو جاتی ہیں۔ پراکرتوں کی دھرتی سے جب نیا اکھوا پھوٹا اور اس میں عربی، فارسی، ترکی اثرات کا پیوند لگا

تو اس کا کوئی بھی نام نہیں تھا۔ ہند یعنی ہندوستان کی ہر چیز ہندی تھی' فارسی یائے نسبتی کے ساتھ' اس طرح ہر زبان ہندی تھی۔ امیر خسرو نے اسے ہندوی بھی کہا اور دہلوی بھی۔ اسی زمانے میں جب راگ رنگ کی محفلوں میں اس کے نغمے سماں باندھنے لگے' تو اسے ریختہ بھی کہا گیا۔ دکن اور گجرات پہنچی تو دکنی اور گجری کہلائی' پھر کسی نے اردو کہا' کسی نے ہندی' کسی نے کھڑی' بنیاد وہی ایک' راہیں الگ الگ ہو گئیں۔ نام سے کیا ہوتا ہے' لیکن یہاں نام ہی سے فاصلے بڑھے اور دوریاں ہوتی گئیں' اس امر کے تسلیم کرنے میں شاید ہی کسی کو تامل ہو کہ اردو زبان ہماری پچھلی کئی صدیوں کی تہذیبی کمائی ہے۔ ایسی کمائی جس سے کوئی انصاف پسند نظریں نہیں چرا سکتا۔ تاریخ کے سیل میں جب تہذیبیں بہہ جاتی ہیں' اور نسلیں پگھل جاتی ہیں' جب چہرے کے نقوش' لباس' پہناوا' رہن سہن' طور طریقے نئی شادابیوں سے ہم کنار ہوتے ہیں' جب گل و بلبل کا رشتہ نئی رنگینیوں کی خبر دیتا ہے' جب کوئل کوکتی اور آم کے پیڑوں پر بور آتا ہے' جب دلوں کے دروازے وا ہوتے ہیں' فصل کے فاصلے دھل جاتے ہیں' اور وصل کے در کھلتے ہیں' ایسے میں زبان قوموں اور نسلوں کے دلوں کو جوڑنے کا کام کرتی ہے' اور محبت و یگانگت کے رشتے استوار ہوتے ہیں' تاریخ کے ایسے لمحوں میں جب تہذیب کی ہوا میں شراب کی تاثیر اور لطافت اور رس پیدا ہو جاتا ہے' تو محبت کے دو بول سنانے اور قلب و روح کو سرشار کرنے کے لئے کوئی اردو زبان پیدا ہوتی ہے۔ اردو کو محض اردو کہنا' اسے محض ایک زبان کہنا' اسے آٹھویں شیڈول کی درجہ بندی تک محدود رکھنا' اردو کے ساتھ بے انصافی ہی نہیں' پوری ہندوستانی تہذیب' ایک ہزار برسوں کی تاریخ' باہمی میل ملاپ' اور نئے ہندوستان اور اس کی تعمیر کے خوابوں اور امنگوں اور امیدوں اور ولولوں کی توہین بھی ہے۔ اہل نظر جانتے ہیں کہ اردو جینے کا ایک سلیقہ' سوچنے کا ایک طریقہ بھی ہے۔ اردو محض زبان نہیں' ایک طرز زندگی' ایک اسلوب زیست بھی ہے' اور مشترکہ تہذیب کا وہ ہاتھ بھی جس نے ہمیں گھڑا' بنایا' اور سنوارا ہے' اور وہ شکل وہی ہے جسے ہم آج اپنی پہچان کی ایک منزل سمجھتے ہیں۔ درباروں سے اردو کا رشتہ بڑا معنی خیز ہے۔ اردو نے درباروں سے نہیں' بلکہ خود درباروں نے اردو سے رشتہ پیدا کیا اردو اصلاً" بازاروں' گلیوں' کوچوں'

میلوں ٹھیلوں' جوگیوں' سنتوں' فقیروں' اور صوفیوں کی زبان ہے۔ ان ہی فقیروں' سنتوں اور صوفیوں نے اسے قریہ قریہ' اور شہر شہر پھیلایا' اور سورج کی کرنوں کی طرح یہ جہاں جہاں پہنچی' آنکھوں میں بستی اور دلوں کو شاداب کرتی گئی۔ اس کی پشت پر ہمیشہ انسان دوستی' وسیع النظری اور محبت و یگانگت کا وہ تصور رہا جس سے قومیں عروج پاتی ہیں اور تاریخ میں ان کے کارناموں کے نقش جگمگاتے رہتے ہیں۔ یہی وہ زبان ہے' جس کی ملتی جلتی شکلوں میں بھگتوں' سنتوں اور صوفیوں نے توحید کے ترانے گائے۔ خواجہ معین الدین اجمیری چشتی ہوں یا حضرت بابا فرید الدین گنج شکر' حضرت نظام الدین اولیاء ہوں یا خواجہ بندہ نواز گیسو دراز' رامانند ہوں یا تکارام' کبیر ہوں یا نانک' سینکڑوں صوفیوں' سنتوں اور اولیا اللہ نے اس زبان کے سر پر شفقت اور دعاؤں کا ہاتھ رکھا' اور مذہبوں کی ظاہرداری سے ہٹ کر باطنیت کے جوہر کو دیکھا' اور روحانیت اور سچی انسانیت کے پیغام سے لاکھوں کروڑوں انسانوں کے دلوں کو آباد کیا۔ حضرت نظام الدین اولیاء سے منسوب وہ روایت کس نے نہیں سنی کہ ایک دن جمنا کے کنارے وہ چھت پر موجود تھے' نیچے کچھ ہندو اپنے طریقے سے پوجا پاٹھ کر رہے تھے۔ معاً" یہ مصرع زبان سے نکلا:

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے

انسانیت اور رواداری کا یہ وہ درس ہے جس سے اردو کا میخانہ ہمیشہ آباد رہا ہے۔ صدیوں کے اس تاریخی عمل میں جب کوئی محمد قلی قطب شاہ کہتا ہے:-

میں نہ جانوں کعبہ و بت خانہ وے خانہ کوں   دیکھیا ہوں ہر کہاں دستا ہے تجھ مکھ کا صفا

یا جب کوئی میر کہتا ہے:

دیر و حرم کو دیکھا اللہ رے فضولی   یہ کیا ضرور تھا جب دل سا مکاں بنایا

گوش کو ہوش کے ٹک کھول کے سن شور جہاں   سب کی آواز کے پردے میں سخن ساز ہے ایک

تو محسوس ہوتا ہے کہ کوئی عظیم بالشان سچائی گنبد افلاک کا سینہ چیرتی ہوئی ابھر رہی ہے۔ اردو کے ایوان شعر میں اس حقیقت کی گونج بار بار سنائی دیتی ہے:

وہی یک ریسماں ہے جس کو ہم تم تار کہتے ہیں   کہیں تسبیح کا رشتہ کہیں زنار کہتے ہیں

------(ٹیک چند بہار)

دیر و مسجد پہ نہیں موقوف کچھ اے غافلو

یار کو سجدہ سے مطلب ہے کہیں سجدہ کیا ------(مادھو رام جوہر)

دل بہ دل آئینہ ہے دیر و حرم   حق جو پوچھو ایک در ہے دو طرف

------(دیا شنکر نسیم)

اپنا تو سر جھکے ہے دونوں طرف کہ اس کی

تصویر بت کدے میں اور ہے حرم میں خاکہ ------(پیارے لال آشوب)

یا جس زبان میں غالب جیسے عظیم المرتبت شاعر کو اپنا مسلک یوں بیان کرنا پڑا:

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم

ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

اس کی انسان دوستی کے پیچھے صدیوں کا جو فشار ہے، اسے آسانی سے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان کے ملے جلے سماج کی شیرازہ بندی میں جس زبان کی یہ عظیم الشان روایت رہی ہو، جس نے انسان دوستی محبت اور یگانگت کے رشتوں کو اس طور پر مضبوط کیا ہو، اسے کسی ایک مذہب یا فرقہ سے وابستہ کرنا، اس پر بدیسی ہونے کا الزام لگانا، یا غیر سمجھنا کہاں کا انصاف ہے۔ یہ بچی جمہوریت کے بھی خلاف ہے اور بچی ہندوستانیت کے بھی۔

برصغیر کی زبانوں میں اردو ہندی سے سب سے

زیادہ قریب ہے اور ہندی اور اردو میں اٹوٹ رشتہ ہے

اس بات کو بھی اچھی طرح خاطر نشان کرنے کی ضرورت ہے کہ برصغیر کی تمام زبانوں میں اردو زبان ہندی سے سب سے زیادہ قریب ہے اور ان دونوں میں اٹوٹ رشتہ ہے۔ اسے صدیوں کے سامراج کی سازش کہیے یا حالات کی ستم ظریفی، یا برصغیر کی سیاست کہ وہ دو زبانیں جن میں سگی بہنوں کا رشتہ ہے ان ہی دونوں میں افتراق اور عدم

اعتماد کی فضا پیدا کر دی گئی۔ ایک عام اندازے کے مطابق اردو کے ستر فیصدی الفاظ پراکرتوں کے ذریعے سے آئے ہیں یعنی ہندی ہیں جتنا اشتراک اردو اور ہندی کی لفظیات Lexicon صرفیات Morphology اور نحویات Syntax میں پایا جاتا ہے، شاید ہی دنیا کی کسی دو زبانوں میں پایا جاتا ہو۔ اردو کی تقریباً چالیس آوازوں میں صرف چھ ایسی ہیں جو فارسی و عربی سے لی گئی ہیں باقی سب کی سب ہندی اور اردو میں مشترک ہیں خاص طور سے ہکار Aspirated آوازیں، بھ بھ، تھ دھ، چھ جھ، کھ گھ اپنے سادہ روپ کے ساتھ پورے سٹ کی حیثیت سے ہندی اور اردو میں موجود ہیں۔ اسی طرح معکوسی RETROFLEX آوازیں یعنی ٹ، ڈ، ڑ اور ان کے ہکار روپ ٹھ، ڈھ، ڑھ بھی ہندی اور اردو میں مشترک ہیں۔ یہ چودہ آوازیں اردو کا رشتہ پراکرتوں سے جوڑتی ہیں اور نہ عربی میں ہیں نہ فارسی میں۔ گویا گنتی کی چند آوازوں کو چھوڑ کر اردو اور ہندی کے مصمتوں کا ڈھانچہ تقریباً ایک جیسا ہے۔ مصوتوں Vowels میں تو اشتراک اس سے بھی زیادہ ہے یعنی صوتی ہم آہنگی سو فیصدی ہے۔ تفصیل کی گنجائش نہیں مختصر یہ کہ جو دس بنیادی مصوتے اردو کے ہیں وہی ہندی کے ہیں، اور ان میں ذرہ برابر فرق نہیں۔

صرف و نحو کا یہ عالم ہے کہ کوئی جملہ بولیے ہندی میں یا اردو میں، لفظوں کا فرق ہو سکتا ہے لیکن جملے میں لفظوں کی ترتیب بالکل ایک جیسی ہے۔ تذکیر و تانیث یا روز مرے یا محاورے کا فرق کہیں کہیں جھلک دکھاتا ہے لیکن اتنا فرق تو اردو کے مختلف روپوں میں بھی مل جاتا ہے۔ جملے میں فعل کی بڑی اہمیت ہے۔ اردو فعل کا ہمارا سارا سرمایہ ہندی سے جڑا ہوا ہے، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، لینا دینا، آنا جانا، رہنا سہنا، سونا جاگنا، سینکڑوں ہزاروں فعل جیسے ہندی میں ہیں، ویسے ہی اردو میں ہیں، اردو نے بہت سے فعل عربی و فارسی سے لئے اور انھیں بھی ہندی وضع پر ڈھال لیا۔ مثلاً فرمانا، آزمانا، خریدنا، شرمانا، گزرنا، نرمانا، گرمانا، لرزنا، خرچنا، رنگنا، نوازنا، بخشنا، یہ سب ہندی میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔

محاوروں کا معاملہ بھی اتنا ہی دلچسپ ہے۔ ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ صرف آنکھ ناک، کان، منہ یا ہاتھ سے بننے والے محاوروں ہی کو دیکھ لیجئے۔ آنکھ سے بننے والے محاوروں اور ترکیبوں میں سے چند یہ ہیں:-

آنکھ آنا، آنکھ اٹھانا، آنکھ لڑنا، آنکھ بدلنا، آنکھ بنوانا، آنکھ پتھرانا، آنکھ پھڑکنا، آنکھ پھوٹنا، آنکھ پھوڑنا، آنکھ پھیرنا، آنکھ جھکنا، آنکھ چرانا، آنکھ ہلنا، آنکھ لجانا، آنکھ لگنا، آنکھ مارنا، آنکھ ملانا، آنکھ نکالنا، آنکھیں بچھانا، آنکھیں بھر آنا، آنکھیں ٹھنڈی ہونا، آنکھیں روشن ہونا، آنکھیں موند لینا، آنکھوں میں دھول ڈالنا، آنکھوں میں رات کا کاٹنا، آنکھوں میں سمانا، آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا، آنکھوں میں پھرنا، آنکھوں میں چبھنا، آنکھوں میں چڑھنا، آنکھوں سے لگا لینا، آنکھوں کا پانی ڈھلنا، آنکھوں کے آگے اندھیرا آنا، آنکھوں پر قدم لینا، آنکھوں میں لہو اترنا، آنکھوں سے اوجھل ہونا، آنکھوں سے گر جانا، آنکھیں نیلی پیلی کرنا، آنکھیں کھل جانا، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا، آنکھیں چار ہونا، آنکھیں دکھانا، آنکھیں مٹکانا، آنکھوں پر بٹھانا، آنکھوں پر ٹھیکری رکھ لینا، آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنا، آنکھ اونچی نہ ہونا، آنکھ بند کر کے کچھ دینا، آنکھ بھر کر نہ دیکھنا، آنکھ پر پردہ پڑنا، آنکھ ٹھنڈی کرنا، آنکھ سے آنکھ ملانا، آنکھ سے لہو ٹپکنا، آنکھ کا پانی ڈھلنا، آنکھ کا کاجل چرانا، آنکھ کی پتلی کا پھرنا، آنکھ میلی نہ کرنا، آنکھ نہ جمنا، آنکھ نیچی کرنا، آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل، آنکھ کا اندھا گانٹھ کا پورا، آنکھ مچولی، آنکھوں آنکھوں میں، آنکھوں کے اندھے نام نین سکھ، آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں، آنکھوں کے ناخن تو لو۔ یہ صرف ایک جھلک ہے مکمل فہرست اس سے کئی گنا بڑی ہو گی۔ اس طرح کے محاورے، کہاوتیں اور ترکیبیں ہندی اور اردو دونوں کا مشترک سرمایہ ہیں۔

اردو نے فارسی، عربی الفاظ کو ہندی لفظوں کے ساتھ ملا کر سیکڑوں نئے مرکب بنائے۔ اب یہ ہندی اردو دونوں زبانوں میں یکساں رائج ہیں۔ کون ہے جو ڈاک خانہ، عجائب گھر، چٹھی رساں گلاب جامن، جگت استاد، شرمیلا، رنگیلا، سبزی منڈی، گھڑ سوار، دل لگی، گھر داماد، گھڑی ساز، تھانیدار یا لنگوٹیا یار کا استعمال نہیں کرتا۔ یا بے گھر، بے سمجھ، بے کل، بے بس، بے چین بے ڈول، سدا بہار، دیوانہ پن، چوہے دان، کٹور دان، یا سنگھار دان سے واقف نہیں۔ یا کون ہے جس نے "امام باڑے" نہیں دیکھے یا "نوچندی" کے میلے کا ذکر نہیں سنا، یا دل لگی باز، اکڑ باز، دھوکہ باز، بٹیباز، پتنگ باز، چوسر بازی، اور پھکڑ بازی سے واقف نہیں۔ ہندوستانی سماج سے بھڑک دار کپڑے، مل دار دوپٹے، بجلی

دار پلنگ پوش اور توڑے دار یا ٹوپی دار بندوقیں ابھی غائب نہیں ہوئیں' فارسی' عربی اور ہندی کے یہ ملے جلے لفظ' یا گنگا جمنی لفظ کتنی بڑی تعداد میں ہیں' اور اردو اور ہندی دونوں میں آج بھی کثرت سے استعمال ہوتے ہیں۔ دھاری دار' جالیدار اور پھول دار چادریں آج بھی بچھائی جاتی ہیں' اور چوڑی دار پاجامے آج بھی پہنے جاتے ہیں۔ موتی مسجد اور موتی محل آج بھی موجود ہیں۔ اور عید ملاپ تو ہونا ہی چاہئے۔ اگر اردو اور ہندی کی کوئی بنیادی لفظیات Basic Lexicon تیار کی جائے' تو وہ بڑی حد تک ایک ہو گی۔

کہاوتوں اور تلمیحوں میں دونوں زبانوں کا اشتراک اور زیادہ کھل کر سامنے آتا ہے' اگرچہ اردو میں اسلامی روایات کا گہرا اثر ہے' اور ہندی میں مقامی روایات کا' لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ ہندی اور اردو میں سیکڑوں کہاوتیں ایک ہی طرح کی استعمال ہوتی ہے۔ مثلاً مفت کی شراب قاضی کو بھی حلال' لہو لگا کر شہیدوں میں شامل ہونا' گھر کی مرغی دال برابر' ملا کی دوڑ مسجد تک' دو ملاؤں میں مرغی حرام' یہ منہ اور مسور کی دال' منہ میں رام رام بغل میں چھری' آنکھوں کے اندھے نام نین سکھ' چور کی داڑھی میں تنکا' میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی' نو سو چوہے کھا کر بلی حج کو چلی' یہ ان سیکڑوں ہزاروں میں سے چند ہیں جو اردو اور ہندی کے مشترک سرمائے کا کثرت سے استعمال ہونے والا حصہ ہیں۔ یہ اگر سچ ہے تو پھر اردو اور ہندی کی خلیج کیسی اور اردو کی حق تلفی کیوں؟

اردو نے عربی فارسی عناصر کی تہنید کی ہے اور
انھیں ہندوستانی مزاج کی خراد پر اتارا ہے

اس غلط فہمی کو اب دور ہونا چاہئے کہ اردو' عربی فارسی کا ظل ثانی ہے یا اس کی اپنی کوئی آزادانہ حیثیت نہیں۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ اردو ہند آریائی زبان ہے۔ اور ہندی سے اس کا اٹوٹ رشتہ ہے۔ یہ اگر صحیح ہے تو اردو کسی بھی دوسری زبان کا نقش ثانی کیسے ہو سکتی ہے اردو لفظیات کا بہ مشکل ایک تہائی حصہ فارسی' عربی' ترکی سے مستعار ہے لیکن ان لفظوں کو بھی اردو نے کس طرح اپنی خراد پر اتارا' اور کس طرح انھیں اپنایا' اس کی تفصیل کی گنجائش نہیں لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ تہنید اور

تارید کا یہ عمل صرف آوازوں کے ساتھ ہی نہیں ہوا ہے' لفظوں اور ترکیبوں کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ طوالت کے خوف سے صرف ایک مثال دی جائے گی' اردو میں ذ' ز' ض' ظ' چار الگ الگ حرف ہیں لیکن آواز ایک رہ گئی ہے۔ عربی میں ان چار حروف کی چار مختلف آوازیں ہیں۔ اردو میں یہ سب آوازیں ایک ہو گئیں۔ ایسا کئی دوسرے حروف کے ساتھ بھی ہوا ہے جن کی نوعیت یکسر بدل گئی ہے۔ یہ سب اردووانے کے لسانی عمل کا کرشمہ ہے۔ ایسا گرامر میں بھی ہوا ہے' مثلاً ہم امیر' وزیر' فقیر کی جمع امیروں' وزیروں اور فقیروں یعنی ہندی طریقہ سے بناتے ہیں' اور ان کی مستعار جمع امرا' وزراء فقرا بھی استعمال میں لاتے ہیں' لیکن ہر عربی فارسی لفظ پر اس قاعدے کا اطلاق نہیں ہوتا' مثلاً صندوق عربی لفظ ہے لیکن اس کی عربی جمع صنادیق ہم استعمال نہیں کرتے' اور ہمیشہ ہندی صندوقوں ہی لکھتے پڑھتے ہیں۔ اسی طرح شمس عربی میں مؤنث ہے' اسے اردو میں ہندی سورج کی وضع پر مذکر بولا جاتا ہے۔ اردووانے کے عمل کا اثر گرامر کے علاوہ معنی کی تبدیلیوں پر بھی پڑا ہے۔ مثلاً امیر کے اصل معنی حاکم یا سردار کے تھے اور غریب کے اجنبی کے' ہم ان لفظوں کو روپیہ پیسے والے اور بغیر پیسے والے کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ خفا کے معنی گلا گھونٹنا ہے' ہم ناراض ہونا کے لئے بولتے ہیں۔ تیغ ہمارے یہاں تلوار ہے' اور ایران میں استرے کے معنی میں رہ گیا ہے۔ سید سلیمان ندوی نے ایک پر لطف مثال "ظریف و متین" کی پیش کی ہے۔ "ظریف" ہم اس شخص کو کہتے ہیں جس کی طبیعت میں مذاق ہو' "متین" ہم سنجیدہ آدمی کو کہتے ہیں۔ لیکن ایک ترکی اخبار میں سید سلیمان ندوی نے ایک جوتا بیچنے والے کا اشتہار دیکھا جو کہتا تھا کہ اس کے جوتے "ظریف و متین" ہیں' تو کیا اس کا مطلب یہ تھا کہ جوتے مذاق بھی کریں گے اور متانت سے بھی پیش آئیں گے۔ نہیں' وہ تو یہ اعلان کر رہا تھا کہ اس کے جوتے "ظریف" معنی خوبصورت بھی ہیں اور "متین" یعنی مضبوط بھی۔ آپ نے دیکھا اردو میں ان لفظوں کے معنی کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔

یہاں اس بات کی طرف بھی اشارہ ضروری ہے کہ اردو نے دیسی اور بدیسی عناصر میں جیسا اعتدال پیدا کیا ہے اس کی نظیر دوسری زبانوں میں آسانی سے نہیں ملتی۔ صرف

روز مرہ ہی کو لیجیے۔ آتش آگ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن "چولہے میں آتش جلا دو" اردو میں کہا ہی نہیں جا سکتا۔ اردو روز مرہ کی رو سے یہ غلط محض ہے۔ اردو میں ہمیشہ "چولہے میں آگ جلا دو" ہی کہا جائے گا۔ اگر دیسی یعنی ہندی لفظ کا محل ہے تو ہندی لفظ ہی استعمال ہو گا' عربی فارسی لفظ اس کی جگہ نہیں لے سکتا۔ یہ اردو کی خوش امتزاجی کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔ مثلاً

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

میں لفظ آگ استعمال ہوا ہے' اور

دہکا ہوا تھا آتش گل سے چمن تمام

میں لفظ آتش ایک کی جگہ پر دوسرے کا استعمال' قطع نظر بحر کی ضرورتوں کے ممکن ہی نہیں اردو اس معاملے میں مستعار اور ہندی لفظوں سے برابر کا سلوک کرتی ہے اور جہاں جس کا محل ہوتا ہے اسے استعمال کرتی ہے اردو کی یہ خوش مذاقی لسانی انصاف و اعتدال پر مبنی ہے' اور معمولی بات نہیں۔

اردو رسم خط بدیسی نہیں۔ اردو نے اس کو اپنی ضرورتوں کے مطابق ڈھالا ہے

اب مختصراً" ایک نظر اردو رسم خط پر بھی ڈال لی جائے' کیونکہ بہت سی غلط فہمیاں رسم خط کی وجہ سے پھیلائی جاتی ہیں۔ اردو رسم خط میں چھتیس حروف ہیں' چودہ ہکار اور معکوسی آوازوں کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے ان کی وجہ سے اردو رسم خط میں جو کایا پلٹ ہوئی ہے' وہ معمولی نہیں یعنی اردو رسم خط میں ایک تہائی سے بھی زیادہ حروف کا اضافہ اردو کی ہند آریائی ضرورتوں کی وجہ سے ہوا ہے۔ اردو بولتے لکھتے ہوئے ان آوازوں سے ہم بچ نہیں سکتے' لب و لہجہ' لفظوں کے بل اور سر لہروں کا اضافہ ان سے الگ ہے۔ غرض اس رسم خط کی' جو ہم نے صدیوں پہلے اردو کے لئے لیا تھا' اردوانے کے عمل کے دوران اتنی کایا پلٹ ہو چکی ہے کہ نہ صرف اس کی اصل آوازوں میں سے بہت سوں کو ہم نے بدل دیا ہے' بلکہ اس میں ایسی ایسی آوازوں اور علامتوں کا اضافہ بھی ہو چکا ہے' جو نہ عربی میں ہیں نہ فارسی میں۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو کا ایک صفحہ تو کیا'

ایک پیراگراف بھی ان آوازوں کے بغیر لکھا نہیں جا سکتا۔ مثال کے طور پر کسی اردو اخبار یا کتاب کا ایک صفحہ بھی اگر کسی ایرانی یا عرب کے سامنے رکھا جائے تو وہ اسے صحیح نہیں پڑھ سکے گا۔ اس سے انکار نہیں کہ اس رسم خط کو ہم نے عربی' فارسی سے لیا ہے اور مشرق وسطی سے ہمارے ثقافتی رشتوں میں اس رسم خط سے مدد ملتی ہے' لیکن یہ بھی سچ ہے کہ یہ رسم خط اردوائے جانے کے دوران تنسیخ و توسیع کے زبردست نامیاتی عمل سے گزر چکا ہے اور خاص حد تک بدل چکا ہے۔ چنانچہ اب اس کو بدیسی کہنا اور اس کی بنا پر ہندی اور اردو کی خلیج کو وسیع کرنا کہاں کی انصاف پسندی اور دانشمندی ہے۔ یہ رسم خط اب اردو کا رسم خط ہے' اور جس طرح دوسری ہندوستانی زبانوں کے اپنے اپنے رسم خط ہیں اور وہ ہمارے رسم خط ہیں' اردو رسم خط بھی ہمارا اپنا رسم خط ہے۔

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے

ہماری طرف داری صرف حق طلبی تک محدود نہیں ہونی چاہیے۔ اردو ایک زندہ زبان ہے اور زندہ زبانوں کا شیوہ ہے کہ اپنے فرائض اور ذمہ داریوں پر بھی نظر رکھتی ہیں۔ ہندوستان کے بدلے ہوئے حالات میں اردو کو یکسر نئے چیلنج کا سامنا ہے۔ اردو کی ضرورتیں' اس کی الجھنیں' اور اس کے مسائل دوسری ہندوستانی زبانوں سے بڑی حد تک الگ ہیں۔ ان پر ٹھنڈے دل سے سوچنے اور غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اردو کا شمار ہندوستان کی علاقائی Regional زبانوں میں ہوتا ہے لیکن اردو اس معنی میں علاقائی زبان ہرگز نہیں' جیسے دوسری ہندوستانی زبانیں علاقائی زبانیں ہیں یعنی جیسے بنگال کی زبان' بنگالی' گجرات کی گجراتی' یا پنجاب کی پنجابی ہے۔ اردو ایک ہندوستان گیر زبان ہے' اس کا زیادہ تر چلن وہاں وہاں ہے' جہاں ہندی کا بھی چلن ہے' کہیں کم کہیں زیادہ پھر یہ کہ اردو شمالی ہندوستان میں بھی ہے' اور جنوبی ہندوستان میں بھی' کہیں یہ کھڑی اور برج کی رفاقت کا دم بھرتی ہے' کہیں مرہٹی اور گجراتی کے ساتھ مل کر چلتی ہے' کہیں تیلگو' ملیالم' کنڑ اور تامل کی انگلی پکڑتی ہے' اور کہیں پنجابی' بنگالی' اڑیہ اور آسامی کے ساتھ ہے۔ ہندوستان کا لسانی نقشہ نہایت پیچیدہ اور گھنا ہے' اس میں زبانیں زبانوں سے اور بولیاں بولیوں سے

پیوست نظر آتی ہیں۔ ہندوستان کا شاید ہی کوئی خطہ' یا ہندوستانی سماج کا شاید ہی کوئی حصہ ہو جو یک لسانی Monolingual ہو' ہندوستان کے اکثر حصے' جہاں جہاں اردو کا چلن ہے' دو لسانی یا سہ لسانی Bilingual / Trilingual ہیں اور پورا ملک دنیا کے گنجان ترین کثیر لسانی خطوں Multilingual Areas میں سے ہے۔ یہ کثیرا للسانیت Multilingualism ہندوستان میں زبانوں کے باہمی تعلقات کے لئے' بالخصوص اردو جیسی غیر طبقاتی' اور غیر علاقائی' ہمہ گیر زبان کے لئے' نئے نئے چیلنج پیدا کرتی ہے ہر صوبے میں اردو کے مسائل الگ ہیں۔ ان تقاضوں اور مسائل کی طرف اردو والوں نے ابھی پوری توجہ نہیں کی۔ زبانوں کی ضرورتیں وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ ان میں جہاں صحت و اصول اور معیار بندی پر اصرار کرنا ضروری ہوتا ہے' وہاں لفظ و معانی کی نئی نئی تخلیقی سطحوں کی دریافت کرنا' اور زبان کے چلن کی نئی عمرانیاتی ضرورتوں پر نظر رکھنا بھی بے حد ضروری ہے۔ اقبال کا یہ شعر آج بھی اردو کے حسب حال ہے:

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
شمع یہ سودائی دل سوزی پروانہ ہے

maablib.org

maablib.org

ڈاکٹر جمیل جالبی

پاکستان کا دفتری نظام اور اردو

"پاکستان کا دفتری نظام اور اردو" ——————— یہ وہ موضوع ہے جو مجھے دیا گیا ہے اور جس پر مجھے اختصار کے ساتھ اظہار خیال کرنا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ پاکستان کا دفتری نظام کیا ہے؟ کیا یہ وہ نظام ہے جو ہم نے آزادی کے بعد اپنے قومی تقاضوں اور اپنی سماجی و معاشی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر وضع کیا ہے؟ چونکہ اس کا جواب نفی میں ہے اس لئے اس بات کے اظہار میں مجھے دیر نہیں کرنی چاہئے کہ یہ وہ نظام ہے جو ہمارے انگریز آقاؤں نے ' برصغیر پر اپنی مرضی کے مطابق ' حکومت کرنے کے لئے وضع کیا تھا تاکہ وہ اس سرزمین کو زیادہ سے زیادہ عرصے تک اپنے قبضے میں رکھ کر اپنی تجارت اور اپنی معاشی حالت کو مضبوط و بہتر بنا سکیں۔ یہ وہ دفتری نظام تھا جو برصغیر کے وسائل ' اس کی افرادی قوت اور عوام کے استعماری استحصال کے لئے وضع کیا گیا تھا۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو جب ہم آزادی کی نعمت سے بہرہ مند ہوئے تو ہم نے اسی نظام کو ' اس کے سارے قوانین اور ضابطوں کے ساتھ ' اپنا لیا اور بغیر کسی بنیادی تبدیلی کے آج تک اسی طرح سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ اس نظام کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ یہ نظام سرکاری کارندوں کے ذریعے اس طور پر چلایا جاتا تھا کہ ان کارندوں کا تعلق براہ راست عوام سے پیدا نہ ہو اور یہ کارندے اپنے ان گورے آقاؤں

کی فکر' اقدار اور طرز عمل کی نمائندگی و ترجمانی کریں جنہوں نے' اپنے مخصوص حکومتی مقاصد کے حصول کے لئے' انہیں مقرر کیا تھا۔ ان چھوٹے بڑے کارندوں کو ایسی تربیت دی جاتی تھی کہ وہ اپنے اس مخصوص کام کو زیادہ سے زیادہ اہلیت سے انجام دے سکیں۔ عام طور پر ان کارندوں کا تعلق اس مراعات یافتہ طبقہ خواص سے ہوتا تھا جس میں بڑے زمیندار' جاگیردار' نواب' راجہ مہاراجہ' بڑے تاجر اور روسا شامل تھے اور جو حکومت برطانیہ کے نمک خوار اور وفادار تھے۔ ان کے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے انگریز حکمرانوں نے سارے برصغیر میں ایسے انگریزی مدرسے قائم کئے تھے جہاں ان کی تعلیم و تربیت اس طور پر ہوتی تھی کہ ان کے ذہن اس تہذیبی سانچے میں ڈھل جاتے تھے جو اس تعلیم کا مدعا اور حکمرانوں کا مقصود تھا۔ اس تعلیم کے نتیجے میں طبقہ خواص کے یہ بچے اپنی تہذیب' اپنی معاشرت اور اپنے عوام سے کٹ جاتے تھے۔ یہی وہ تعلیمی ادارے تھے جن سے فارغ ہو کر یہ نوجوان عام طور پر سرکاری ملازمتوں میں جاتے تھے۔ ان طلبہ کی تعلیم و تربیت اس طور پر کی جاتی تھی کہ وہ اپنی تہذیب و ثقافت کو کمتر اور انگریزی زبان و ثقافت کو برتر سمجھنے لگتے تھے۔ ان مدرسوں میں نہ صرف ذریعہ تعلیم انگریزی زبان تھی بلکہ ان کے لباس' ان کے اٹھنے بیٹھنے' کھانے پینے' رہنے سہنے کے طریقے بھی خالص انگریزی انداز کے تھے۔ یہ وہ نسل تھی جو اس حکمت عملی کے نتیجے میں سامنے آئی تھی جسے لارڈ میکالے نے ۱۸۳۵ء میں وضع کیا تھا اور جسے گورنر جنرل ڈبلیو سی۔ بینٹنک نے منظور کر کے نافذ کیا تھا۔ لارڈ میکالے کی وہ حکمت عملی اس کے الفاظ میں یہ تھی کہ "ہمیں فی الحال اپنے اور اپنے کروڑوں محکوموں کے درمیان ترجمانوں کا ایک ایسا طبقہ پیدا کرنا چاہئے جو رنگ و خون کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو لیکن اپنے ذوق و پسند' آراء اور اخلاق و اطوار' ذہن اور انداز فکر کے اعتبار سے انگریز ہو۔" یہاں ترجمان کا لفظ بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ انگریزوں نے اپنے پروردہ طبقہ خواص کے انہی سپوتوں اور ترجمانوں کی مدد سے کم و بیش دو سو سال برصغیر پر حکومت کی اور جب انگریز رخصت ہوا تو سارا نظام حکومت اسی طبقے کے ہاتھوں میں تھا ـــــــ یہی نظام حکومت آزادی کے ساتھ ہمیں ورثے میں ملا۔

اس وضاحت سے آپ کو اندازہ ہوا ہو گا کہ پاکستان کا دفتری نظام کیا ہے۔ اس کی روح میں جبرواستحصال کے مقاصد کس طرح سرایت کئے ہوئے ہیں اور یہ دفتری نظام آج بھی کسی طرح ایک مختصر و محدود طبقہ خواص کے معاشی مفادات اور سماجی ضروریات کو پورا کر رہا ہے۔ اس دفتری نظام کے دروازے عوام پر بند ہیں اور گزشتہ ۴۵ سال میں اس طبقے نے ان دروازوں کو بند رکھنے کے لئے سارے راستوں کی پوری طرح' چوکس رہ کر' پاسبانی کی ہے۔ اب آپ خود فیصلہ کیجئے کہ یہ مراعات یافتہ حاکم و حکمران طبقہ اردو کو اس انگریزی دفتری نظام میں داخل کر کے کیوں اپنے اقتدار و اختیار کی باگ ڈور عوام کے ہاتھ میں دینے کو تیار ہو گا؟ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کی قومی زبان اردو کے راستے بند کئے رکھنا اور نئی نئی لسانی و نسلی نفرتیں پیدا کر کے انگریزی کو ہر سطح پر برقرار رکھنے کی کوششیں کرنا' اس طبقے کے مفادات کے عین مطابق ہے۔

اس دفتری نظام کو قائم و دائم رکھنے کے لئے' اس طبقہ خواص نے دو بنیادی اداروں کو پوری طرح اپنے قبضے میں لے رکھا ہے جن کی مدد سے نہ صرف اس کا سیاسی اقتدار باقی ہے بلکہ ملک کے معاشی وسائل بھی عام طور پر اس کے دست تصرف میں ہیں۔ ان دو بنیادی اداروں میں سے ایک نظام تعلیم ہے اور دوسرے اعلیٰ ملازمتوں کے لئے مقابلے کے امتحانات ہیں۔ ملک میں معقول' اچھی تعلیم کا' اونیٰ سطح سے لے کر اعلیٰ سطح تک' ذریعہ تعلیم انگریزی زبان ہے اور یہی زبان مقابلوں کے امتحانات اور انٹرویو کی زبان ہے۔ اس عمل سے وہ دفتری نظام آج تک زندہ' فعال اور مؤثر ہے جس سے طبقہ خواص کا اقتدار و اختیار پوری طرح برقرار رہے۔ یہ طبقہ اپنے بچوں کو خصوصیت کے ساتھ ان اسکولوں اور کالجوں میں بھیجتا ہے جو انگریزوں نے ان کے لئے کھولے اور قائم کئے تھے یا ان اسکولوں اور کالجوں میں بھیجتا ہے جو اس نے اسی انداز پر آزادی کے بعد قائم کئے ہیں اور جہاں کی ہوشربا فیسیں اور اخراجات عوام کے بچوں کی دسترس سے باہر ہیں۔

اس صورت حال پر غور کیجئے کہ اس دو عملی سے کس طرح پاکستان میں یہ دو طبقے قائم و دائم ہو گئے ہیں جن کے درمیان فاصلہ روز بروز بڑھتا اور خطرناک ہوتا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو' عام رابطے کی مشترک' ضروری اور مضبوط زبان ہونے کے باوجود

آج تک رائدہ درگاہ ہے۔

عہد غلامی سے ورثے میں ملا ہوا اور پاکستان میں پوری طرح مروج یہ نظام طبقہ خواص کی پوری طرح مدد کر رہا ہے۔ پہلے یہ نظام گورے آقاؤں کے ہاتھ مضبوط کرتا تھا، آج یہ نظام اس ملک کے اس محدود طبقہ خواص کو بڑھاوا دے رہا ہے جس نے گورے آقاؤں کی جگہ لے لی ہے۔ یہاں مجھے ایک کہاوت یاد آ رہی ہے جو اس صورت حال کی پوری طرح ترجمانی کرتی ہے۔ "دکھ بھریں بی فاختہ اور کوے انڈے کھائیں"۔ اس سے سارے معاشرے میں ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں کہ قومی دھارے کا پانی گندا اور گدلا ہو گیا ہے اور بحرانوں کے گدھ ہر دم ہمارے سروں پر منڈلاتے رہتے ہیں۔ ان حالات نے ساری فضا کو بدل دیا ہے اور معاشرتی رویوں کو اس طور پر متاثر کیا ہے کہ اب ہمارا غریب اور متوسط طبقہ بھی اپنے بچوں کو طبقہ خواص کی سی تعلیم دلوانے کے لئے جھوٹے اور تیسرے درجے کے انگریزی میڈیم اسکولوں میں بھیج رہا ہے جو سارے ملک کے گلی کوچوں میں ہزاروں کی تعداد میں کھل گئے ہیں جہاں عام طور پر نہ تعلیم نام کی کوئی چیز ہے اور نہ حصول تعلیم کی بنیادی سہولتیں میسر ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ تعلیم کا معیار حد درجہ گر گیا ہے اور عوام کی تعلیمی حالت حد درجہ خراب ہو گئی ہے۔ اس جھوٹی تعلیم نے ایک ایسی دوغلی نسل کو جنم دیا ہے جس کا تعلق نہ اپنی تہذیب سے قائم و باقی رہا ہے اور نہ مغربی یا انگریزی تہذیب سے قائم ہو سکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ ۳۵ سال کے عرصہ میں ہم نے کسی شعبہ زندگی میں، صحیح معنی میں، ایک بھی بڑا آدمی پیدا نہیں کیا۔ بڑا آدمی تو ثابت و سالم تہذیبی اکائی کے کوکھ سے پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں اس نظام نے ہماری تہذیبی اکائی کو کمزور و بے جان کر دیا ہے اور ہم دھوبی کے اس کتے کی طرح ہو گئے ہیں جو کہاوت کے مطابق نہ گھر کا رہا ہے اور نہ گھاٹ کا۔ اس نظام نے ہماری تخلیقی قوتوں کی جڑوں کو سکھا دیا ہے اور ہمیں اپنی روایت اور ثقافت کے تعلق سے شدید احساس کمتری میں مبتلا کر دیا ہے۔ اس انداز فکر نے یکساں، عام اور غیر طبقاتی نظام تعلیم کے تصور کو بھی بے معنی بنا دیا ہے اور تہذیب و ثقافت اور احیاء العلوم کے عمل کو بھی الٹ دیا ہے۔ حقیقی نظام تعلیم ہی وہ بنیاد ہے جس کے مقاصد کی صورت پر نئی نسلیں پیدا ہوتی ہیں۔

جیسا نظام تعلیم ہو گا ویسی ہی قوم اور اس کے افراد ہوں گے۔

اس لئے میں یہ بات بار بار کہتا رہا ہوں کہ جب تک ہمارے ہاں ذریعہ تعلیم انگریزی زبان رہے گا ہم نہ تو سو فی صد شرح تعلیم کا ہدف حاصل کر سکیں گے اور نہ اپنے طلبہ میں تخلیقی قوتوں کو اجاگر و بیدار کر سکیں گے۔ انگریزی ذریعہ تعلیم نے پاکستانی معاشرے اور ثقافت کو تخلیقی، معاشرتی و تہذیبی حتیٰ کہ معاشی سطح پر بری طرح نقصان پہنچایا ہے۔ یونیسکو کے عالمی ماہرین تعلیم نے ذریعہ تعلیم کے سلسلے میں جو رپورٹ پیش کی ہے اس میں بھی اس بات پر پورا زور دیا ہے کہ ذریعہ تعلیم بچوں کی اپنی زبان ہونی چاہئے یا وہ زبان ہونی چاہئے جسے وہ بولتے، سمجھتے اور استعمال کرتے ہوں اور جو ان کی تہذیب و ثقافت کا حصہ ہو۔ اس رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے اگر کوئی غیر ملکی زبان ایسے کلچر سے تعلق رکھتی ہو جو اس کے اپنے کلچر سے بہت مختلف ہو جیسے انگریزی زبان نائیجیریا یا کسی پاکستانی بچے کے لئے، تو اس صورت میں بچہ کبھی بھی مناسب و معقول طور پر اس میں اظہار نہ کر سکے گا اور نہ کسی علم کے بنیادی تصورات اور اصول پوری طرح اس کے ذہن نشین ہو سکیں گے۔ فرانسیسی مفکر و دانشور ژاں پال سارتر نے ایک جگہ لکھا ہے کہ وہ لوگ جو کسی بدیسی، غیر زبان کو استعمال کرتے ہیں یا اس میں لکھتے ہیں تو ان کی حیثیت ہمیشہ ایک "کرایہ دار" کی رہتی ہے۔ ہماری حیثیت بھی آج ایک ایسے ہی کرائے دار کی ہے۔ یہ کہہ کر میں یہ ہرگز نہیں کہہ رہا ہوں کہ آپ انگریزی زبان کو ترک کر دیجئے۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ انگریزی کو ایک زبان کی حیثیت سے خوب پڑھیے اور خوب پڑھائیے، اس پر عبور حاصل کیجیے لیکن خدا را اسے ذریعہ تعلیم نہ بنائیے۔ ساری خرابیاں اور ساری بربادیاں اسی سے پیدا ہو رہی ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر حمید احمد خان نے اپنی کتاب "تعلیم و تہذیب" میں لکھا ہے کہ "برطانوی دور تک تعلیم اور زندگی کے دوسرے کاروبار میں انگریزی کے بجا اور بے جا استعمال کے لئے ایک قسم کا جواز موجود تھا لیکن استقلال پاکستان کے بعد ساری تعلیمی زندگی میں انگریزی پر غیر ضروری انحصار بے تدبیری بھی ہے اور خواہ مخواہ کی مصیبت پسندی بھی۔ یہ ایک تاریخی اور منطقی عجوبہ ہو گا کہ اہل پاکستان تحصیل علم اور روز مرہ کے مشاغل میں ایک ایسی زبان سے کام

لیتے رہیں جو ان کی تہذیب و تمدن سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی اور جس کا بے محابا استعمال طالب علم کے ذہن میں یہ خیال راسخ کرتا ہے کہ روشنی صرف مغرب سے طلوع ہو سکتی ہے اور ہماری اپنی قوم کا دماغ صرف اندھیرے کا سرچشمہ ہے۔ قومی اعتماد کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے کا کوئی اس سے بڑا ذریعہ شاید ہی ممکن ہو"۔

میں اپنی بات کو اور پھیلانا نہیں چاہتا اور یہ کہہ کر اسے ختم کرتا ہوں کہ جب تک آپ انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنائے رکھیں گے' جب تک آپ عوام کو مساوات کے حقیقی عمل میں شریک نہیں کریں گے' جب تک آپ مقابلے کے امتحانات میں اردو کو وسیلہ امتحان نہیں بنائیں گے' انگریزوں کا بنایا ہوا یہ نظام ہماری حقیقی ترقی کو گھن کی طرح اندر ہی اندر کھا کر ہمیں آگے بڑھنے سے محروم رکھے گا' ہم اسی طرح بحرانوں کا شکار رہیں گے' ناقابل حل مسائل ہمیں اسی طرح گھیرے رہیں گے' یک جہتی کے لئے ہم اسی طرح ترستے رہیں گے' ہماری شرح خواندگی اسی طرح ۲۶.۲ فیصد کی کھونٹی پر ٹنگی رہے گی اور ہم استعماری قوتوں کے استحصال کا شکار ہو کر اسی طرح تیسرے درجے کی قوم بنیں رہیں گے۔ اب یہ فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ آپ کیا بننا چاہتے ہیں یا سی طرح اندھیروں میں زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں ؟؟؟

ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر خلیق انجم

بھارت میں اردو

نادر شاہ، احمد شاہ ابدالی، مرہٹوں، جاٹوں اور روہیلوں کے لگاتار حملوں نے جب دلی کو اجاڑ دیا تو بہت سے شاعروں اور فن کاروں نے اودھ کا رخ کیا۔ لکھنؤ اردو زبان و ادب کا دوسرا مرکز بن گیا۔ اگرچہ فرخ آباد اور رام پور وغیرہ کے درباروں میں شاعروں کے دم سے رونق تھی لیکن دلی کے بعد سب سے اہم مرکز لکھنؤ ہی قرار پایا اور لکھنؤ کے زیر اثر پورے اتر پردیش میں اردو کے پودے نے ایسی نشوونما پائی کہ وہ ایک تناور درخت بن گیا۔ انیسویں صدی کے آغاز سے لے کر تقریباً ڈیڑھ سو سال تک اتر پردیش نے اردو زبان اور ادب کی قابل قدر خدمات انجام دیں۔ اگرچہ دلی میں ادبی سرگرمیاں جاری رہیں۔ پنجاب اور خاص طور سے لاہور ایک اہم ادبی مرکز بن گیا۔ پنجاب نے علامہ اقبال جیسا عظیم شاعر پیدا کیا۔ نوابان حیدر آباد کی اردو نوازی نے حیدر آباد کو بھی اردو زبان اور ادب کے نقشے پر اہم مقام دیا۔ اتر پردیش میں صف اول کے ممتاز اردو ادیبوں اور شاعروں کی اتنی بڑی تعداد پیدا ہوئی کہ اتر پردیش اور خاص طور سے لکھنؤ کو آزادی ملنے تک اردو زبان و ادب کا سب سے بڑا مرکز سمجھا جاتا رہا۔ جنگ آزادی کا سب سے بڑا میدان اتر پردیش ہی تھا اس لئے آزادی کے راستے میں رکاوٹ ڈالنے کے لئے انگریز حکومت نے زبان کا سہارا بھی لیا۔ مذہب کی بنیاد پر ہندی اور اردو کے نعرے بلند کرائے گئے شمالی ہند اور خاص طور سے اتر پردیش کے باسیوں

کے ذہنوں میں لسانی زہر سرایت کر گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آزادی ملتے ہیں اس خطے کے اہل اردو کی زبان اور تہذیب پر خطرناک حملے کئے گئے جو آج بھی جاری ہیں۔ اتر پردیش میں تعلیمی نظام کچھ اس طرح تھا کہ عام طور سے ہندو اور مسلم اردو اور ہندی دونوں زبانیں اسکول میں پڑھتے تھے۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان آزاد ہوا اور ۲۹ اگست کو اتر پردیش حکومت نے اعلان کر دیا کہ پرائمری سطح پر ذریعہ تعلیم صرف ہندی رہے گا آہستہ آہستہ حکومت نے تمام پرائمری اسکولوں سے اردو ذریعہ تعلیم جو عرصے سے چلا آرہا تھا ختم کر دیا۔ ہاں ایسے اسکول خاصی تعداد میں باقی رہے جہاں اردو بحیثیت مضمون پڑھائی جاتی ہے۔ اردو کی سب سے بری حالت اتر پردیش میں ہے اور ہندوستان میں اردو کی حالت کو اسی ریاست کے گز سے ناپا جاتا ہے۔ یہ پیمانہ صریحاً غلط ہے۔

ہندوستان میں اردو کی موجودہ صورت حال وہ نہیں ہے جو آزادی سے قبل تھی۔ آزادی ملنے سے پہلے انتظامی مصلحتوں کے پیش نظر برطانوی حکومت ایک ایسی زبان کی سرپرستی کرتی تھی جو ہندوستان کے زیادہ سے زیادہ بڑے علاقے میں بولی اور سمجھی جاتی ہو اور یہ زبان صرف اردو ہی ہو سکتی تھی۔ اگرچہ بعض انگریز افسروں نے اتر پردیش، راجستھان اور دوسرے مقامات پر ہندو مسلمان میں تفرقہ پیدا کرنے کے لئے دیوناگری رسم الخط میں ہندی کی بھی سرپرستی کی اور درپردہ ہندی والوں کو اردو کے خلاف بھڑکایا اس غیر انسانی سازش کا جو نتیجہ ہوا وہ ہمارے سامنے ہے۔

آزادی کے بعد صورت حال مختلف ہو گئی۔ شمالی ہند میں ہندی نے اور مختلف ریاستوں میں وہاں کی علاقائی زبانوں نے اپنے جائز حقوق کا مطالبہ کیا۔ چنانچہ بارہ علاقائی زبانوں کو ان کی اپنی اپنی ریاستوں میں سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہو گیا اور اردو اپنے بیشتر حقوق سے محروم ہو گئی شمالی ہند میں اردو کی موجودہ صورت حال کی تین اہم وجہیں ہیں۔ ایک وجہ تو وہ سیاسی ہے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اردو کا بڑا علاقہ وہی ہے جو ہندی کا ہے۔ یعنی اتر پردیش، بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان، ہریانہ، اور ہماچل۔ ان ریاستوں میں اکثریت کی زبان ہونے کی وجہ سے ہندی سرکاری زبان ہے اور سرکاری زبان ہونے کی وجہ سے تعلیمی اور انتظامی شعبوں میں جو سہولتیں ہندی کو حاصل ہیں اور کسی اقلیتی

زبان کے لئے ممکن ہی نہیں۔ تیسری اور سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ دستور ہند میں تسلیم شدہ پندرہ زبانوں میں دو جدید زبانیں ایسی ہیں جن کا اپنا کوئی علاقہ نہیں وہ زبانیں ہیں اردو اور سندھی، سندھی کو ہندوستان کی کسی ریاست میں کوئی حیثیت نہیں مل سکی۔ دستور ہند کی ۱۵ زبانوں میں بولنے والوں کی تعداد کے اعتبار سے اردو چھٹے نمبر پر ہے۔ اردو کی سب سے بڑی طاقت یہ ہے کہ اس کے بولنے والے ہندوستان کی تقریباً" ہر ریاست میں موجود ہیں لیکن یہ ہی اس کی ایک کمزوری بھی ہے کیوں کہ کسی میں بھی ان کی تعداد اتنی نہیں ہے کہ اسے سرکاری زبان کا درجہ دیا جاسکے۔ اور جمہوریت میں حق نہیں تعداد دیکھی جاتی ہے۔

اردو جموں و کشمیر میں سرکاری زبان کے طور پر تسلیم کی گئی ہے آزادی سے قبل بھی اردو کو جموں و کشمیر میں معاون سرکاری زبان کی حیثیت حاصل تھی لیکن کشمیر کی مشکل یہ ہے کہ یہ ریاست تین حصوں میں تقسیم ہے۔ جموں، کشمیر وادی، اور لداخ، ان تینوں علاقوں میں ڈوگری، کشمیری اور لداخی بولی جاتی ہے اور ان تینوں علاقوں میں پڑھی جاتی ہیں لیکن اردو صرف وادی کشمیر میں ذریعہ تعلیم ہے۔ آزادی کے بعد ہی سے اہل اردو، انجمن ترقی اردو ہند اور اردو کی بے شمار تنظیمیں اردو کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ انجمن ترقی اردو (ہند) نے ۱۵ فروری ۱۹۵۴ء میں ۲۲ لاکھ دستخطوں کا ایک میمورنڈم صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ اردو اتر پردیش، بہار، اور دوسرے صوبوں میں دوسری سرکاری زبان کے طور پر تسلیم کیا جائے۔ لیکن اس میمورنڈم کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔

دستور ہند کی دفعہ ۳۴۵ میں کہا گیا ہے کہ اگر کسی ریاست میں اقلیتی زبان بولنے والوں کی تعداد قابل لحاظ ہوگی تو اس زبان کو بھی ریاست کے مخصوص علاقوں میں مخصوص مقاصد کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں اہل اردو اسی دفعہ کے تحت اپنے حقوق کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں۔ آندھرا پردیش ہندوستان کی پہلی ریاست ہے جس نے اردو والوں کے اس مطالبے کو تسلیم کیا۔ اس ریاست کی مجلس قانون ساز نے ۴ جولائی ۱۹۷۷ء کو اپنے لینگویج ایکٹ ۱۹۶۶ میں دفعہ ۷ کا اضافہ کیا اس ایکٹ کی دفعہ میں کہا گیا ہے۔

"ریاستی حکومت حسب ضرورت آندھرا پردیش گزٹ میں اعلان کے
ذریعے تلگو زبان کے علاوہ اردو یا کسی اور زبان کے استعمال کے لئے

یہ زبان یا زبانیں بولنے والے کے افادے کی خاطر ان علاقوں میں اور ریاستوں کی ان سرکاری اغراض کے لئے اور اس مدت کے لئے کہ جس کا اعلانیہ میں ذکر ہو ہدایت دے سکتی ہے"۔

۲۹ جنوری ۱۹۸۱ء کو بہار کی قانون ساز اسمبلی نے ایک ایکٹ منظور کیا جسے بہار راج بھاشا ترمیمی ایکٹ ۱۹۸۱ء کہا جاتا ہے۔ اس ایکٹ میں خاص علاقوں میں خاص مقاصد کے لئے اردو زبان کے استعمال کی صراحت موجود ہے۔ ابتدا میں حکومت نے ۱۵ اضلاع کی نشان دہی کی مگر بعد کو ان میں ۱۱ اضلاع کا اضافہ کیا گیا اور بالآخر اسے پورے بہار کے لئے لاگو کیا گیا۔ مذکورہ بالا ایکٹ میں جن مقاصد کی صراحت کی گئی ہے وہ درج ذیل ہے۔

۱۔ اردو میں عرضی دعووں اور درخواستوں کو قبول کرنا اور ان کے جوابات بھی اردو میں دینا۔

۲۔ رجسٹریشن آفس میں اردو میں تحریر شدہ کاغذات و دستاویزات قبول کرنا۔

۳۔ اہم سرکاری قواعد و ضوابط اور اعلانات کو اردو میں شائع کرنا۔

۴۔ عوامی اہمیت کے سرکاری احکامات اور گشتی مراسلوں کو اردو میں بھی جاری کرنا۔

۵۔ اہم سرکاری اشتہارات کو اردو بھی میں شائع کرنا۔

۶۔ گزٹ کا اردو ترجمہ بھی شائع کرنا۔

۷۔ اہم دفاتر کے نام بورڈ میں اور تختیوں پر اردو میں لکھنا۔

کرناٹک میں کوئی آفیشل لینگویج ایکٹ نہیں ہے البتہ ۲۲ نومبر ۱۹۸۲ء میں گورنمنٹ کا ایک جی او جاری کیا گیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ جہاں اردو بولنے والی آبادی کا تناسب ۱۵ فی صد یا اس سے زاید ہو وہاں اہم قوانین، قواعد و ضوابط سرکاری احکامات اردو میں بھی جاری کئے جانے چاہیں مگر اس آرڈر پر باقاعدہ عمل نہیں کیا گیا۔

اتر پردیش نے بھی اپنے آفیشل لینگویج ایکٹ میں کچھ خاص سرکاری اغراض کے لئے اردو کے استعمال کی گنجائش فراہم کرنے کے لئے ضروری ترمیمات کیں۔ اس ترمیم کو uttar Pradesh official language (amendment) ACT-1989 کہا جاتا ہے یہ قانونی گنجائش محض چند اضلاع کی حد تک محدود نہیں بلکہ اس کا اطلاق ساری ریاست پر ہوتا ہے۔ ترمیم یافتہ قانون کے تحت مندرجہ ذیل اعلان کیا گیا۔

"اتر پردیش لینگو یجز ایکٹ ۱۹۵۱ء کے سیکشن ۳ کے تحت حاصل اختیارات کو بروئے کار لاتے ہوئے گورنر کو یہ حکم جاری کرتے ہوئے مسرت محسوس ہوتی ہے کہ اردو بولنے والے لوگوں کے مفاد میں حسب ذیل مقاصد کے لئے اردو زبان کو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے استعمال کیا جائے۔

(۱) عرضی دعوے اور درخواستیں اردو میں قبول کرنا اور ان کے جوابات بھی اردو میں دینا۔

(۲) رجسٹریشن آفس میں اردو میں تحریر شدہ کاغذات اور دستاویزات قبول کرنا۔

(۳) اہم سرکاری قوانین قواعد وضوابط اور اعلانات کو اردو میں بھی شائع کرنا۔

(۴) عوامی اہمیت کے سرکاری احکامات اور گشتی مراسلوں کو اردو میں بھی جاری کرنا۔

(۵) اہم سرکاری اشتہارات کی اردو میں بھی اجرائی

(۶) گزٹ کا اردو ترجمہ کی بھی اشاعت اور

(۷) اہم بورڈس اور تختیاں اردو میں بھی ہونا۔

یہ اقل ترین مقاصد گجرال کمیٹی کی سفارشات کے مقابلے میں بہت کم ہیں مگر ان پر بھی عمل آوری نہیں ہو رہی۔

مغربی بنگال

اگرچہ مغربی بنگال سرکاری نے اردو کو جگہ دینے کے لئے اپنے آفیشل لینگویج ایکٹ میں کوئی ترمیم نہیں کی۔ تاہم ریاستی حکومت نے ایک عاملانہ حکم نامہ نمبر سی اے ۷ ۲۰۳ مورخہ ۳ اکتوبر ۱۹۸۱ء کے ذریعے اعلان کیا کہ اردو کو بعض خاص مقاصد کے لئے سرکاری زبان کی حیثیت سے کلکتہ آسنسول اور اسلام پور سب ڈویژنوں میں اردو بولنے والی آبادی کے استفادہ کے لئے حتی الامکان اردو کو سرکاری اغراض کے لئے بتدریج استعمال کیا جانا چاہئے۔ حکم نامہ میں کہا گیا ہے کہ گورنر نے یہ کہنے کی ہدایت دی ہے کہ حکومت کے تمام محکمہ جات، ڈائرکٹوریٹ اور ڈسٹرکٹ آفیسرس حسب ذیل تجاویز پر ممکنہ عجلت سے عمل در آمد کریں گے۔

۱۔ ایسے اردو ذریعہ تعلیم کے پرائمری اور سیکنڈری اسکول جو پہلے سے چل رہے ہیں اور سرکاری منظوری حاصل کرنے کے لئے درخواست دے چکے ہیں ان کو منظوری دینے کے لئے فوری کارروائی کی جائے گی۔

۲۔ آسنول اور اسلام پور میں سب ڈویژن اور بلاک کے دفاتر میں اردو ٹائپ رائٹرس خریدنے اور اردو ٹائپسٹوں کا تقرر کرنے کے لئے اقدامات کئے جائیں گے۔ اسی طرح زراعت، تعلیم، امور داخلہ، صحت اور خاندانی فلاح و بہبود، اراضی اور اصطلاحات اراضی گھریلو اور چھوٹی صنعتیں پنچایت اور اور وی ایس کے محکمہ جات میں سے ہر ایک میں ایک اردو ٹائپ رائٹر خریدا جائے گا اور ایک اردو ٹائپسٹ کا تقرر کیا جائے گا۔

۳۔ اردو ٹائپ رائٹر اور وو ٹائپسٹوں کی دستیابی کے بعد اردو میں وصول ہونے والے تمام خطوط کے جوابات بھی اردو ہی میں دیئے جائیں گے اسی طرح کلکتہ، آسنول اور اسلام پور میں حکومت کے اہم گشتی مراسلے، اردو میں بھی جاری کئے جائیں گے۔

آزادی کے بعد جب اردو بیورو کریسی کے ظلم و ستم کا شکار ہونے لگی تو مرکزی حکومت نے اس سلسلے میں کچھ اہم قدم اٹھائے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا قدم کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اٹھایا۔ اس نے ۵ اگست ۱۹۴۹ء کو ایک ریزولیوشن پاس کیا کہ تمام بچوں کو پرائمری سطح پر ان کی مادری زبان کے ذریعے تعلیم دی جانی چاہئے اس ریزولیشن میں یہ بھی طے کیا گیا کہ اقلیتی لسانی گروہوں کے بچوں کو بھی ان کی مادری زبان میں تعلیم دی جانی چاہئے۔ کچھ ہی دن بعد مرکزی حکومت نے تمام صوبوں کے وزرائے تعلیم کی ایک کانفرنس کی، اس کانفرنس میں تعلیم کے سلسلے میں اقلیتی فرقوں کی زبان کے مسائل پر غور کیا گیا۔ کمیٹی نے اس حقیقت پر گہرے رنج کا اظہار کیا کہ اکثریتی فرقے کی زبانیں اقلیتی فرقوں کی زبانوں کے راستے میں حائل ہو رہی ہیں۔ اس کانفرنس میں ۴۰ نسبت ۱۰ کے فارمولے کی تجویز پیش کی گئی جسے اتفاق رائے سے منظور کیا گیا۔ اس فارمولے کے تحت اگر ایک کلاس میں دس یا پورے اسکول میں چالیس بچے اردو کے ذریعے تعلیم پانا چاہتے ہیں تو محکمہ تعلیم کے لئے لازمی ہوگا کہ اس اسکول میں ایک اردو استاد کا تقرر لازما" کیا جائے گا۔

بچے کی مادری زبان وہ ہوگی جسے اس کے ماں باپ لکھوائیں گے۔ اس کانفرنس میں یہ

بھی۔ طے پایا کہ اگر ثانوی سطح پر اقلیتی فرقوں کے بچے اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنا چاہیں تو اس کا بھی انتظام کیا جائے۔ اگر بچوں کی تعداد اس قابل ہو کہ ان کے لئے ایک علیحدہ اسکول قائم کیا جاسکے تو ضرور کیا جائے۔ اور اگر اقلیتی فرقے ایسے اسکول قائم کریں جن کا ذریعہ تعلیم ان کی مادری زبان ہو تو صوبائی حکومتوں کو چاہئے ان اسکولوں کو تسلیم کرنے اور انہیں گرانٹ اور وہ تمام دوسری سہولتیں فراہم کریں جو اس طرح کے اسکولوں کو فراہم کی جاتی ہیں۔ بظاہر یہ تجویز بہت اچھی تھی اگر اس پر ایمانداری سے عمل کیا جاتا تو اقلیتی فرقوں کو زیادہ شکایت کا موقع نہ ملتا۔ لیکن ہوا یہ کہ اسکولوں کے ہیڈ ماسٹروں نے ایک ایسی ترکیب نکالی جس کی وجہ سے اردو استادوں کا تقرر ناممکن ہوگیا۔ وہ اقلیتی فرقے کے بچوں کی تعداد چار پانچ سے زیادہ بڑھنے نہیں دیتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ۴۰:۱۰ کی شرط پوری نہیں ہوتی۔ اگر مادری زبان کے ذریعے بچوں کو تعلیم دلانے کے خواہاں والدین ماسٹر کے پاس بچوں کو لے کر جاتے تو وہ صاف جواب دے دیتے کہ بچوں کی تعداد دس سے کم ہے اس لئے ان کی مادری زبان میں تعلیم کا انتظام نہیں کیا جاسکتا۔

جب مرکزی حکومت کے علم میں یہ شکایت لائی گئی تو حکومت نے ایڈوانس رجسٹر کا طریقہ ایجاد کیا۔ یعنی طے پایا کہ ہر اسکول میں ایک رجسٹر رکھا جائے گا جب بھی اقلیتی فرقے کا کوئی ایسا بچہ داخلے کے لئے آئے گا جو اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کا نام ایڈوانس رجسٹر میں لکھ لیا جائے گا۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹروں کے ہاتھوں اس رجسٹر کا بھی بہت برا حشر ہوا۔ بیشتر اسکولوں میں کسی دباؤ کی وجہ سے یہ رجسٹر رکھے گئے وہاں ہیڈ ماسٹروں اور کلاس ماسٹروں نے بچوں کے والدین کو یہ کہہ کر بہکایا کہ بچے نے اگر اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کی تو بڑے ہو کر اسے ملازمت نہیں ملے گی۔ یہ اس طرح کی بات ہے کہ والدین عام طور پر ڈر جاتے ہیں اور بچے کو اکثریتی زبان کی کلاس میں داخل کروا دیتے ہیں۔ ثانوی سطح کے لئے ۶۰:۱۵ کا فارمولا بنایا گیا یعنی اگر کہیں اسکول کی ایک کلاس میں اقلیتی فرقے کے پندرہ بچے اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں یا پورے اسکول میں ۶۰ بچے اقلیتی زبان کے ذریعے تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اردو استادوں کا تقرر لازماً کیا جائے گا۔

۱۹۶۵ء میں جب ہندوستان کے صوبوں کی تنظیم نو کے لئے ایک کمیشن مقرر ہوا تو کمیشن

نے سفارش کی کہ اقلیتی فرقے کے بچوں کو پرائمری سطح پر ان کی مادری زبان میں تعلیم دی جانی چاہئے اس سلسلے میں کمیشن نے یہ سفارش بھی کی کہ اقلیتی فرقے کے بچوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم دینے کے سلسلے میں تحفظات کی گارنٹی ہندوستان کے آئین میں دی جانی چاہیے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ہندوستان کے آئین میں دو دفعات ۳۵۰ الف اور ۳۵۰ ب کا اضافہ کیا گیا۔ ۳۵۰ الف کے تحت کہا گیا ہے کہ ہر ریاست اور اس ریاست کے اندر ہر مقامی حاکم کی کوشش ہوگی کہ لسانی اقلیتی زمروں سے تعلق رکھنے والے بچوں کو ابتدائی درجے میں تعلیم دینے کی کافی سہولتیں مہیا کریں۔

صدر جمہوریہ ہند کسی بھی ریاست کو ایسی سہولتیں دے سکے گا جو مادری زبان کے ذریعے تعلیم کے انتظامات کے لئے ضروری ہیں۔ دفعہ ۳۵۰ ب کے تحت کہا گیا ہے کہ:

"ایک ایسے عہدے دار کا تقرر کیا جائے۔ جو لسانی اقلیتوں کے لئے دیئے ہوئے تحفظات کے متعلق سب امور سے متعلق تمام واقعات کی رپورٹ صدر جمہوریہ ہند کو دے۔ صدر جمہوریہ ہندیہ رپورٹیں پارلیمنٹ میں پیش کروائے گا اور متعلقہ صوبائی حکومتوں کو بھجوائے گا۔

حکومت نے ۱۹۵۷ء میں لسانی اقلیتوں کے کمشنر کا تقرر کیا۔ کمشنر نے اپنی تمام رپورٹوں میں ذکر کیا ہے کہ پرائمری سطح پر اردو کے ذریعہ تعلیم کی مناسب سہولتیں نہیں ہیں۔

حکومت نے محسوس کیا کہ ۱۰:۳۰ اور ۱۵:۴۰ کے فارمولے کافی نہیں ہیں کیوں کہ یہ ممکن ہے کہ بچے کسی ایسے اسکول میں تعلیم پاتے ہوں جس کا ذریعہ تعلیم ان کی مادری زبان سے مختلف ہو اور یہ بچے اپنی مادری زبان بہ حیثیت مضمون پڑھنا چاہتے ہوں۔ پہلی بار یہ مسئلہ ۱۹۴۹ء میں وزرائے تعلیم کانفرنس کے سامنے آیا اور یہ طے پایا کہ لسانی اقلیتوں کے بچوں کو یہ موقع فراہم کیا جانا چاہئے کہ وہ اپنی مادری زبان ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھ سکیں۔ اس خیال کے پیش نظر لسانی فارمولا حسب ذیل صورت میں تشکیل دیا گیا۔

پہلا فارمولا

الف (۱) مادری زبان

یا

یا

(۲) علاقائی زبان

یا

(۳) مادری زبان اور علاقائی زبان کا مشترکہ کورس

(۴) مادری زبان اور کلاسیکی زبان کا مشترکہ کورس

ب۔ ہندی یا انگلش

ج۔ کوئی سی ایک جدید ہندوستانی یا جدید یورپی زبان بشرطیکہ وہ (الف) اور (ب) کے تحت نہ پڑھی جا رہی ہو۔

دوسرا فارمولا

(الف)۔ لسانی فارمولے پر اگر پوری طرح عمل کیا جائے تو کافی حد تک اردو کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔

(ب) انگریزی یا کوئی سی ایک جدید یورپی زبان۔

(ج) ہندی (غیر ہندی علاقوں کے سیاہ کے لئے)

کوئی سی جدید ہندوستانی زبان (ہندی علاقوں کے لئے) وزرائے اعلیٰ اور مرکزی وزیروں کی کانفرنس میں لسانی فارمولے کو درج ذیل شکل میں منظور کیا گیا۔ (الف) علاقائی زبان اور مادری زبان، جب کہ مادری زبان علاقائی زبان سے مختلف ہو۔

(ب) ہندی علاقوں میں کوئی سی جدید ہندوستانی زبان

(ج) انگلش یا کوئی سی جدید یورپی زبان۔

مختلف صوبوں نے اس فارمولے کو مختلف شکلوں میں تسلیم کیا شمالی ہند کی ریاستوں میں یہ فارمولا جس شکل میں اختیار کیا گیا وہ حسب ذیل ہے۔

(۱) مادری زبان

(۲) کوئی بھی ایک جدید ہندوستانی زبان

(۳) کوئی سی ایک جدید یورپی زبان

شمالی ہند میں تقریباً" تمام ریاستوں نے دوسری زبانوں یعنی کوئی سی ہندوستانی جدید زبان کے طور پر سنسکرت کو شامل کر لیا اور سنسکرت کی تعلیم کے انتظامات کر دیئے گئے نتیجہ یہ ہوا کہ

اردو اور بعض دوسری زبانیں اپنے حق سے محروم ہو گئیں گجرال کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں لسانی فارمولے کی حسب ذیل صورت تجویز کی ہے۔

------ہندی ریاستوں میں------

(الف) (سنسکرت مشترکہ کورس کے حصہ کے طور پر)

(ب) اردو یا کوئی ایک جدید ہندوستانی زبان (الف) کے علاوہ

(ج) انگریزی یا کوئی جدید ہندوستانی زبان اردو لسانی مقبولیت کے معاملہ میں ان کی مادری زبان اول زبان ہوگی۔ ہندی دوسری زبان اور انگریزی یا کوئی دوسری یورپی زبان تیسری زبان ہوگی جیسا کہ گجرال کمیٹی نے اپنے رپورٹ میں سفارش کی ہے کہ اس بات کی یقین دہانی ہونی چاہئے کہ جن کی مادری زبان اردو ہے وہ ہندی سیکھیں۔

اردو کی ترقی اور فروغ کے لئے ۱۹۷۲ء میں مرکزی حکومت نے "کمیٹی برائے فروغ اردو" کے نام سے ایک کمیٹی تشکیل دی۔ کمیٹی کا کام تھا کہ اردو کی بقا اور اس کی ترقی کے لئے سفارش پیش کرے کمیٹی کے صدر مرکزی حکومت کے وزیر جناب آئی کے گجرال بنائے گئے اس لئے یہ کمیٹی گجرال کمیٹی کے نام سے مشہور ہوئی۔ پروفیسر محمد مجیب' پروفیسر عبدالعلیم' ڈاکٹر سروپ سنگھ' پروفیسر احتشام حسین' پروفیسر گیان چند' جناب سجاد ظہیر' مالک رام صاحب' اور عابد علی خان صاحب اس کمیٹی کے رکن بنائے گئے جناب علی جواد زیدی اس کے ممبر اور جوائنٹ سیکرٹری تھے کمیٹی کی رپورٹ علی جواد زیدی صاحب اور خلیق انجم نے لکھی۔ کمیٹی نے بیشتر ریاستوں کا دورہ کر کے اردو والوں کی شکایت اور مشورے سنے اور ان کی شکایتوں کی بنیاد پر جامع رپورٹ لکھی۔ یہ رپورٹ ۸ مئی ۱۹۷۵ء میں حکومت کو پیش کر دی گئی۔ کمیٹی کی سفارشات پر مرکزی حکومت کے ذمہ داران میں اتنا شدید اختلاف ہوا کہ رپورٹ سرد خانے کی نذر ہو گئی۔ ۱۵ سال بعد یعنی ۱۹۹۰ء میں اس کمیٹی کی رپورٹ کو سرد خانے سے نکالا گیا۔ سردار جعفری صاحب کی زیر صدارت ایک اور کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی۔ کمیٹی کا کام تھا کہ وہ یہ دیکھے کہ گجرال کمیٹی کی سفارشات پر مرکزی اور ریاستی حکومتوں نے کہاں تک عمل کیا ہے اور جن سفارشوں پر عمل نہیں کیا گیا ان پر عمل آوری کی کیا صورت ہوگی۔ اس کمیٹی کے اراکین میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ' خلیق انجم' امرتا پریتم' کشمیری لال ذاکر صاحب' رام

لعل صاحب اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ شامل تھے۔ کمیٹی نے چند مہینوں میں رپورٹ پیش کر دی ہماری بد نصیبی کہ رپورٹ پیش کرنے کے کچھ ہی دن بعد سیاسی انقلاب آگیا۔ پہلی حکومت ختم ہو گئی دوسری حکومت کو ہوش میں آنے میں ذرا وقت لگا۔ اب سنا ہے کہ وہ رپورٹ مرکزی کابینہ میں پیش کر دی گئی ہے۔

بعض تاریخی وجوہ سے شمالی ہند کے اردو والے مایوسی اور ناامیدی کا شکار ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ آزادی کے بعد آزادی کی قیمت شمالی ہند کے اردو والوں کو مسلسل ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ چاہے وہ اپنے ہم وطن ہوں یا ہجرت کر کے کہیں اور چلے گئے ہوں۔ ہندوستان میں لوگ بے عملی کا شکار ہو کر خود کو مظلوم ثابت کرتے رہتے ہیں۔ حکومت کو برا کہتے ہیں لیکن اردو کی بقاء اور اس کی ترقی و فروغ کے لئے خود کوئی اقدام نہیں اٹھاتے۔ عصمت چغتائی مرحوم کہا کرتی تھیں کہ اب ہندوستان میں ایک بچہ بھی اردو پڑھنے والا نہیں رہا۔ اسی طرح راہی معصوم رضا بڑے فخر سے کہتے تھے کہ ہندوستان میں اب اردو نام کی کوئی زبان نہیں ہے۔ یہ در اصل اکثریتی طبقے کو خوش کرنے اور کچھ ذاتی مفادات حاصل کرنے کے بہت بھونڈے طریقے تھے۔

یہ بتایا جا چکا ہے کہ اردو اپنے بولنے والوں کی تعداد کے اعتبار سے دستور ہند کی ۱۵ قومی زبانوں میں چھٹے نمبر پر ہے۔ ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ کے مطابق ہندوستان میں اردو بولنے والوں کی تعداد تقریباً "۴ کروڑ تھی۔ ۱۹۹۱ء میں یہ تعداد سات کروڑ سے کم نہیں ہوگی (ابھی ۱۹۹۱ء کے اعداد و شمار شائع نہیں کئے گئے)

اس وقت ہندوستان میں ۲۵ یونیورسٹیوں میں اعلیٰ سطح یعنی پی۔ ایچ۔ ڈی تک اردو تعلیم کا انتظام ہے۔ بہار، گجرات، مغربی بنگال، مہاراشٹر، کرناٹک، اڑیسہ، اور آندھرا پردیش میں ایسے پرائمری اور سیکنڈری سکول ہزاروں کی تعداد میں ہیں جن کا ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ دلی سے ہزاروں میل دور انڈمان نکوبار میں بھی اردو ذریعہ تعلیم کے اسکول موجود ہیں۔ اگرچہ ان کی تعداد بہت کم ہے۔

حکومت ہند کا قائم کردہ ادارہ ترقی اردو بورڈ پچھلے ۱۵ سال میں اعلیٰ سطح کی تعلیم کے لئے ۴۰ سے زائد کتابیں شائع کر چکا ہے۔ بورڈ نے مختلف علوم کی اور بھی اصطلاحیں تعمیر کی ہیں۔

کئی علوم کی اردو اصطلاحیں شائع ہو چکی ہیں۔ اردو بورڈ نے کئی جلدوں میں انسائیکلوپیڈیا بھی تیار کی ہے جو طباعت کی منزلوں سے گزر رہی ہے۔ بورڈ کا ایک اہم کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس نے اردو میں پہلی بار ہندوستان میں کتابت کی تربیت کے مراکز قائم کئے۔ اس طرح اردو ٹائپ کے بھی مرکز قائم کئے گئے ہیں۔

ہندوستان کا ایک اہم ادارہ انجمن ترقی اردو (ہند) ہے جو ۱۹۰۳ء میں قائم ہوا تھا۔ اور اس وقت ہندوستان کے مختلف شہروں میں انجمن کی ساڑھے چھ سو شاخیں ہیں انجمن سے ہر سال بیس پچیس تحقیقی اور تنقیدی کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ انجمن کی بہت قیمتی لائبریری بھی ہے جس میں ہزاروں کی تعداد میں مخطوطات، نایات اور جدید مطبوعات ہیں اس کے علاوہ انجمن ایک سہ ماہی رسالہ "اردو ادب" ایک ہفت روزہ "ہماری زبان" شائع کرتی ہے۔

ساہتیہ اکاڈیمی ہندوستان کی بیشتر زبانوں کے بہترین تخلیقی ادب کے ترجمے شائع کرتی ہے۔ اردو میں بھی دوسری زبانوں کے بہت سے شہ پاروں کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اکیڈیمی ہندوستانی زبانوں کے مشہور و معروف ادیبوں اور شاعروں کے مونوگراف شائع کرتی ہے جن کا ہندوستان کی بیشتر زبانوں میں ترجمہ کیا جاتا ہے۔ اردو کے بہت سے ادیبوں اور شاعروں کے مونوگراف شائع ہو چکے ہیں۔

نیشنل بک ٹرسٹ ایک اور ادارہ ہے جو ہندوستان کی مختلف زبانوں کے تخلیقی ادب کا ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ شائع کراتا ہے۔ اس ادارے نے اردو میں خاصی تعداد میں ترجمے کئے ہیں۔

نیشنل کونسل آف ایجوکیشن اینڈ ریسرچ ٹریننگ (این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی) ہندوستان کی صرف تین زبانوں میں اسکولوں کے لئے نصابی کتابیں تیار کر کے شائع کرتی ہے۔ یہ تین زبانیں انگریزی ہندی اور اردو ہیں۔

ہندوستان کی ۱۱ ریاستوں میں اردو اکاڈمیاں قائم ہیں۔ ان اکاڈمیوں کے پانچ لاکھ سے لے کر ساٹھ لاکھ تک کے سالانہ بجٹ میں اکاڈیمی کتابیں اور رسالے شائع کرتی ہیں۔ ادیبوں اور شاعروں کو کتابیں شائع کرنے کے لئے رقم دیتی ہے۔ معذور اور بیمار ادیبوں کی مالی امداد کرتی ہیں۔ ادیبوں اور شاعروں کو انعامات دیتی ہیں۔ اسکولوں اور کالج کے طلبہ کو وظائف

دیتی ہیں۔ طلبہ کی حوصلہ افزائی کے لئے انہیں انعامات دیتی ہیں۔ تعلیم بالغاں کے لئے مرکز قائم کرتی ہیں۔ مشاعرے اور سیمینار منعقد کرتی ہیں ڈرامے اور فیسٹول منعقد کرتی ہیں۔ جب یہ اکاڈیمیاں اتنا کام کرتی ہیں تو ان میں اعتراضات کی گنجائش بھی نکل آتی ہے۔

دینی مکاتب اردو کی بقاء کے سب سے بڑے ضامن ہیں۔ ہندوستان کی کوئی ریاست ایسی نہیں جہاں ہزاروں کی تعداد میں دینی مکاتب نہ ہوں مغربی بنگال اور بہار کی ریاستی حکومتوں نے مکاتب کے انتظام کے لئے باقاعدہ بورڈ قائم کر دیئے ہیں۔ مکاتب کے اساتذہ کو وہی تنخواہیں دی جاتی ہیں جو دوسرے سرکاری اسکولوں کے اساتذہ کو ملتی ہیں۔ مکاتب کا نصاب تعلیم جدید ہے۔ جس کی تشکیل میں حکومت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ دینی تعلیم کا نصاب مکتب کے ذمہ داران خود مرتب کرتے ہیں ہمارے نقطہ نظر سے ان مکاتب کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ ان کا ذریعہ تعلیم اردو ہے چوں کہ ان مکاتب میں عربی اور فارسی زبانوں کی حیثیت بنیادی مضامین کی ہے۔ اس لئے اردو میں طلبہ کی استعداد اچھی ہوتی ہے۔

۱۹۴۷ء سے قبل برصغیر ہند میں اتنی کتابیں نہیں چھپتی تھیں جتنی اب شائع ہو رہی ہیں۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کا پانچ منزلہ اردو گھر، غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دلی اور غالب اکیڈیمی نئی دلی، حیدر آباد میں ایوان اردو، اردو ہال، اردو کالج، علی گڑھ میں جامعہ اردو کی شاندار عمارتیں آزادی کے بعد ہی وجود میں آئیں۔ تمام خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود ان اداروں کی سرگرمیاں قابل قدر ہیں۔

اس حقیقت سے انکار نہیں ہے کہ اتر پردیش میں اردو کے ذریعہ تعلیم پانے والے طلبہ کی تعداد بہت کم ہے لیکن پھر عرض کروں گا کہ اتر پردیش پورا ہندوستان نہیں بلکہ اس کا ایک حصہ ہے پچھلے چالیس برس سے اردو والے صرف احتجاج کر رہے ہیں کوئی عملی قدم نہیں اٹھاتے پہلی بار انجمن ترقی اردو (ہند) کے صدر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر جناب سید حامد نے مختلف تعلیمی اور ثقافتی اداروں کے ممبر نمائندوں پر مشتمل ایک "تعلیمی رابطہ کمیٹی" تشکیل دی ہے۔ اس کمیٹی نے تعلیمی کاروان کی شکل میں جس نے حال ہی میں اتر پردیش کے تقریباً" تیس ۳۰ شہروں کا دورہ کیا ہر شہر میں عالیشان جلسے منعقد ہوئے اور جلسوں میں تعلیمی کارواں کے اراکین نے جدید تعلیم اور اردو زبان کی تہذیبی، تاریخی، اور

مذہبی اہمیت پر مفصل روشنی ڈالی' راقم الحروف بھی اس کاروان میں شریک تھا۔ عام لوگوں نے ہماری باتوں کو بہت غور سے سنا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ انہیں سید حامد جیسے ایک رہنما کا انتظار تھا۔ حامد صاحب نے کئی اسکولوں' دینی مکتبوں اور پبلک اسکولوں کی عمارتوں کے سنگ بنیاد رکھے۔ یہ واقعہ میں نے یہ جتانے کے لئے سنایا ہے کہ اب ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں جو اردو والوں کے لئے عملی میدان میں سرگرداں ہیں۔

آخر میں عرض کروں گا کہ ہندوستان میں اردو کی بقاء کے سلسلے میں کسی تشویش کی ضرورت نہیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ہم میلوں کے حساب سے میدان ہارے تھے۔ اور اب خدا کا شکر ہے کہ انچوں کے حساب سے ہاری ہوئی زمین واپس لے رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کام میں وقت تو لگے گا۔

maablib.org

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

ہندوستان میں اقبالیات
آزادی کے بعد

(1)

یہ موضوع دو قسم کے رویوں کی نشان دہی کر رہا تھا یعنی اس موضوع کو سامنے رکھتے ہوئے ایک تو اس انداز سے لیکچر تیار کیا جا سکتا تھا کہ اقبالیات کے تعلق سے 1947ء سے آج تک ہندوستان میں علمی اور ادبی نوعیت کا کیا کیا کام ہوا ہے کون کون سی کتابیں چھپی ہیں، ان کتابوں میں کس کس موضوع سے بحث کی گئی ہے کون کون سے اہم مقالات مختلف جرائد میں شائع ہوئے ہیں، کن رسائل کے اقبال نمبر چھپے ہیں کن کن یونیورسٹیوں میں اقبال پر ایم فل کے ڈسرٹیشن اور پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کے تھیسس لکھے گئے ہیں اور ان کے موضوعات کیا ہیں، کہاں کہاں سیمینار ہوئے، ان میں کن کن قابل ذکر ماہرین اقبالیات نے حصہ لیا ہے، ان سیمیناروں میں کن کن خاص موضوعات پر بحث ہوئی ہے۔ کہاں کہاں اقبال اکیڈمیاں قائم ہوئی ہیں، کس کس یونیورسٹی میں اقبال چیئر قائم ہوئی ہے اور اس چیئر کی بدولت کیا کیا کام ہوا ہے وغیرہ وغیرہ۔

ظاہر ہے یہ لیکچر تو نہ ہوا، تحقیقی انداز کا ایک مقالہ ہوا جو پھیل کے پوری کتاب بن سکتا ہے اور جب تک کتاب نہ بنے موضوع کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکتا کیونکہ اگر

صرف اقبال کے متعلق کتابوں یا اہم مقالوں ہی کو لیا جائے جو آزادی کے بعد ہندوستان میں لکھے گئے تو فہرست کتنی ہی مختصر کیوں نہ ہو اس میں پروفیسر آل احمد سرور' علی سردار جعفری' ظ انصاری' اسلوب احمد انصاری مسعود حسین خان' پروفیسر مشیر الحق' ڈاکٹر عالم خوند میری' ڈاکٹر وحید اختر' ڈاکٹر خلیل الرحمان' ڈاکٹر حامدی کاشمیری' ڈاکٹر اکبر حیدری' فراق گورکھپوری' کلیم الدین احمد' رشید احمد صدیقی' شمیم حنفی' خواجہ احمد عباس' رشید نازکی' ڈاکٹر یوسف حسین خان' امتیاز علی عرشی' سید مظفر حسین برنی' پروفیسر عبدالغنی' سید صباح الدین عبدالرحمن سعادت علی خان' مفتی تبسم' ڈاکٹر گیان چند' ڈاکٹر گوپی چند نارنگ' شبیر احمد خان غوری' ڈاکٹر تارا چرن رستوگی' ڈاکٹر عشرت حسین انور' عبدالسلام خان' کبیر احمد جائسی' مجنوں گورکھپوری' مصلح الدین سعدی' سید خلیل اللہ حسینی' شمس تبریز خان' مفتی جلال الدین' ڈاکٹر عابد رضا بیدار' عبدالحق' خواجہ غلام السیدین' ڈاکٹر سید عابد حسین' پروفیسر غلام عمر خان' باقری مہدی' عبدالقوی دسنوی' شاہ معین الدین ندوی' شمس الرحمن فاروقی' کانٹ ویل سمتھ ڈاکٹر ملک راج آنند' اقبال سنگھ' ڈاکٹر محمد حسن' نیاز فتح پوری' عبدالماجد دریا آبادی وغیرہ کی کتابوں اور مقالوں پر بحث ضروری ہو جاتی ہے۔ اور یہ فہرست ابھی مکمل نہیں۔ نہ ہی یہاں محض نام گنوانا میرا مقصد ہے بلکہ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر ایک علمی اور ادبی انداز کا مقالہ تیار کیا جاتا تو اس کے ابعاد کہاں کہاں تک جا سکتے تھے۔

اور پھر جن مصنفین کا میں نے ذکر کیا ہے یا اگر ان جرائد کا ذکر کروں جن کے اقبال نمبر شائع ہوئے ہیں تو یہ سارا ادب مطبوعہ صورت میں آپ کے سامنے موجود ہے اور آپ کی نظر سے گزر چکا ہے ہندوستان بھر کے اقبال سیمیناروں میں آپ میں سے زیادہ تر حضرات شرکت کرتے رہے ہیں۔ ان کی روداد اخبارات میں پڑھتے رہے ہیں۔ مثلاً کشمیر یونیورسٹی کا سب سے پہلا اقبال سیمینار جو ٹیگور ہال میں منعقد ہوا تھا اور جس میں شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ مرحوم نے بھی شرکت فرمائی تھی۔ اس کی بہت عمدہ روداد ڈاکٹر حامدی کاشمیری نے لکھی تھی اور سری نگر کے ایک اہم روزنامہ "آئینہ" میں شائع ہوئی تھی۔ اسی طرح کا ایک بہت بڑا سیمینار یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی کی

مشترکہ کوششوں سے نئی دہلی میں منعقد ہوا تھا۔ اس کی روداد ڈاکٹر محمد حسن نے لکھی اور یہ کئی اخبارات میں شائع ہوئی تھی اب ان تمام چیزوں کو دوبارہ آپ کے سامنے پیش کرنا مجھے مناسب نظر نہ آیا۔

دوسری صورت یہ تھی کہ میں اس مقالے میں اس پس منظر کی نشان دہی کروں جو آزادی کے بعد اقبالیات کے تعلق سے ہمارے سامنے آیا اور اس ماحول کا ذکر کروں جس میں اقبال پر کام کرنے والوں نے اپنے کام کی ابتدا کی جہاں تک اقبال یا اقبالیات کا تعلق ہے کس طرح مثبت دھارے اور منفی دھارے ساتھ ساتھ چلتے رہے کس طرح سے ایک خالص علمی اور ادبی نوعیت کا صحیح کام کرنے کے لئے بھی کام کرنے والوں کو بسا اوقات مصلحت اندیشی سے کام لینا پڑا۔ گویا ظہیر کاشمیری کے اس شعر کو اپنا رہنما بنانا پڑا کہ۔

کبھی ہوا کا' کبھی اپنا رخ بدل کے چلو
یہ دور برق و شرر ہے سنبھل سنبھل کے چلو

کس طرح وہ لوگ جو مثبت انداز سے کام کرنا چاہتے تھے منفی طور پر کام کرنے والوں سے خوف کھاتے رہے کہ

کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ایسا نہ ہو جائے

تو میں نے سوچا کہ یہ ایک ایسی تصویر ہے جو ابھی تک شاید نئی نسل کے طلبہ کے سامنے نہ آئی ہو' کیوں نہ اسی تصویر کو اس کے تناظر سمیت پیش کیا جائے۔

اور پھر اس میں میرے لئے ایک آسانی بھی تھی اور وہ یہ کہ تحقیقی مقالہ لکھنے کے لئے اندرابی صاحب نے جو وقت دیا وہ بہت ہی کم تھا بالخصوص جب اس کم وقت میں دو تین سفر بھی میرے سامنے تھے' تحقیقی مقالے کے لئے کتابوں اور جرائد کے اقتباسات اور ان کے حوالے بھی ضروری تھے۔ اور ان کے لئے بہت زیادہ وقت درکار تھا۔ اور ایک ایسا مقالہ جو محض یادداشتوں پر مبنی ہو مجھے کتابوں اور ان کے حوالوں سے بے نیاز بھی کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے یہی دوسرا طریقہ اختیار کیا اور سوچا کہ گذشتہ چالیس برس میں اقبال اور اقبالیات کے تعلق سے جو کچھ میری آنکھوں نے ہندوستان میں دیکھا ہے اور کانوں نے سنا ہے وہی آپ کے سامنے پیش کر دوں۔ ہاں اپنے کاغذات میں مجھے چند

ایک حوالے پاکستانی اخبارات کے ایسے مل گئے جن کا ذکر کئے بغیر یہ داستان نامکمل رہتی چنانچہ ان اقتباسات کو میں نے مناسب جگہ پر اس تحریر میں شامل کر لیا ہے۔

میں یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ مقالہ زیادہ تر ریل اور ہوائی جہاز کے متعدد سفروں میں لکھا گیا۔ اسے صاف کرنے کی مہلت ابھی تک نہیں ملی۔ کچھ حصہ اس کا گھر میں اور یونیورسٹی میں بیٹھ کے بھی لکھا ہے۔ میں یوں بھی بد خط واقع ہوا ہوں اور ریل میں اگر کچھ لکھوں تو وہ بعض دفعہ میں پڑھ بھی نہیں سکتا۔ لیکن میں اسے پڑھنے کی کوشش کروں گا تاکہ جو کچھ لکھا ہے آپ کے سامنے پیش کروں۔

(2)

1947ء کے بعد ہندوستان میں اقبالیات کی داستان ایک سناٹے اور ہنگامے کی ملی جلی داستان ہے۔ اس میں ہماری قومی زندگی کے کئی پہلو سامنے آتے ہیں' ہم چاہیں تو انہیں مثبت اور منفی کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ اور چاہیں تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جمہوری نظام میں ہر شخص کو اجازت ہے' جو وہ چاہے کرے کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔

بہر طور ہندوستان کے آزاد ہوتے ہی ملک میں دو موضوعات کے متعلق بڑی حد تک خاموشی چھا گئی' ایک اردو' دوسرا اقبالیات لیکن آج کی بات چیت میں میرا موضوع چونکہ اقبالیات ہے اس لئے میں اپنے مقالے کو اسی موضوع تک محدود رکھوں گا۔

ایسا تو نہیں تھا کہ اقبال کے متعلق کوئی منفی کھلم کھلا پراپیگنڈا کسی سطح پر ہوا ہو یا کوئی ایسا حکم نامہ جاری ہوا ہو کہ اقبالیات کا موضوع شجر ممنوع کی حیثیت رکھتا ہے لیکن ریڈیو پر یا کسی جلسے میں اقبال کا نام سننے میں آنا بند ہو گیا۔ درسی کتب کی بات میں اس لئے نہیں کر رہا ہوں کہ اردو کو خود اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے اردو کی درسی کتب میں اقبال کا کلام شامل ہو یا نہ ہو اس کا سوال کہاں پیدا ہوتا تھا۔ مگر اس وقت چونکہ منفی اور مثبت دھارے ساتھ ساتھ بہہ رہے تھے اس لئے میں اس داستان کو چند حصوں میں تقسیم کر کے بیان کرنے کی کوشش کروں گا مثلاً:

1- اقبال پر تحریری کام 2- اقبال کی تاریخ ولادت کا مسئلہ 3- اقبال صدی تقاریب 4- جلسے اور سیمینار 5- یونیورسٹیوں میں اقبال چیئر کا قیام وغیرہ

(3)

ابھی ہندوستان کی آزادی میں کوئی آٹھ ماہ کی مدت باقی تھی کہ جنوری 1947ء میں ڈاکٹر سچدانند سنہا کی انگریزی کتاب Iqbal: The Poet and his Message منظر عام پر آئی۔ اس کتاب میں مصنف نے دو باتوں پر زور دیا تھا ایک تو یہ کہ اقبال کے کلام میں نغمگی کی کمی ہے اور دوسرا یہ کہ اقبال کا کلام صرف مسلمانوں کے لئے ہے اور اس میں عالمگیر اپیل نہیں ہے۔ کلیم الدین احمد نے جو اگرچہ اقبال کے مداحوں میں نہیں تھے بلکہ ان کے خیالات بھی قریب قریب اسی طرح کے تھے اس کتاب پر مخالفانہ تبصرہ کیا تھا لیکن ایک تو کتاب اور تبصرہ دونوں انگریزی میں تھے اور ساتھ ہی اہل ملک کی توجہ اس وقت اس سیاسی ہنگامہ آرائی کی جانب ہو چکی تھی جس کی ابتدا ہندوستان اور بالخصوص شمالی ہندوستان میں ہو گئی تھی اس لئے اس دور میں نہ اس کتاب کا صحیح معنوں میں نوٹس لیا گیا اور نہ اس پر مخالفانہ تنقید کی۔ ہاں 1947ء کے بہت بعد پروفیسر ایم ایم شریف نے اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر سچدانند سنہا کو ایک خط لکھا جو تنقید کا ایک عمدہ نمونہ ہے اور پروفیسر شریف کی کتاب Papers on Iqbal میں AN UNFINISHED LETTER کے عنوان سے شریک اشاعت ہے۔

میرا خیال ہے جنوری 1947ء سے اگست 1947ء تک ڈاکٹر سچدانند سنہا کی مذکورہ کتاب کے علاوہ اقبال کے متعلق کوئی قابل ذکر کتاب ہندوستان میں نہیں چھپی۔ ویسے ڈاکٹر سید عابد حسین کی کتاب "مضامین عابد" 1947ء میں شائع ہوئی۔ اس میں اقبال پر دو مضامین شامل ہیں ایک "اقبال کا تصور خودی" اور دوسری "عقل و عشق اقبال کی شاعری میں" ___ میری ناقص رائے میں اقبال کے تصور خودی پر جتنے بھی مضامین میری نظر سے گزرے ہیں ان میں بہترین مضمون ڈاکٹر سید عابد حسین کا ہے۔ میں خود ستمبر اکتوبر 1947ء تک لاہور میں رہا جہاں میرا تعلق پیشہ ورانہ طور پر صحافت سے تھا۔ وہاں بھی میں نے دیکھا کہ اگست 1947ء تک تحریک پاکستان کی حمایت میں لاہور کے مسلم اخبارات جو کچھ لکھتے تھے اس میں قائد اعظم کا ذکر زور و شور سے ہوتا تھا اور یہ ہونا بھی تھا کیونکہ قائد اعظم خود اس تحریک کے کارواں سالار تھے' لیکن علامہ اقبال کا ذکر اس تعلق سے

اخبارات میں کبھی نظر نہیں آیا۔ پاکستان میں گراف کی یہ تبدیلی کہ علامہ اقبال کا نام قائداعظم کے نام سے بھی زیادہ اہمیت کا حامل ہو گیا بعد کی بات ہے۔ اور آج یہ گراف پاکستان کے مختلف صوبوں میں مختلف انداز سے ہمارے سامنے آ رہا ہے۔

(4)

آزادی کے بعد، اگر میں غلطی نہیں کرتا تو علامہ اقبال پر سب سے پہلی اہم کتاب جو ہندوستان میں شائع ہوئی وہ مجنوں گورکھپوری کی کتاب تھی "اقبال" جس کے بارے میں مجنوں صاحب نے لکھا ہے کہ یہ میرے وہ نوٹس ہیں جو کالج میں لیکچروں کے لئے میں لکھ لیا کرتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اقبال پر یہ چھوٹی سی کتاب مجنوں صاحب کی تنقید نگاری کا ایک خوبصورت نمونہ ہے۔

اب اتفاق کی بات ہے کہ اقبال کی شاعرانہ عظمت کو تسلیم کرنے کے باوجود اس کتاب میں بھی ایک اہم نکتہ وہی ہے جس پر ڈاکٹر سچدانند سنہا نے اپنی کتاب میں زور دیا تھا۔ یعنی مجنوں صاحب کو بھی اقبال کی شاعری میں حجازی لے کھٹکتی تھی۔ دوسری بات نظریۂ شاہین کے بارے میں تھی۔ اور اس پر بھی مجنوں صاحب معترض تھے حالانکہ اقبال، آل احمد سرور کے نام اپنے ایک خط میں شاہین کی علامت سے متعلق خاصی وضاحت کر چکے تھے اور وہ خط چھپ بھی چکا تھا۔ حجازی لے اور نظریہ شاہین سے متعلق مجنوں صاحب کی رائے پاکستان جانے کے بعد تبدیل ہوئی اور جہاں تک میرا خیال ہے کہ کتاب میں مذکورہ رائے کی وجہ سے مجنوں صاحب کی یہ کتاب پاکستان میں شائع نہیں ہو سکی۔

(5)

ہندوستان میں آزادی سے پہلے بھی اقبال پر متوازن مضامین لکھنے والوں میں آل احمد سرور کا نام خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ اب مجھے یہ تو یاد نہیں کہ آزادی کے بعد ایک دو سال کے اندر اندر سرور صاحب نے کون کون سے مضامین لکھے لیکن ان کے مضامین کو اہل نظر نے ہمیشہ قدر اول کے مضامین سمجھا ہے اور آج بھی علامہ اقبال کے بارے میں ان کی تحریریں مینار نور کی حیثیت رکھتی ہیں۔

لیکن یہ دور یعنی آزادی کے فوراً بعد کا دور اقبالیات کے لئے بڑا عجیب و غریب دور تھا۔ بات اگرچہ آزادی سے ذرا پہلے کی ہے لیکن اس کا تعلق یقیناً اس ماحول کے ساتھ ہے جو آزادی کے فوراً بعد ہمارے سامنے آیا۔ سردار جعفری نے علامہ اقبال کے متعلق ایک کتاب لکھی اور اس میں ان پر فاشسٹ ہونے کا الزام لگایا۔ یہ کتاب کسی حد تک Anti - Iqbal رجحان لئے ہوئے تھی۔ اس کے خلاف خاصا طوفان برپا ہوا اور انجام کار اس کتاب کی تمام جلدیں تلف کر دی گئیں۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی غالباً" بے محل نہ ہو گا کہ پاکستان بننے کے بعد احمد ندیم قاسمی نے بھی جو وہاں ادب کی ترقی پسند تحریک کے روح رواں تھے' اقبال کے متعلق دو ایک مضامین اسی انداز کے لکھے جن کا مخالفانہ ذکر فیض احمد فیض نے اکثر کیا۔ فیض صاحب اگرچہ ترقی پسندی کے معاملے میں قاسمی صاحب سے دو قدم آگے تھے لیکن اقبال کے معاملے میں انہوں نے احمد ندیم قاسمی اور سردار جعفری دونوں سے اختلاف رائے کیا۔ آج ان دونوں حضرات کے خیالات بدل چکے ہیں اور اقبال کے متعلق جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ اقبال پرستی کی حدوں کو چھوئے یا نہ چھوئے (اور اقبال پر لکھنے کے یہ معنی بھی نہیں ہیں کہ ہم اقبال پرستی کے دائرے میں مقید ہو جائیں) کم از کم کوئی ایسی بات ان کے قلم سے نہیں نکل رہی ہے جسے Anti-Iqbal کہا جا سکے۔ بلکہ اقبال پر ان کا معروضی رویہ علمی ادبی اور فکری اعتبار سے اقبالیات میں ایک گراں قدر اضافہ ہے اور ہم لوگ اکثر اپنی تحریروں اور تقریروں میں ان کا ذکر کرتے ہیں کہیں نہ کہیں اختلاف رائے کے باوجود۔

یہاں میں اس امر کی بھی وضاحت کر دوں کہ ان دو معتبر اہل قلم کا ذکر میں نے اس غرض سے نہیں کیا کہ اقبال کے متعلق ان کے ابتدائی خیالات اور بعد میں ان کے خیالات پر ان کی نظر ثانی کی بات کروں' بلکہ میں بتانا یہ چاہتا ہوں کہ شروع میں جو کچھ جعفری صاحب اور قاسمی صاحب نے لکھا وہ اس ماحول کے زیر اثر لکھا جو دونوں ملکوں میں ادب کی ترقی پسند تحریک کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا۔ اس وقت تحریک کے نظریات میں ایک شدت تھی اور یہ اصول کارفرما تھے کہ جو ہمارے ساتھ نہیں ہے وہ ہمارا مخالف ہے۔ تحریک کے اہم شعراء نثر نگار اور نقاد ن م راشد' میرا جی اور سعادت حسن منٹو کو

مخالف کیمپ کے اہل قلم میں شریک کرتے تھے اور اس زمانے کے جرائد میں جو تحریک کے ساتھ تھے ان اہل قلم کی تخلیقات شائع نہیں ہوتی تھیں۔

"علامہ اقبال کے متعلق سردار جعفری کے خیالات میں مذکورہ تبدیلی جلد واقع ہوئی اور 1951ء میں ترقی پسند ادب کی پہلی جلد کا پہلا ایڈیشن جب شائع ہوا تو سردار جعفری کے خیالات اقبال کے متعلق بدل چکے تھے۔ دراصل اس وقت سردار جعفری کی دوربین نگاہوں نے بہت پہلے یہ حقیقت دیکھ لی تھی کہ تحریک کا اس طرح تنگ نظری کا شکار ہو جانا خود تحریک کے لئے مضر ہے چنانچہ جب انہوں نے ترقی پسند تحریک کو Broad - Based بنانے کی کوشش کی اور چاہا کہ اس کے اصولوں اور طرز عمل میں سے عصبیت کے عنصر کو خارج کر دیا جائے تو اقبال کے بارے میں ان کے خیالات میں تبدیلی آئی۔ چنانچہ انہوں نے اپنی کتاب "ترقی پسند ادب میں" جہاں کئی موقعوں پر اقبال سے اختلاف کیا۔ مثلاً عورت کے موضوع پر یا اقبال کے اس خیال پر کہ "از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید" یا ان کی درویشی، قلندری، شاہینی اور انفرادیت پرستی پر وہاں اس طرح کی بات بھی لکھی کہ جیسے ہم پتھر اور مٹی کی گود سے سونا نکال لیتے ہیں اور باقی ماندہ مٹی کو پھینک دیتے ہیں اسی طرح اقبال کی رجعت پسندی سے بھی ہم ترقی پسندی کے جواہرات چن سکتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے اقبال کے بعض نظریات مثلاً فن برائے فن کے نظریے کی مخالفت سامراج اور سرمایہ داری کی مخالفت اور انسان کا عظیم الشان تصور جو اقبال نے ہمیں دیا ہے ان تمام پر بڑی عالمانہ بحث کی اور ان کے خیالات جب ترقی پسند تحریک پر اثر انداز ہوئے تو بحیثیت مجموعی تحریک میں سے اقبال دشمنی کے عناصر ختم ہونا شروع ہو گئے۔ اگرچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ سید سجاد ظہیر آخر تک اقبال کے فکر کو بڑی حد تک غیر ترقی پسندانہ کہتے رہے۔

لیکن سردار جعفری کی اس کتاب کا اثر صرف علمی اور ادبی حلقوں تک محدود رہا۔ جہاں تک عوام کا تعلق ہے وہاں تک اس کتاب کے اثرات پہنچنے میں بڑی دیر لگی۔ یہ میں 1951ء 1952ء کی بات کر رہا ہوں۔

(6)

اب میں ایک دو برس آگے جانا چاہتا ہوں۔ زمانہ یہ وہ تھا کہ ریڈیو پر علامہ اقبال کا کلام سننے میں نہیں آتا تھا اور نہ ہی یہ درسی کتب میں نظر آتا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے کہ اس طرح کی کوئی پابندی عائد کی گئی تھی۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ ماحول ہی ایسا بن گیا تھا۔ ملک کی تقسیم اکثریت کی ایک بڑی تعداد کو پسند نہیں آئی تھی۔ مہاتما گاندھی کو تو 1949ء ہی میں نتھو رام گوڈسے نے پستول کی گولی کا نشانہ بنا دیا تھا۔ اگرچہ تقسیم سے بہت پہلے پنڈت مدن موہن مالویہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے ایک جلسے میں فرمائش کر کے طلبہ سے "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کا ترانہ سن چکے تھے لیکن اب پنڈت مدن موہن مالویہ کے جاننے اور ماننے والے بڑی حد تک اس ترانے سے بے نیاز ہو چکے تھے۔ ہندوؤں میں عام خیال یہ تھا کہ ملک کی تقسیم کی ذمہ داری علامہ اقبال کے اس خطبہ صدارت پر ہے جو انہوں نے 1930ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الہ آباد میں پڑھا' جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں علامہ اقبال کے خلاف کوئی منظم تحریک تو نہیں چلی لیکن ایک خاموش طریقے سے اقبال کو نظرانداز کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔

یہاں 55 - 1954ء کا ایک ذاتی واقعہ بھی سن لیجئے' جناب آصف علی اصغر فیضی جموں و کشمیر یونیورسٹی سرینگر کے وائس چانسلر تھے۔ انہوں نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں جموں و کشمیر یونیورسٹی سری نگر میں تین لیکچر غالب کے فکر و فن کے متعلق دوں اور پھر یہی لیکچر یونیورسٹی کے جموں ڈویژن میں بھی دیئے جائیں۔ جموں میں اس وقت الگ یونیورسٹی نہیں تھی۔ بلکہ جموں و کشمیر یونیورسٹی ہی کا ایک ونگ جموں میں کھول دیا گیا تھا۔

میں نے ان سے کہا کہ غالب پر بھی کبھی میں لیکچر دے دوں گا لیکن اس وقت تو آپ مجھ سے اقبال پر لیکچر دلوائیے۔ فیضی صاحب جیسے سناٹے میں آ گئے۔ فرمانے لگے 47ء سے لے کر آج تک کسی نے جموں و کشمیر میں اقبال کا نام نہیں لیا۔ آپ کیوں اس موضوع پر لیکچر دینا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا ایسا نہیں ہے۔ اقبال کا ذکر نجی محفلوں میں ہوتا ہے۔ اقبال کی شاعری پر بات چیت بھی ہوتی ہے۔ یہاں سے ایک اخبار نکلتا ہے ———

"آفتاب" اس کی پیشانی پر علامہ اقبال ہی کا ایک شعر لکھا ہوتا ہے۔

جس خاک کے ضمیر میں ہو آتش چنار　　ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاک ارجمند

اس کے علاوہ کشمیر کے قریبا ہر پڑھے لکھے گھر میں جہاں مجھے جانے کا اتفاق ہوا ہے علامہ اقبال کے کلام کے مجموعے موجود ہیں۔ اقبال کشمیر ہی کے فرزند ہیں۔ اس یونیورسٹی میں اقبال پر لیکچروں کا انتظام بہت پہلے ہونا چاہئے تھا۔ فیضی صاحب نے کہا کہ آپ سوچ لیجئے میں اس پر غور کروں گا اور پرسوں آپ کو قطعی طور پر بتاؤں گا۔ انہوں نے پرسوں کے لئے مجھے کھانے کی دعوت دی اور جب میں ان کے یہاں ڈنر پر پہنچا تو غالباً" وہ اس مسئلے پر پوری طرح غور کر چکے تھے۔ شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کا دور وزارت عظمیٰ تو اس وقت ختم ہو چکا تھا' بخشی غلام محمد کا زمانہ تھا۔ ممکن ہے انہوں نے بخشی صاحب سے بھی اس ضمن میں مشورہ کیا ہو۔ بہر طور مجھ سے انہوں نے جب بات چیت شروع کی تو وہ کچھ اس طرح تھی کہ فرض کیجئے آپ یہاں ہماری یونیورسٹی میں اقبال پر لیکچر دیتے ہیں تو آپ بات چیت کس طرح شروع کریں گے' میں نے کہا فیضی صاحب یہ تو آپ نے بڑا مشکل سوال کیا ہے کہ کیونکہ میں نے ابھی تک لیکچر لکھنے کے بارے میں ان نکات پر غور نہیں کیا ہے۔ لیکن اتنا میں جانتا ہوں کہ یہ لیکچر میں اس لئے نہیں لکھوں گا کہ یہ مجھے صرف جموں و کشمیر میں پڑھنا ہیں۔ ہو سکتا ہے میں یہ لیکچر ملک کے دوسرے حصوں میں بھی دوں اور چونکہ 1947ء کے بعد کسی بھی یونیورسٹی میں علامہ اقبال کے متعلق یہ پہلے تو سیعی لیکچر ہوں گے اس لئے میں کوشش یہی کروں گا کہ کسی قسم کی غلط بیانی کئے بغیر جس حد تک ممکن ہو سامعین کو اپنے ساتھ لے کر چلوں' کسی بھی بڑے فن کار کے فکر و فن کے ذکر میں اختلاف رائے کی گنجائش تو ہوتی ہی ہے لیکن میری کوشش یہی ہو گی کہ اختلاف رائے ایسی مخالفت کی صورت اختیار نہ کرے کہ ہمارا مقصد ہی فوت ہو جائے۔

اس کے بعد انہوں نے رسمی یعنی Formal دعوت نامہ مجھے دے دیا اور دہلی واپس جا کر میں نے اپنے مقالات کی ابتدا کر دی۔ محترم فیضی صاحب کی فرمائش تین لیکچروں کے لئے تھی اور میں نے ان لیکچروں کے یہ عنوانات تجویز کئے۔

1- کلام اقبال کا ہندوستانی پس منظر 2- کلام اقبال کا صوفیانہ لب و لہجہ' اور

3- اقبال اور اس کا عہد

چونکہ میرا ارادہ لیکچروں کو کشمیر سے باہر بھی مختلف جلسوں میں پڑھنے کا تھا' اس لئے میں اپنی بات چیت کی ترتیب بھی رکھنا چاہتا تھا۔

لیکن جب یہ تینوں لیکچر مکمل ہو چکے اور میں نے کشمیر آنے کے لئے رخصت کی درخواست دی تو یہ درخواست ہمارے پرنسپل انفارمیشن آفیسر نے اس وقت کے وزیر ڈاکٹر بی وی کیسکر کو بھیج دی جہاں سے یہ درخواست نامنظور ہو کر واپس آ گئی۔ میں نے چاہا کہ وزیر موصوف کے ساتھ ملاقات کر کے اس موضوع پر بات کر لوں لیکن جواب آیا کہ اگر اقبال کے توسیعی لیکچروں کے متعلق بات کرنا ہے تو ملاقات ممکن نہیں۔ میں نے اپنے پرنسپل انفارمیشن آفیسر کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ یہ ایک خالص ادبی معاملہ ہے۔ یونیورسٹی میں لیکچر دینا ہیں علامہ اقبال کے فکر و فن کے متعلق' لیکن جب متعلقہ وزیر میری چھٹی نامنظور کر چکے تھے تو پرنسپل انفارمیشن آفیسر کیا کر سکتے تھے جب کہ وہ خود بھی یہ نہیں چاہتے تھے کہ میں اس موضوع پر لیکچر دوں ورنہ وہ چار دن کی چھٹی کی یہ درخواست وزیر موصوف کو بھیجتے ہی کیوں۔

بہر طور یہ معاملہ تو جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ کچھ مدت بعد یہ لیکچر کتابی صورت میں اقبال اور اس کا عہد" کے نام سے ادارہ انیس اردو الہ آباد نے شائع کئے لیکن یہ بات جو میں نے شروع کی ہے اور جسے طول دیتے ہوئے مجھے جھینپ بھی محسوس ہو رہی ہے اور الجھن بھی ہو رہی ہے کیونکہ اس میں میری ذات بھی شامل ہو گئی ہے ابھی ختم نہیں ہوئی۔ ہندوستان میں اس کتاب کے تین چار ایڈیشن چھپے اور سیاسی اعتبار سے اس کتاب پر کہیں کوئی اعتراض دیکھنے میں نہ آیا لیکن چند برس بعد جب اس کا پہلا پاکستانی ایڈیشن شائع ہوا مکتبہ تو سین لاہور کی طرف سے تو اس پر جو تبصرے چھپے ان میں ایک نمایاں نقطہ یہ بھی تھا کہ ہندوستان کی آزادی کے لئے قربانی دینے والے جن قومی زعماء کا ذکر اس کتاب میں کیا گیا ہے مثلاً مہاتما گاندھی' ابوالکلام آزاد' جواہر لال نہرو' محمد علی جوہر' راجندر پرشاد' حسرت موہانی وغیرہ وہاں قائداعظم محمد علی جناح کا نام بھی ہونا چاہئے تھا۔ جہاں تک پہلے لیکچر "کلام اقبال کا ہندوستانی پس منظر" کا تعلق ہے یہاں ہندوستان میں تو

ایک نقاد نے یہ اعتراض کیا کہ اس میں ہندوستان کے تہذیب و تمدن اور قدیم فلسفے کے ساتھ اقبال کے دلی لگاؤ کو بڑھا چڑھا کے بیان کیا گیا ہے لیکن پاکستان میں اس وقت تک جب کہ یہ کتاب وہاں کے طلبہ کے لئے کئی برس تک امدادی کتابوں میں شامل رہی ہے اور اس کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں یہ اعتراض کسی تبصرے میں نظر نہیں آیا۔

حضرات میں ایک بار پھر یہاں اپنے اور اپنی کتاب کے نکتہ کے لئے معذرت خواہ ہوں لیکن میرا مقصد ہندوستان کے اس ماحول اور ان حالات کی ایک جھلک دکھانا تھا جن حالات میں اقبالیات کے سلسلے میں بعض اہل قلم حضرات نے کام شروع کیا۔

(7)

یہ جو میں نے چند سطور قبل عرض کیا ہے کہ 1947ء میں آزادی کے بعد اقبالیات کے تعلق سے ایک طرح کا سناٹا چھا گیا تھا تو اس کی ذرا سی وضاحت کر دوں کہ یہ سناٹا علمی اور ادبی ماحول میں نہیں، سماجی اور مجلسی ماحول میں تھا، لیکن چونکہ ایک مقام پر سیاسی علمی اور ادبی ماحول، سماجی ماحول کے ساتھ مل جاتے ہیں اس لئے اس سناٹے کے اثرات بحیثیت مجموعی ملک بھر میں نمایاں ہوتے رہے۔ آپ علامہ اقبال پر ایک مضمون لکھتے ہیں یہ کسی ماہنامے یا جریدے میں شائع ہوتا ہے اور اہل قلم حضرات اس پر بات چیت کرتے ہیں تو یہ ایک طرح سے سب کچھ ایک علمی اور ادبی حدود کے اندر ہوتا ہے لیکن آپ جب وہ مضمون یا مقالہ کسی بڑے جلسے میں پڑھتے ہیں تو وہ ہمارے سماجی اور مجلسی ماحول پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس وقت اس بات کا بھی امکان ہے کہ اس کا رد عمل علمی ماحول کے رد عمل سے مختلف ہو۔

میں یہ اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ چند سطور قبل جو سناٹے کا ذکر میں نے کیا ہے اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ آزادی کے دو چار سال بعد تک ہمارے ملک کے اہل قلم نے اقبال پر کچھ لکھا ہی نہیں۔ ایسا نہیں تھا۔ اب اس وقت جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں یہ مقالہ لکھتے وقت میرے سامنے حوالے کی کوئی کتاب تو نہیں ہے لیکن جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ مجلہ عثمانیہ حیدر آباد دکن، نگار لکھنؤ، معارف اعظم گڑھ، شاعر آگرہ، اردو دہلی، سب رس حیدر آباد، آج کل دہلی، کتاب

نما دہلی' برہان دہلی' فروغ اردو لکھنؤ شاہراہ دہلی' علی گڑھ میگزین علی گڑھ' دارالعلوم دیوبند کا میگزین (اس کا نام مجھے یاد نہیں رہا' شاید اس کا نام تجلی ہے) کاروان ادب بمبئی زمانہ کانپور وغیرہ کے صفحات اس دور میں بھی اقبال اور اقبالیات کی روشنی سے جگمگاتے رہے۔ جب کہ بحیثیت مجموعی اقبال کے بارے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اور ان جرائد میں جن کا ذکر میں نے کیا ہے لکھنے والے متعدد اہل قلم اور ادیب تھے۔ اب میں قطعیت کے ساتھ تو نہیں بتا سکوں گا کہ کس ادیب کا کون سا مضمون کس جریدے میں کس ماہ شائع ہوا لیکن اتنا یاد ہے کہ اردو دہلی میں 1947ء کے آخر میں عزیز احمد کا مضمون "اقبال اور ارتقائے تخلیق" شائع ہوا لیکن اتنا یاد ہے کہ اردو دہلی میں 1947ء کے آخر میں عزیز احمد کا مضمون "اقبال اور ارتقائے تخلیق شائع ہوا تھا۔ دوسرے جرائد میں لکھنے والے تھے۔ غلام ربانی عزیز' فرمان فتح پوری' آل احمد سرور' اختر علی تلہری' عبدالسلام ندوی' راجندر ناتھ شیدا' نیاز فتح پوری' نورالحسن ہاشمی' شوکت سبزواری' سید احتشام حسین' سردار جعفری' فراق گورکھپوری' باقی مہدی اور متعدد دوسرے حضرات' پروفیسر مسعود حسین خان کا مضمون مجھے یاد ہے ہم لوگوں نے "آج کل" میں شائع کیا تھا اس کا عنوان تھا ـــــ "ہے عجب مجموعۂ اضداد اے اقبال تو" پروفیسر عشرت حسین انور نے تو اقبال کے متعلق مضامین کی ایک فوج میدان میں اتار دی تھی۔ ان کے زیادہ تر مضامین "معارف" اعظم گڑھ میں شائع ہوئے تھے۔ اور ان کے عنوانات یہ تھے۔ اقبال اور برگساں' اقبال اور جیمز وارڈ' اقبال اور نٹشے' اقبال اور ولیم جیمز وغیرہ وغیرہ

اور یہ جو راقم التحریر نے شروع میں دو ایک کتابوں کا ذکر کیا ہے یہ صرف ایک خاص رجحان کی نشان دہی کے لئے تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہو گا کہ اس دور میں ان کے علاوہ اقبال پر کتابیں شائع ہی نہیں ہوئیں۔ عبدالسلام ندوی کی "اقبال کامل" میں سمجھتا ہوں 1948ء ہی میں شائع ہوئی۔ ظہیر الدین جامعی کی کتاب "اقبال کی کہانی کچھ ان کی اور کچھ میری زبانی" اس کے دو ایک برس بعد چھپی اسی زمانے میں یکتا امروہوی کی ایک کتاب آئی تھی "اقبال خواتین کی نظر میں" دو چار برس بعد ظفر احمد صدیقی کی کتاب "حکمت کلیمی" چھپی تھی۔ یہاں یہ ذکر بھی بے محل نہ ہو گا کہ وکٹر کرنین کی کتاب

"Poems From Iqbal" 1947ء میں اور اقبال سنگھ کی کتاب "The Ardent Pilgrim" 1951ء میں شائع ہوئیں۔ غالباً" یہ بات کم لوگوں کے حافظے میں ہو گی کہ عطیہ فیضی کی انگریزی کتاب Iqbal اول اول 1947ء کے آخر میں ہندوستان ہی میں چھپی تھی اور اس کے ناشر تھے

Academy of Islamic Publications Bombay

اسی دور میں ہندوستان کے ایک شہر نے بڑے حوصلے اور عزم کے ساتھ اقبالیات کی شمع روشن کی اور اس شمع کی روشنی روز بروز بڑھتی ہی گئی۔ یہ شہر حیدر آباد ہے اور جناب خلیل اللہ حسینی اور ان کے رفقائے کار کی بدولت جو اقبال اکیڈیمی قائم ہوئی اس نے اقبالیات کے فروغ کے لئے بڑا کام کیا۔ یہ ادارہ روز اول ہی سے ایک فعال ادارہ رہا ہے اور اس کے زیر اہتمام متعدد سیمینار جن میں آل انڈیا سیمینار اور انٹرنیشنل سیمینار بھی شامل ہیں منعقد ہو چکے ہیں۔

اس ادارے کے علاوہ حیدر آباد کے اور اداروں نے بھی اقبال پر سیمینار منعقد کئے' حیدر آباد میں علامہ اقبال کی مقبولیت کا سبب ایک تو ان کا فکروفن ہے جو علمی اور ادبی دنیا میں ہر جگہ مقبول ہے دوسرا حیدر آباد شہر ہے جہاں انہوں نے

The Reconstruction of Religious Thought in Islam

کے چھ لیکچروں میں سے ایک لیکچر دیا تھا۔ اس کے علاوہ دکن کا ذکر سلطان فتح علی خاں کے ذکر کے ساتھ علامہ اقبال کے کلام میں خاص طور سے آیا ہے جس کی بدولت آندھرا پردیش اور میسور کے لوگ علامہ اقبال کے ساتھ ایک خاص تعلق خاطر محسوس کرتے ہیں اور پھر مہاراجہ سرکشن پرشاد' سر اکبر حیدری اور سروجنی نائیڈو کے ساتھ جو ان کے مراسم رہے وہ دکن کی علمی اور ادبی تاریخ کا ایک پائیدار حصہ بن چکے ہیں۔

ایسی ہی بات مجھے کشمیر کے بارے میں بھی کہنا ہے کہ یہاں بھی علامہ اقبال کی مقبولیت کا سبب صرف ان کا فکروفن ہی نہیں ہے بلکہ اقبال فرزند کشمیر ہیں اور ملک کے ہر حصے سے زیادہ سرزمین کشمیر کو اقبال پر فخر اور ناز ہے۔ اقبال کے کلام' خطوط میں' خطبات میں کشمیر کا ذکر جس طرح سے آیا ہے اور انکی اپنی زندگی میں کشمیر اور مسائل

کشمیر کی جو اہمیت رہی ہے اس پر اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ اس موضوع پر میرے لئے یہاں کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہیں ہے۔

حضرات، راقم التحریر نے جموں و کشمیر یونیورسٹی کے لئے جن لیکچروں کا ذکر کیا ہے یہ لیکچر راقم التحریر نے ملک کی بعض اور علمی اور ادبی انجمنوں کے زیر اہتمام بھی دیئے۔ یہ لیکچر دینے کا اتفاق مجھے دہلی میں بھی ہوا۔ انجمن ترقی اردو اور انجمن تعمیر اردو دہلی کے جلسوں میں اس کے چند روز بعد میں حسب معمول بنے بھائی سید سجاد ظہیر سے ملنے گیا تو انہں نے چھوٹتے ہی کہا کہ سنا ہے ان دنوں تم مسلم فرقہ پرستی کو فروغ دینے کی کوشش کر رہے ہو۔ میں شروع میں ان کی بات نہ سمجھا انھوں نے اپنی بات کی وضاحت کی اور بتایا کہ اقبال مسلم فرقہ پرستی کا نمائندہ ہے۔ اقبال کے متعلق ہندوستان میں کہیں کوئی لیکچر ویکچر نہیں ہو رہے ہیں تمہیں یہ کیا سوجھی ہے۔ میں نے اپنا نقطہ نگاہ واضح کرنے کی کوشش کی لیکن میں انھیں قائل نہ کر سکا۔ میرے نزدیک ہندوستان میں اقبالیات کی تصویر کا یہ ایک نیا پہلو تھا کیونکہ اس وقت تک ترقی پسند تحریک کے دو بڑے علمبردار ایک ہندوستان میں دوسرا پاکستان میں اقبال کے متعلق نئے فکری نتائج پر پہنچ چکے تھے لیکن تحریک کے امیر کارواں آخر تک اقبال کو مسلم فرقہ پرستی کا نمائندہ سمجھتے رہے۔

(8)

وقت گزرتا گیا اور علامہ اقبال کے متعلق مختلف جرائد میں چھپنے والے مقالات کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ جن مصنفین کا نام میں نے اس باب کے شروع میں لیا ہے۔ ان کے مقالات اور ان میں سے بعض کی کتابیں منظر عام پر آئیں۔ دراصل جوں جوں سیاسی فضا میں ٹھہراؤ آتا چلا گیا اور تقسیم ملک سے پیدا شدہ گرد بیٹھتی چلی گئی اردو اور اقبال دونوں کے متعلق ملک کا بحیثیت مجموعی رویہ بدلتا چلا گیا۔ دراصل اقبال اتنا بڑا شاعر ہے کہ ملک کی علمی اور ادبی فضا سے اس کی عدم موجودگی کو ملک نے خود محسوس کیا بعض اہم انگریزی ہندی اور دوسری زبانوں کے اخبارات اور جرائد نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ وہ اقبال کے متعلق علمی اور ادبی مقالات شائع کریں۔ ہندوستان ٹائمز، ٹائمز آف انڈیا، نوبھارت ٹائمز، اسٹیٹسمین اور انڈین ایکسپریس ۔۔ ان سب اخبارات نے اپنے

ادبی ضمیموں میں اس کمی کو محسوس کیا اور اقبال پر مضامین کبھی کبھار ان میں چھپنے لگے۔

ہندوستان ایک بڑا ملک ہے۔ بڑے سے میری مراد محض یہ نہیں کہ رقبے کے اعتبار سے بڑا ملک ہے بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تہذیبی اور تمدنی اعتبار سے بھی ایک بڑا ملک ہے یہاں فرقہ وارانہ فسادات کے باوجود ان عناصر کی بھی کمی نہیں جنہیں صحت مند عناصر کہا جا سکتا ہے۔ اس بڑے ملک نے علامہ اقبال کے متعلق خاموشی اختیار کر کے ایک بہت بڑی غلطی کی تھی اور ملک کو جب اس غلطی کا احساس ہوا تو اس نے اس غلطی یا کوتاہی کی تلافی بھی ایک بڑے ملک کے شایان شان طریقے سے کی۔ یعنی جب اقبال کی یاد منانے کا خیال اس ملک کو آیا تو گویا اس موضوع پر جلسوں اور سیمناروں کا ایک سیلاب آگیا۔

غالباً 1960ء یا 1961ء میں علامہ اقبال کی غزلیں آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہونا شروع ہوئیں یہ گویا ایک طرح سے Green Signal تھا کہ اقبال کا ذکر اس ملک میں شجر ممنوعہ کی حیثیت نہیں رکھتا لیکن اس مثبت انداز فکر کے ساتھ ہی ساتھ مخالف سمت میں بھی رو چلتی رہی۔ ہندی کی مشہور شاعرہ مہادیوی ورمانے' جن کا انتقال ابھی چند روز قبل ہی ہوا ہے آل انڈیا ریڈیو کے اس طرز عمل کو Muslim Appeasement کے رجحان سے منسوب کیا۔ ساتھ ہی انہوں نے اردو کے خلاف بھی بیان دیا۔ ان کے دوسرے ہمنوا ہندی کے ایک اور اہل قلم اور شاعر بھگوتی چرن جی تھے جنہوں نے اقبال کے متعلق کچھ نہ کہا لیکن اردو کے بارے میں کہا کہ ہندوستان میں اردو کے فروغ کے لئے جو کوششیں ہو رہی ہیں یہ ہندوستان کے اندر ایک Linguistic Pakistan بنانے کی کوششیں ہیں۔ انگریزی اخبارات میں یہی لفظ Linguistic Pakistan شائع ہوا تھا اور اس قسم کی آوازیں اکا دکا ہی سہی' آج بھی سننے میں آ جاتی ہیں۔ اور اگر آپ غور سے دیکھیں تو انگریزی اخبارات میں علامہ اقبال کی شاعری یا فلسفے کے متعلق کوئی مضمون شائع ہوتا ہے تو اس کے دو چار روز بعد اسی اخبار میں اس مضمون کے بارے میں دو ایک مکتوب ایسے ضرور چھپ جاتے ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مکتوب نگار حضرات کو اس موضوع پر مضمون کا چھپنا پسند نہیں آیا اور ان مکاتیب میں اس بات کا ضرور ذکر ہوتا

ہے کہ اقبال ہی نے پاکستان کا تصور پیش کیا تھا اور ہندوستان کو حصوں میں تقسیم کرنے کی ذمہ داری ان ہی کی ہے۔ انگریزی کے مشہور صحافی کے این سود کا مقالہ Iqbal Who Fathered Pakistan ہندوستان ٹائمز میں شائع ہوا تھا اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

لیکن ایک جمہوری ملک میں اس طرح کا اختلافِ رائے کوئی حیرت یا عجوبے کی بات نہیں اور نہ ہی اس اختلاف رائے کو آج کوئی بڑی بات سمجھا جاتا ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ اقبال اور ان کے فکر و فن کو نظرانداز کرنے کا جو رجحان 1947ء میں شروع ہوا تھا وہ آج نظر نہیں آرہا ہے۔

(9)

آج جب ہم اس سارے ملک میں اس بدلے ہوئے رجحان پر نظر ڈالتے ہیں تو کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ملک کے علماء فضلاء' دانشور اور تخلیقی فنکار شعوری' یا غیر شعوری طور پر کسی ایسے لمحے کے انتظار میں تھے جو تاریخ ادب کے اس بدلتے ہوئے دھارے کو تیز تر کردے اور اقبال ہندوستان کے ایک بڑے شاعر کے طور پر پھر ہندوستان کو واپس مل جائیں۔ یہ لمحہ 73 - 1972ء میں ملک کے سامنے آگیا جب علامہ اقبال کی تاریخ ولادت ایک متنازعہ فیہ مسئلے کی صورت میں رونما ہوئی۔

1972ء کی ابتدا کا زمانہ تھا کہ برصغیر ہندوپاک میں علامہ اقبال کے جشن صد سالہ کا غلغلہ بلند ہوا۔ اس وقت تک صورت یہ تھی کہ علامہ اقبال کی تاریخ ولادت قطعی طور پر ہم لوگوں کے سامنے نہیں تھی۔ جہاں تک اقبال کی سوانح عمریوں کا تعلق ہے دو کتابیں اس وقت خاص اہمیت کی حامل تھیں۔ ایک عبداللہ انور بیگ کی انگریزی تصنیف The Poet of The East (1939) اور دوسری مولانا عبدالمجید سالک کی کتاب "ذکر اقبال" (1955) اور دونوں کتابوں میں علامہ اقبال کی تاریخ ولادت 22 فروری 1873ء دی گئی تھی۔ فقیر سید وحید الدین کی کتاب "روزگار فقیر" (جلد اول) کا نقش ثانی 1963ء میں چھپ چکا تھا اور اس میں پورا ایک باب بعنوان تاریخ پیدائش ــــ ایک غلطی کا ازالہ" موجود تھا اور اس میں 9 نومبر 1877ء کو تاریخ ولادت قرار دیا گیا تھا لیکن

اس کتاب نے اہل نظر کو اس وقت تک اپنی طرف اس طرح متوجہ نہیں کیا تھا جس کی یہ مستحق تھی۔

اقبال کے بارے میں اس وقت تک خاصی تعداد میں ایسی کتابیں اور مقالے چھپ چکے تھے جن میں اقبال کی تاریخ ولادت دی گئی تھی۔ ہندوپاک کے جن اہم مصنفین نے اس موضوع پر قلم اٹھایا تھا ان کی تعداد ساٹھ سے زیادہ تھی اور ان میں محمد الدین فوق، رام بابو سکسینہ، وی بی کرنین، خلیفہ عبدالحکیم، عبدالمجید سالک، بابا جان غفوروف، ڈاکٹر جاوید اقبال، ڈاکٹر وحید قریشی، مالک رام نواب سر ذوالفقار علی خان، لالہ سری رام، سید عابد علی عابد، عبداللہ انور بیگ، سید عبدالواحد معینی، مس میریا اسپنس اسمتھ، ملک راج آنند، سر راس مسعود، محمد طاہر فاروقی، حافظ محمود شیرانی، مولوی احمد دین، پچدانند سنہا، اینے میری شمل، اقبال سنگھ، شیخ اکبر علی، فقیر سید وحید الدین، چراغ حسن حسرت ایسے اہل قلم حضرات شامل تھے۔ ان حضرات کے دیئے ہوئے سنین 1873ء سے 1877ء تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان سنین کے دنوں اور مہینوں میں بھی فرق تھا۔ بعض نے اپنی رائے بدل بھی لی تھی۔ مثلاً ڈاکٹر وحید قریشی نے جو پہلے 1977ء کے حق میں تھے بعد میں 1873ء کے حق میں دلائل دیئے۔ اسی طرح مالک رام نے بھی جو پہلے 1877ء کے حق میں تھے، بعد میں ان کی رائے بھی یہی ہو گئی کہ تاریخ پیدائش 1873ء ہے۔ محمد الدین فوق نے ایک جگہ تاریخ پیدائش 1875ء لکھی ہے اور دوسری جگہ 1876ء سے ہٹ کے 1877ء پر آ گئے تھے 1977ء میں حکومت پاکستان پوسٹل ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے ایک ٹکٹ جاری کیا گیا جس پر تاریخ پیدائش 1873ء درج تھی بعد میں 1977ء میں ایک اور یادگاری ٹکٹ جاری کیا گیا جس پر تاریخ 1877ء چھپی تھی گویا۔

"شد پریشان خواب من از کثرت تعبیرہا" والی بات تھی۔

اب اسے سالک صاحب کی کتاب کی مقبولیت سمجھیں یا کچھ اور، عام رائے ہندوستان میں 1873ء کے حق میں تھی۔ اس وقت قدرتی طور پر یہ بات ہمارے سامنے نہ آ سکی کہ پاکستان میں صورتحال کیا ہے لیکن ہندوستان میں عاشقین کلام اقبال کا جھکاؤ 22 فروری 1873ء ہی کی طرف تھا اور اس تاریخ کو صحیح تسلیم کرنے والے حضرات بار بار

"ذکرِ اقبال" کا حوالے دیتے تھے۔ اس کا سبب ایک تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کے علمی اور ادبی حلقوں میں سالک صاحب اور ان کی تحریروں کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ آج بھی یہی صورت ہے اور دوسرا سبب ممکن ہے یہ بھی ہو کہ عاشقانِ کلامِ اقبال جلد از جلد صدی تقاریب منانا چاہتے تھے۔ بصورت دیگر انھیں چار سال یا پانچ سال اور انتظار کرنا پڑتا۔

تو گویا 1975ء کے آخری مہینوں کے آتے آتے ہندوستان کی فضا صدی تقاریب کے غلغلے سے معمور ہو چکی تھی اور ہندوستان کی متعدد علمی اور ادبی انجمنیں ملک کے طول و عرض میں 1973ء ہی میں صدی تقاریب منانے کے لئے سرگرم عمل ہو گئیں۔ لیکن یہ اختلاف رائے بڑی حد تک ملک کے انگریزی اخبارات تک محدود رہا۔ یہاں یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ انگریزی اخبارات میں جو کچھ چھپتا تھا اس کے اردو ترجمے ملک کے اردو اخبارات میں بالعموم شائع ہو جاتے تھے۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہو گا کہ یہ بحث راقم التحریر کے اس مقالے سے شروع ہوئی جو 18 فروری 1973ء کو انگریزی روزنامہ "ہندوستان ٹائمز" (نئی دہلی) میں شائع ہوا اور دوسرا بڑا سبب اس کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کا اردو دان طبقہ 22 فروری 1873ء کے علاوہ کسی اور تاریخ کا ذکر سننے کو بھی تیار نہ تھا کیونکہ اس صورت میں صدی تقاریب چار یا پانچ سال اور آگے چلی جاتیں۔

اس گہما گہمی کے عالم میں ملک کی دو بڑی علمی اور ادبی جماعتوں نے 1973ء ہی میں صدی تقاریب منانے کا اعلان کیا۔ غالب اکیڈمی نئی دہلی نے 22 فروری 1973ء ہی صدی تقاریب کی تاریخ مقرر کی اور اقبال اکیڈمی حیدر آباد نے اپنی سہولت کے پیش نظر ۱۱ مئی سے 24 مئی 1973ء کی تاریخیں طے کیں، جب ان دونوں اداروں نے صدی تقاریب کا اعلان کیا اور ملک کے مختلف حصوں سے مقالہ نگار حضرات کو دعوت دی تو 1973ء کی بات ذہنوں میں پختہ تر ہو گئی اور 1977ء کی تاریخ سے اکثر لوگ خالی الذہن ہو گئے۔

22 فروری 1973ء ہی پر اجتماع آراء کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ سیالکوٹ اور لاہور میں علامہ اقبال کے مکانوں پر بھی محکمہ آثار قدیمہ کی جانب سے یہی تاریخ درج کی گئی تھی۔

آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی نے اس ادارے کی طرف سے جنوری 1973ء میں ایک خط ملک کے متعدد اہل قلم کو لکھا یہ ایک عجیب و غریب قسم کا خط تھا۔ اس میں اقبال کی تاریخ پیدائش کے متعلق دو ایک مصنفین کے حوالے دینے کے بعد چند لا تعلق سی رسمی باتیں لکھی گئی تھیں اور آخر میں مکتوب الیہ حضرات سے اس موضوع پر آراء طلب کی گئی تھیں۔ آخری جملہ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو یہ تھا۔

I SHOULD BE GRATEFUL IF YOU COULD KINDLY LET ME KNOW YOUR VIEWS ON THE SUBJECT.

یہ خط اگرچہ خلوص نیت پر مبنی تھا لیکن اس وقت آل انڈیا ریڈیو کے شعبہ اردو میں جو لوگ اتنے اہم کام کا بیڑا اٹھا رہے تھے ان کی موضوع سے عدم واقفیت اس خط کی عبارت سے ظاہر تھی لیکن آل انڈیا ریڈیو کو تو بہت دیکھ بھال کے قدم اٹھانا ہی تھا اور ریڈیو کے اعلیٰ حکام بالخصوص ڈائریکٹر جنرل عبداللطیف بروا کی یہ احتیاط پسندی ہر اعتبار سے قابل تعریف ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ شعبہ اردو سے متعلق جن لوگوں کے سپرد انھوں نے یہ کام کیا وہ اس کام کے اہل نہیں تھے ورنہ اس خط کا متن بالکل مختلف ہوتا اور ویسے بھی تحقیق کے مسائل ووٹوں سے حل نہیں ہوتے۔

پروفیسر آل احمد سرور اس زمانے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پروفیسر اور صدر شعبہ اردو تھے۔ انھوں نے ساری صورت حال کے پیش نظر خاصی احتیاط سے کام لیا انھوں نے اس سلسلے میں جس سیمینار کا اعلان کیا اور اس کے لئے دعوت نامے بھیجے اس کی تاریخیں انھوں نے پہلے 22 سے 25 فروری رکھیں بعد میں یہ تاریخیں 23 سے 26 مارچ کردی گئیں لیکن 22 سے 25 فروری والے دعوت ناموں میں بھی انھوں نے یہ نہیں لکھا کہ یہ سیمینار اقبال صدی تقاریب کے سلسلے میں منعقد کیا جا رہا ہے۔ بلکہ یہ لکھا کہ شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے زیر اہتمام اکثر کسی نہ کسی علمی اور ادبی موضوع پر سیمینار منعقد کئے جاتے ہیں۔ یہ سیمینار بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ہو سکتا ہے سرور صاحب نے یہ سیمینار مارچ تک اسی لئے ملتوی کردیا ہو کہ کہیں شعبہ اردو' علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو بھی 22 فروری 1873ء کا حامی نہ سمجھ لیا جائے جب کہ

تاریخ پیدائش ابھی تک قطعی طور پر طے نہیں ہوئی۔

حضرات‘ ان سطور میں اقبال کی تاریخ ولادت پر بحث کرنا مقصود نہیں ہے لیکن اس امر کی طرف ایک اشارہ میں ضرور کرنا چاہوں گا کہ اس سلسلے میں ہندوستان میں جو کام ہوا اس کی جانب پاکستان کا ردعمل کیا تھا۔

اس بات کے تسلیم کرنے میں اہل ہند کو کوئی تامل نہ ہونا چاہئے کہ بحیثیت مجموعی علامہ اقبال کی تاریخ ولادت کا مسئلہ پاکستان کے لئے ہندوستان کے مقابلے میں کہیں زیادہ اہمیت رکھتا تھا لیکن 1973ء میں ریڈیو پاکستان سے کبھی صدی تقاریب کے تعلق سے 22 فروری 1873ء کی تاریخ سننے میں نہ آئی۔ پاکستان پریس میں بھی اس تاریخ کا ذکر 1971ء تک دیکھنے میں نہ آیا۔ اس سے اس نتیجے پر پہنچنا غلط نہ ہوگا کہ پاکستان کے ادبی حلقوں نے بڑی حد تک 22 فروری 1873ء کی تاریخ کو نظرانداز ہی کیا۔ وہ 1977ء ہی کے انتظار میں رہے۔ اقبال کے حلقہ نیازمندان اور ان پر تحقیقی کام کرنے والوں میں سید نذیر نیازی ڈاکٹر ممتاز حسن‘ بشیر احمد ڈار‘ میاں محمد شفیع‘ پروفیسر یوسف سلیم چشتی‘ ڈاکٹر سید عبداللہ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم‘ ڈاکٹر وحید قریشی‘ شورش کاشمیری‘ عبداللہ ملک‘ خواجہ عبدالحمید عرفانی‘ ملک سلیم حیات بیرسٹر مشفق خواجہ‘ خواجہ عبدالرحیم (سیکرٹری مزار اقبال کمیٹی) پروفیسر محمد منور‘ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی‘ غلام رسول مہر اور غلام رسول خان ایسے حضرات شامل تھے لیکن انہوں نے 73ء یا 76ء میں صدی تقاریب منانے کے سوال پر کبھی غور نہیں کیا۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ ہندوستان میں جب اقبال صدی تقاریب کسی نہ کسی صورت میں 73ء ہی میں شروع ہو گئیں اور اس کے متعلق اطلاعات اس سے ایک برس قبل ہی نظر آنے لگے تو پاکستان کے بعض حلقوں میں اس کا ردعمل اچھا نہیں ہوا لیکن یہ ردعمل بڑی حد تک غلط فہمی پر مبنی تھا۔ اس کی کوئی حقیقی بنیاد نہیں تھی۔ مثلاً نوائے وقت (لاہور) نے 27 جنوری کی اشاعت میں لکھا۔

علامہ اقبال کا یوم ولادت

یہ مذاق ختم کیجئے۔

"حکیم الامت علامہ اقبال کی تاریخ پیدائش آج

کل پاکستان کے علمی ادبی' تحقیقی اور بعض سیاسی حلقوں میں بحث و تمحیص کا موضوع بنی ہوئی ہے ایک مکتب فکر 22 فروری 1873ء یا 29 دسمبر 1873ء کو علامہ اقبال کا یوم پیدائش قرار دیتے ہوئے اس سال شاعر مشرق کا صد سالہ یوم ولادت منانے کی تقاریب منعقد کرنے پر اصرار کر رہا ہے۔ (ہمارے ہمسایہ ملک بھارت کے حکمران بھی اس سال علامہ اقبال کا صد سالہ یوم ولادت سرکاری طور پر منا رہے ہیں) دوسرا طبقۂ خیال اس تاریخ 1873ء کو غلط قرار دیتا ہے۔ اس مکتب فکر کے نزدیک علامہ کا یوم ولادت 9 نومبر 1877ء تھا جو علامہ صاحب کے پی ایچ ڈی کے مقالے کے دیباچے میں ان کے اپنے ہاتھ سے درج شدہ ہجری تاریخ 3 ذیقعدہ 1294ء ہجری) سے اخذ ہوئی ہے۔ یہ بحث ہنوز جاری ہے اور اول الذکر طبقہ اسی سال علامہ اقبال کا یوم ولادت منانے پر اصرار کر رہا ہے' شاید اس لئے کہ ہم کہیں بھارت سے پیچھے نہ رہ جائیں۔

ہمارے لئے یہ امر ناقابل فہم ہے کہ ہمارے ارباب فکر و دانش خود علامہ اقبال کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تاریخ پر یقین کیوں نہیں کرتے اور تحقیق و تجسس کے نام پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں کہ علامہ صاحب نے اپنی تاریخ پیدائش کے بارے میں خدانخواستہ دروغ گوئی سے کام لیا تھا۔ کیا یہ مشاہیر قوم کی شخصیت مسخ کرنے کی مذموم کوشش نہیں۔ پھر اگر علامہ اقبال واقعی فروری یا دسمبر 1873ء میں پیدا ہوئے تھے تو کیا یہ ارباب تحقیق و دانش گذشتہ سال سوئے ہوئے تھے اور اب انہیں بھارت کی طرف دیکھ کر ہوش آیا ہے۔ جہاں تک بھارت کا تعلق ہے وہاں کانگریسی حکمران علامہ اقبال کے صد سالہ یوم ولادت کی تقاریب کو اپنے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کر رہے

ہیں۔ کانگریسی حکمرانوں کو بھارت کے اردو بولنے والے علاقوں (یوپی) میں عام انتخاب درپیش ہیں۔ وہ اس علاقے میں مسلمانوں کے ووٹ حاصل کر کے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح وہ مقبوضہ کشمیر میں کشمیری الاصل علامہ اقبال کا نام استعمال کر کے کشمیریوں کی ہمدردیاں حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ پھر ہمیں اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ بھارتی حکمران علامہ اقبال کو ہمیشہ اپنے نقطہ نظر سے پیش کرتے رہے ہیں۔ان کا نقطہ نظریہ ہے کہ علامہ اقبال سارے ہندوستان کے شاعر تھے (علامہ کے ابتدائی زمانے کی نظمیں اسی لئے آل انڈیا ریڈیو سے نشر کی جاتی ہیں) اس طرح وہ یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ علامہ نے دو قومی نظریہ پیش نہیں کیا تھا۔ وہ تو سارے ہندوستانیوں (پاکستانی مسلمانوں سمیت) کے شاعر تھے۔ بھارتی حکمران علامہ اقبال کا یہ تصور عالم اسلام (بالخصوص ہمارے عرب بھائیوں) میں بھی ہمارے اساسی نظریہ کو غلط ثابت کرنے کے لئے پیش کرتے ہیں۔

ہمیں بھارتی حکمرانوں سے کوئی شکوہ نہیں ہونا چاہئے۔ انہوں نے تو ابھی تک پاکستان کے وجود کو ذہنی طور پر قبول نہیں کیا اور وہ ہمارے اساسی نظریات پر وار کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے لیکن سوال یہ ہے کہ ہمارے اپنے دانشور اور ارباب فکر و نظر حکیم الامت شاعر مشرق اور نظریہ پاکستان کے خالق کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں۔

ہندوستان میں اقبال صدی تقاریب کے سلسلے میں جو کوششیں ہو رہی تھیں ان پر یک قلم یہ کہہ کر پانی پھیر دینا کہ بھارت کے سیاسی حکمران اقبال صدی تقاریب کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر رہے ہیں کوئی مستحسن اور قابل تعریف انداز فکر نہیں تھا۔ دراصل ولادت اقبال کے متعلق متعدد تاریخوں کی موجودگی میں حکومت پاکستان کی طرف سے قائم کی ہوئی کمیٹی قطعی تاریخ ولادت کے بارے میں جلد کوئی فیصلہ نہ کر سکی۔ اس کمیٹی نے یکم فروری 1974ء کو اعلان کیا کہ اقبال کی تاریخ ولادت 9 نومبر 1877ء ہے کمیٹی کے اس تساہل کا بھی اہل پاکستان نے اچھا اثر نہ لیا۔ اس دوران میں متعدد محققین پاکستان نے اپنے اپنے طور پر مختلف تاریخوں کے حق میں اپنے اپنے دلائل پیش کرنا

شروع کر دیے تھے اور کوئی واضح تصویر سامنے نہیں آ رہی تھی۔ چنانچہ اس صورت حال کے پیش نظر پاکستان کے بزرگ شاعر مولانا وقار انبالوی نے اپنے تاثرات اس قطعے کی صورت میں ظاہر کئے۔

اقوام کے پیکر کو مقدر کی طرف سے — اس دیدۂ بیدار سی دولت نہیں ملتی
ہم جشن ولادت تو منانے پہ مصر ہیں — اقبال کی تاریخ ولادت نہیں ملتی

اس وقت تک ہندوستان کے طول و عرض میں "ہندوستان ٹائمز" (نئی دہلی) کے مذکورہ مقالے کے نتائج (یعنی 9 نومبر 1877ء کو اقبال کی تاریخ ولادت کے طور پر تسلیم بھی کیا جا چکا تھا اور ساتھ ہی جوش اشتیاق میں 1973ء سے اقبال صدی تقاریب کا آغاز بھی ہو گیا تھا۔ یہ صورت حال پاکستان کے بعض اخبار نویس حضرات کو ناگوار گزری اور انہوں نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ شاید یہ کوئی دوڑ ہے جس میں ہندوستان پاکستان سے آگے نکلا جا رہا ہے۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ حقیقت حال یہ ہے کہ عاشقان اقبال کی نہ پاکستان میں کمی ہے نہ ہندوستان میں۔ یہ کسی دوڑ کا سوال نہیں تھا۔ نہ اس میں کوئی سیاست پنہاں تھی، محض اظہار عقیدت کی بات تھی۔

ان ہی دنوں پاکستان ٹائمز راولپنڈی میں ایک خط شائع ہوا جس میں یہ عبارت درج تھی۔ "ہندوستان کی وزیر اعظم اتر پردیش کے آنے والے انتخاب میں مسلمانوں کے ووٹ حاصل کرنے کے لئے بے شک علامہ اقبال کا نام استعمال کر کے اپنے آپ کو اور دنیا کو دھوکہ دیں۔ میں تمام سچے پاکستانیوں سے گذارش کرتا ہوں کہ وہ علامہ اقبال کی آئیڈیالوجی کے دشمنوں کے ہاتھوں میں کھیلنے سے گریز کریں۔"

گویا عجیب صورت حال تھی۔

بجرم عشق تو ام می کشند و غوغائیست
تو نیز برسر بام آ کہ خوش تماشائیست

مذکورہ خط سے قبل 25 جنوری 1974ء کے "پاکستان ٹائمز" میں بھی ایک خط اسی مضمون کا چھپ چکا تھا جس میں لکھا تھا۔ "1873ء کی حمایت میں ایک دلیل یہ پیش کی جا رہی ہے کہ حکومت ہند نے بھی یہ تاریخ قبول کر لی ہے اور وزیر اعظم اندرا گاندھی کی زیر

صدارت ایک کمیٹی تشکیل پا چکی ہے۔۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ یو پی اسمبلی کے انتخابات میں جو مسز گاندھی کے لئے خاص اہمیت رکھتے ہیں مسلمانوں کے ووٹ حاصل کئے جائیں۔ جہاں تک ہندوستانیوں کا تعلق ہے انہوں نے اس سلسلے میں (اقبالیات کے تعلق سے) کوئی تحقیقی کام نہیں کیا ہے۔" اسے کہتے ہیں "ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ" اب اس ضمن میں کیا کہا جائے۔ ہندوستان میں اقبال پر کام ہوا ہے یا نہیں یا اس وقت ہوا تھا یا نہیں یہ ایک خالص علمی بحث ہے مذکورہ اخبارات نے تو اپنی بحث میں علمی اور ادبی پہلو کو قریب ہی نہیں آنے دیا۔ دراصل اس تحریر میں اس طرح کے اقتباسات کو مجھے نظر انداز کرنا چاہئے تھا لیکن بات چونکہ ذرا سخن گسترانہ آپڑی ہے اس لئے ان اقتباسات کا ذکر میں نے ضروری سمجھا اور اس سلسلے میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ مذکورہ اخبارات اگر اس طرح کی تحریریں شائع کرنے سے قبل اپنے ملک کے ادیبوں' شاعروں' محققوں اور دانشوروں کے ساتھ اس موضوع پر بات کر لیتے تو وہ یقیناً انہیں قابل قدر مشورہ دیتے۔ ہندوستان میں اقبال پر کام کرنے والوں اور اقبال صدی تقاریب منانے والوں کے لئے یہ بات بڑے اطمینان اور حوصلے کا باعث رہی کہ پاکستان کے کسی ادیب' دانشور یا محقق نے مذکورہ اخبارات کے خیالات کی تائید نہیں کی اور وہ اپنے اپنے انداز سے اس کام کا تعریفی الفاظ میں ذکر کرتے رہے جو ہندوستان میں اقبال کے متعلق ہو رہا تھا۔ پاکستان کے ادیبوں اور نقادوں کا رویہ اب بھی اہل ہندوستان کے کام بالخصوص ہندوستان میں اقبالیات کی جانب معروضی اور خالص ادبی انداز کا ہے اور کسی نے اس ادبی نوعیت کے کام کو شک و شبہ کی نگاہ سے نہیں دیکھا بلکہ پاکستان کے متعدد ادیب اور اہل قلم کل ہند اقبال صدی تقاریب میں شریک بھی ہوئے۔

"ہندوستان ٹائمز" نئی دہلی میں مطبوعہ راقم التحریر کے مقالے کا ذکر اس سے قبل آ چکا ہے اس مقالے کو بنیاد بناتے ہوئے علی سردار جعفری نے علی گڑھ کے سیمینار میں 23 مارچ 1973ء کو اس مضمون کا ریزولیشن پیش کیا کہ ہندوستان میں 77ء ہی میں اقبال صدی تقاریب منائی جائیں گی۔ اس ریزولیشن کی تائید پروفیسر آل احمد سرور نے کی اور چند تقریروں کے بعد جن میں ڈاکٹر عالم خوندمیری اور ڈاکٹر خلیل الرحمان اعظمی کی

تقریریں خاص اہمیت رکھتی ہیں یہ ریزولیوشن متفقہ طور پر پاس ہوا ہندوستان کی جس کمیٹی کا ذکر "پاکستان ٹائمز" کی مذکورہ بالا تحریر میں ہوا ہے اس کی تشکیل اس ریزولیوشن کے بعد عمل میں آئی اور اس کا پہلا جلسہ 29 دسمبر 1973ء کو نئی دہلی میں منعقد ہوا۔ اس سے قبل نہ کوئی کمیٹی تھی اور نہ ہی محترمہ اندرا گاندھی کبھی کسی اقبال کمیٹی کی صدر رہیں۔ یہ سب زیب داستان کی باتیں تھیں۔

لیکن اسی اخبار "پاکستان ٹائمز" کے کالم نگار محمد ادریس نے لاہور نوٹ بک کے زیر عنوان 22 جنوری 74ء کے شمارے میں کچھ مختلف قسم کی بات کہی۔ ان کا لب و لہجہ اخباروں کی عام روش سے بہت مختلف تھا انہوں نے اس کالم میں لکھا:

> "آخر اس کمیٹی کا کیا ہوا جو اقبال کی تاریخ ولادت کے تعین کے لئے قائم کی گئی تھی؟ اطلاع یہ ہے کہ کمیٹی ابھی تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچی اس سے ان لوگوں کے ڈیڈ یکیشن کا اندازہ ہوتا ہے جو اقبال پر تحقیق کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں
>
> کیا اس سے ہماری تہذیبی مکاری پر روشنی نہیں پڑتی کہ ہم نے اب اقبال صدی تقاریب کی بات شروع کر دی ہے کیونکہ سرحد پار اس تقریب کے منانے کا فیصلہ ہو گیا ہے۔ اگر ہم اقبال کے بارے میں دیانت دار قسم کے لوگ ہیں تو ہم اس سلسلے میں وہ سب کیوں نہیں کرتے جو ہمیں کرنا چاہئے ہمیں اقبال کے تعلق سے کسی طرح کی بناوٹ سے کام نہیں لینا چاہئے۔ ہمیں اقبال کے بارے میں باتیں بھی کرنا چاہئیں لیکن ساتھ ہی ساتھ اقبال کے متعلق کام بھی کرنا چاہئے۔ مگر ہمیں اقبال اور اس کی تعلیم کے متعلق باتیں کرنے کے بہانے نہیں ڈھونڈنا چاہئیں ہمیں چاہئے کہ ہم اقبال کے

بارے میں ذرا اور دیانت دار ہو جائیں ------

آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی کے جس مراسلے کا ذکر پہلے آ چکا ہے اس میں شیخ اعجاز احمد اور جناب مالک رام کی باہمی بات چیت کا ذکر ہے راقم التحریر نے اس سلسلے میں جب مالک رام صاحب سے بات کی تو انہوں نے بتایا کہ ان کی ملاقات شیخ اعجاز احمد کے ساتھ کراچی میں 1952ء میں ہوئی تھی اور وہ بھی تھوڑی دیر کے لئے کراچی کی بندرگاہ پر جب مالک رام صاحب یورپ سے واپس آ رہے تھے اور 1952ء میں تو اقبال کی تاریخ ولادت موضوع بحث ہی نہیں بنی تھی' نہ ہندوستان میں نہ پاکستان میں یہ مسئلہ کسی حد تک 1963ء میں بحث و تمحیص کا موضوع بنا جب فقیر سید وحید الدین کی کتاب روزگار فقیر (جلد اول) کا دوسرا ایڈیشن منظر عام پر آیا لیکن اس وقت بھی اس کتاب کی تحقیقی اہمیت کو بہت کم لوگوں نے تسلیم کیا حالانکہ یہ کتاب خاصی Recognition کی مستحق تھی اور ہے۔

شیخ اعجاز احمد کے ساتھ 1952ء والی ملاقات کے بعد جب مالک رام نے انسائیکلوپیڈیا آف انڈین مسلمز (کلکتہ) کے لئے اقبال پر اپنا چھوٹا سا مقالہ لکھا تو اس میں انہوں نے 9 نومبر 1877ء ہی کو اقبال کی تاریخ ولادت قرار دیا۔ اس کے بڑی مدت بعد انہوں نے سہ ماہی "تحریر" (جولائی ستمبر 75) میں جب انہوں نے اقبال کی تاریخ ولادت کے عنوان سے مضمون لکھا تو انہوں نے ڈاکٹر نظیر صوفی کی تائید میں 29 دسمبر 1873ء کو اقبال کی تاریخ ولادت کے طور پر تسلیم کیا۔

یہاں میں ہندوستان میں تشکیل پائے ہوئے ایک ایسے کام کا بھی مختصر طور پر ذکر کرنا چاہتا ہوں جس کی کوئی بہت زیادہ علمی یا ادبی اہمیت تو نہیں لیکن عوامی اور سماجی سطح پر اس کی بہت اہمیت رہی ہے اور وہ ہے اقبال نمائش کی تشکیل۔ اس کا ذکر میں اس لئے بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اس نمائش کی تشکیل و تکمیل میں کشمیر یونیورسٹی کو اتنا ہی کریڈٹ جاتا ہے جتنا حکومت ہند کی وزارت اطلاعات و نشریات کو اس لئے کہ اس نمائش کی تجویز اول اول کشمیر یونیورسٹی کی طرف سے پیش ہوئی۔

یہ نمائش 27 اکتوبر 1973ء کو پہلی بار سرینگر میں منعقد ہوئی اور اس کے بعد

ہندوستان کے مختلف شہروں مثلاً دہلی (تین بار) علی گڑھ' پٹنہ' بمبئی' وینیم باڑی (تمل ناڈو) جموں' مدراس' چنڈی گڑھ' پٹنہ' حیدر آباد' لکھنؤ اور ملک کے متعدد علمی اور ادبی مرکزوں میں منعقد ہوئی اور ڈی اے وی پی کے ریکارڈ کے مطابق یہ نمائش کوئی تین لاکھ افراد نے دیکھی۔ پہلی بار جب یہ سری نگر میں منعقد ہوئی تو ریکارڈ کے مطابق کوئی نو ہزار افراد نے یہ نمائش دیکھی۔ یہ نمائش علامہ اقبال کی تصویروں اور ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریروں پر مشتمل تھی اور تصویروں کی تعداد 657 تھی۔

اس نمائش کا افتتاح حکومت ہند کے وزیر اطلاعات و نشریات جناب اندر کمار گجرال نے کیا تھا۔ جناب شیخ محمد عبداللہ اس میں مہمان خصوصی کے طور پر شریک ہوئے۔ جموں و کشمیر کے گورنر جناب ایل کے جھا اور وزیر اعلیٰ جناب سید میر قاسم نے بھی شرکت کی جناب ٹینگ سیکرٹری کلچرل اکیڈیمی جموں و کشمیر اور پروفیسر شکیل الرحمان صدر شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی نے اپنے اپنے خطبات استقبالیہ لکھے۔ ٹینگ صاحب کا خطبہ استقبالیہ کلچرل اکیڈیمی کی جانب سے تھا اور ڈاکٹر شکیل الرحمان کا کشمیر یونیورسٹی کی جانب سے

اس نمائش کی تشکیل و تکمیل میں کشمیر یونیورسٹی کے علاوہ جن اداروں کا تعاون حاصل رہا وہ ہیں عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری حیدر آباد' اقبال اکیڈیمی حیدر آباد' خدا بخش لائبریری پٹنہ' مولانا ابوالکلام آزاد لائبریری علی گڑھ' رضا لائبریری رام پور' دہلی یونیورسٹی لائبریری دہلی' کشمیر یونیورسٹی' لائبریری سری نگر' جموں یونیورسٹی لائبریری جموں' ڈائریکٹریٹ آف انفارمیشن آندھرا پردیش' ڈائریکٹریٹ آف انفارمیشن بہار' ڈائریکٹریٹ آف انفارمیشن جموں و کشمیر اور جموں و کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگو یجز۔

شیخ محمد عبداللہ نے اپنی تقریر میں فرمایا تھا کہ "اقبال نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ایک بار پھر کشمیر آئیں گے اگرچہ موت کے ظالم ہاتھوں نے انہیں دوبارہ کشمیر آنے کا موقع نہیں دیا لیکن اس نمائش کو دیکھ کر میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ وہ اس تصویری پیکر میں کشمیر تشریف لے آئے ہیں۔"

نمائش کی تجویز جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کشمیر یونیورسٹی کی جانب سے تھی' منصوبہ بندی اور رابطے کا کام پریس انفارمیشن بیورو نے انجام دیا' عکاسی کا کام فوٹو ڈویژن

کے تعاون سے پایہ تکمیل تک پہنچا اور ترمیم و تشکیل کے مراحل آلابیشن یونٹ، ڈائریکٹریٹ آف ایڈورٹائزنگ اینڈ وژول پبلسٹی کے ہاتھوں طے ہوئے۔

اپنے اس مقالے کے شروع میں جس منفی لہر کا میں نے ذکر کیا ہے اس کا ایک پہلو اس نمائش کی ترتیب و تشکیل کے دوران میں یوں دیکھنے میں آیا کہ جب یہ نمائش زیر ترتیب تھی تو اس کے مرتب نے ملک کے انگریزی اور اردو اخبارات میں چھوٹے چھوٹے مضامین لکھے تھے۔ علامہ اقبال کی بعض تحریروں اور تصویروں کی تلاش کے لئے۔ اس کے خطوط بھی ہندوستان میں اردو اور دوسری زبانوں کے اخبارات میں چھپے تھے۔ ان خطوط کے جواب میں جہاں مرتب کو ملک کے بعض علمی اور ادبی حلقوں سے خاصا تعاون ملا، وہاں اسے بعض عتاب نامے بھی موصول ہوئے جن میں اس قسم کی عبارت درج تھی کہ آپ ہندوستان کے ایک دشمن کی یاد میں نمائش کا انتظام کر رہے ہیں اس وقت ہندوستان میں مسلم نواز حکومت نہ ہوتی اور کوئی صحیح طرح کی جمہوری حکومت ہوتی تو آپ اس وقت جیل خانے میں ہوتے۔ ایک صاحب نے یہ لکھا کہ آپ کا نام ملک کے غداروں کی فہرست میں لکھا جائے گا۔

نئی دہلی کے انگریزی اخبار "مدر لینڈ" نے اس نمائش کو ملک دشمن نوعیت کا کام قرار دیا اور طنزاً لکھا کہ "اقبال نمائش" کے مرتب اب اس نمائش کے بعد "جناح نمائش" مرتب کریں گے جو ملک کے مختلف حصوں میں منعقد کی جائے گی۔

(10)

یہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ میں نے اپنے اس مضمون کو ایک تحقیقی مقالہ بنانے کی کوشش نہیں کی ورنہ میں یہ بات بھی تفصیل سے بیان کرتا کہ آج ہندوستان کی ساٹھ کے قریب ان یونیورسٹیوں میں جن میں اردو پوسٹ گریجویٹ سطح پر پڑھائی جا رہی ہے اقبالیات کا موضوع نصاب کا حصہ ہے کہیں ایم اے میں کہیں ایم فل میں Special Study کے طور پر پی ایچ ڈی کے تھیسس بھی بڑی تعداد میں لکھے جا چکے ہیں جن کی تفصیل وقتاً" فوقتاً" "ہماری زبان" نئی دہلی اور ماہنامہ "کتاب نما" نئی دہلی میں شائع ہوتی رہتی ہے۔

اقبال صدی تقاریب کے دوران میں ہندوستان کی متعدد یونیورسٹیوں میں ملک کے علمی

اور ادبی اداروں کے زیر اہتمام بڑے بڑے اقبال سیمینار منعقد ہوئے متعدد جرائد نے جن میں سہ ماہی "اردو ادب دہلی" "آجکل" دہلی "شاعر" بمبئی "آواز دہلی" "مشہور" کلکتہ "قومی آواز" بمبئی "شیرازہ" سری نگر "برگ آوارہ" حیدر آباد "الاولیاء" سری نگر "شعاع" اورنگ آباد "نگار لکھنؤ" "تحریک نئی دہلی" "ہما اقبال نمبر نئی دہلی "ہما اقبال صدی نمبر نئی دہلی" "ہماری زبان" نئی دہلی "مشور" حیدر آباد "بلٹز" بمبئی "آہنگ گیا" "اقبال ریو" حیدر آباد "جامعہ" دہلی اور "تعمیر" سری نگر کے اقبال نمبر خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

جہاں تک انگریزی جرائد کا تعلق ہے Indo-Ira کلکتہ کا اقبال نمبر "ہندوستان ٹائمز نئی دہلی" اور "السٹریٹڈ ویکلی" کے اقبال سپلیمنٹ کا ذکر یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے "پاکستان ٹائمز" لاہور نے اس موقع پر ایک ایسا اقبال سپلیمنٹ بھی شائع کیا جس میں اقبالیات سے متعلق صرف ہندوستان کے اہل قلم کے مضامین شریک اشاعت کئے گئے تھے۔

ہندوستانی جرائد کے خاص نمبروں کے علاوہ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ہندوستان کے قریباً تمام اہم جرائد میں اقبال اور اقبالیات سے متعلق اکثر مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں اس معاملے میں ماہنامہ "شب خون" الہ آباد جسے شمس الرحمان فاروقی مرتب کرتے ہیں اور سہ ماہی "گفتگو" بمبئی جس کے مدیر علی سردار جعفری ہیں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ "زبان و ادب" پٹنہ "روح ادب" کلکتہ "شاعر بمبئی" سب رس حیدر آباد پرواز ادب پٹیالہ تعمیر ہریانہ چندی گڑھ "قومی راج" بمبئی "نیا دور" لکھنؤ "کتاب نما دہلی" مریخ پٹنہ "آجکل" نئی دہلی "ایوان اردو" نئی دہلی امکان بمبئی "اکادمی" لکھنؤ "نخلستان" جے پور "توازن" مالی گاؤں "پونم" حیدر آباد "سہیل" گیا "لمحے لمحے" بدایوں اور دوسرے جرائد میں اقبال اور اقبالیات سے متعلق اہم مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں "اقبال انسٹی ٹیوٹ یونیورسٹی آف کشمیر کا سہ ماہی اقبالیات اور اقبال اکیڈمی حیدر آباد کا سہ ماہی اقبال ریویو دونوں اقبالیات ہی کے لئے وقف ہیں جہاں تک اقبال انسٹی ٹیوٹ کے بارے میں جس کے کام سیمیناروں کے علاوہ ایم فل اور پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالوں اور اقبال کے متعلق کتابوں پر مشتمل ہیں بہت کچھ کہنے کی ضرورت ہے لیکن اس سے اس لئے صرف نظر کیا جا رہا ہے کہ ایک تو یہ مقالہ یونیورسٹی آف کشمیر میں پڑھا جا رہا ہے جہاں کے اساتذہ اور طلبہ میری بہ نسبت اقبال انسٹی ٹیوٹ کی قابل قدر کارگزاری

کے متعلق بہت زیادہ جانتے ہیں دوسرے ان علمی اور ادبی اداروں کی سرگرمیوں کو جن کے کارگزاری کے متعلق بہت زیادہ جانتے ہیں دوسرے ان علمی اور ادبی اداروں کی سرگرمیوں کو جن کے کام لحہ بہ لحہ ملک اور اہل ملک کے سامنے آتے رہتے ہیں اس مقالے میں بحث کا موضوع نہیں بنایا گیا اس ضمن میں اقبال انسٹی ٹیوٹ سری نگر اور اقبال اکیڈمی حیدر آباد کے علاوہ اقبال ادبی مرکز بھوپال کا ذکر بہت ضروری ہے جس کے زیر اہتمام آل انڈیا سطح کے سیمینار بالعموم منعقد کیے جاتے ہیں۔

اقبالیات اور اقبال کے تعلق سے کشمیر میں جو کام ہوا ہے اسے میں نے تفصیل سے بیان نہ کرنے کی وجہ پہلے بیان کر دی ہے ورنہ اقبالیات کو زندہ و توانا رکھنے کے لئے کشمیر میں نہ اہل قلم حضرات کی کمی ہے نہ انجمنوں کی مثلاً ڈاکٹر شکیل الرحمان کی زیر ہدایت ایک انجمن کچھ مدت تک اقبالیات کے سلسلے میں خاصا کام کرتی رہی۔ آج بھی بزم اقبال جس کے سیکرٹری نحوی صاحب ہیں ہر اعتبار سے قابل تعریف کام کر رہی ہے صرف ایک اہل قلم رشید نازکی نے اقبال پر کوئی ایک درجن کے قریب مقالات لکھے ہیں۔

اس موقعے پر اس کام کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو ریڈیو کشمیر سری نگر ریڈیو کشمیر جموں اور یہ اور ٹیلی ویژن سری نگر کی بدولت ہمارے سامنے آتا رہتا ہے جہاں تک ٹیلی ویژن دہلی، ٹیلی ویژن بمبئی، ٹیلی ویژن لکھنؤ، ٹیلی ویژن کلکتہ اور ٹیلی ویژن سری نگر کے ان پروگراموں کا تعلق ہے جن کا موضوع اقبال یا اقبالیات ہے ایک مفصل اور جامع تحقیقی مقالے کی ضرورت ہے ٹیلی ویژن سنٹر سری نگر سے تو اقبال کے سلسلے میں بعض ایسے وقیع پروگرام ٹیلی کاسٹ ہوئے ہیں کہ اگر انہیں محفوظ رکھا جاتا تو ہمارے آرکائیوز کی لائبریری چمک اٹھتی۔ اس ضمن میں "نصرت الاسلام سری نگر اور علم و دانش" سری نگر کا ذکر کیے بغیر یہ روداد مکمل نہیں ہو سکتی نصرت الاسلام کے نگران مولانا محمد فاروق ہیں اور علم و دانش ایک مدت تک پیر غیاث الدین کی زیر ادارت شائع ہوتا رہا۔ ان دونوں جرائد کے اقبال نمبر اقبالیات میں خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔

کشمیر کے اخبارات ویسے بھی اقبال کے ذکر سے لبریز ہوتے ہیں لیکن صدی تقاریب کے موقعے پر اکثر اخبارات نے اقبال نمبر شائع کیے جن میں آفتاب، سری نگر ٹائمز، آئینہ نوائے

صبح اور بعض دوسرے اخبارات کے اقبال نمبر خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر حامدی کاشمیری کے ساتھ اختلاف رائے کے باوجود ان کے مضامین کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال کے فن کے متعلق خواہ وہ اقبال کی غزلوں میں موضوعیت کا مسئلہ ہے خواہ اقبال کی نظموں کے ساختیاتی پہلو کا تعلق ہے انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ نقادان اقبال ہی کو نہیں پرستاران اقبال کو بھی دعوت فکر دیتا ہے اور یہ کسی بھی تنقیدی مضمون کی بہت بڑی خوبی ہے۔

جموں و کشمیر کلچرل اکیڈمی نے اس ضمن میں تاریخ ساز کام کیا ہے۔ اقبال صدی تقاریب کے موقع پر اس اکیڈمی نے جموں و کشمیر میں سال بھر تک صدی تقاریب منانے کا پروگرام بنایا اور اس سلسلے میں اس کے لبریز اقاویت اجلاس ریاست بھر کے اسکولوں' کالجوں اور دوسرے علمی اور ادبی اداروں میں پورے ایک برس تک منعقد ہوتے رہے۔ کلچرل اکیڈمی کے سیکرٹری محمد یوسف ٹینگ صف اول کے ادیب ہیں۔ انہوں نے خود بھی اس موضوع پر لکھا اور شیرازہ (اردو' ہندی' کشمیری اور ڈوگری) کے اقبال نمبروں کے لئے دوسرے اہل قلم حضرات کو بھی لکھنے کی دعوت دی' اور اس طرح سے جموں و کشمیر کی متعدد زبانوں میں اقبال پر اچھا خاصا ذخیرہ مضامین ان خاص نمبروں کی صورت میں طبع ہو کر محفوظ ہو گیا۔

اگرچہ اس مقالے میں ہندوستان کے دو ایک اقبال سیمیناروں کا ذکر ہو چکا ہے لیکن یہ بات ادھوری رہے گی اگر اس ضمن میں چند ایک اور سیمیناروں کا ذکر نہ کیا جائے۔

اس سلسلے میں سب سے بڑا اقبال سیمینار آل انڈیا اقبال صدی تقاریب کمیٹی کے زیر اہتمام 1977ء میں نئی دہلی میں منعقد کیا گیا جس کا افتتاح اس وقت کے وزیر اطلاعات و نشریات جناب ایل کے اڈوانی نے کیا۔ یہ ایک انٹرنیشنل سیمینار تھا جس میں ہمارے پڑوسی ملک پاکستان کے علاوہ جرمنی سے اینے میری شمل' چیکوسلواکیہ سے یان ماریک اور روس سے پروفیسر چیلی شیو شریک ہوئے۔

اقبال اکیڈمی حیدر آباد نے یوں تو 73ء سے 77ء تک کئی اقبال سیمینار منعقد کیے لیکن اس اکیڈمی کے زیر اہتمام 1986ء کا اقبال سیمینار ایک انٹرنیشنل اقبال سیمینار تھا جس میں متعدد ہندوستانی ماہرین اقبالیات کے علاوہ پاکستان' روس اور عرب ممالک سے بھی اقبال

شناس اہل قلم نے شرکت کی۔

جموں و کشمیر کلچرل اکیڈیمی نے بھی ایک اقبال سیمینار جموں میں منعقد کیا جس میں اندرون ملک کے نقادوں نے حصہ لیا۔ جموں یونیورسٹی جموں کے زیر اہتمام اسی سال جشن اقبال منایا گیا جس میں دو روزہ سیمینار کے علاوہ ایک رات علامہ اقبال کی یاد میں مشاعرے کے لئے وقف کی گئی اور ایک رات علامہ اقبال کے کلام پر مبنی موسیقی کا پروگرام منعقد کیا گیا۔ اس موقعے پر اقبال نمائش کا بھی اہتمام کیا گیا جو جموں یونیورسٹی کے کیمپس نمبر1 میں سات روز تک جاری رہی۔

ڈاکٹر محمد حسن کی کوششوں سے جواہر لال یونیورسٹی میں ڈاکٹر قمر رئیس کی مساعی سے دہلی یونیورسٹی میں اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے زیر اہتمام جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں معیاری اقبال سیمینار منعقد ہوئے سیمیناروں میں پیش کئے ہوئے مقالات بھی کتابی صورت میں چھپے کلکتہ میں دو اقبال سیمینار منعقد ہوئے ایک کلکتہ یونیورسٹی کی جانب سے جس کا انتظام وہاں کے شعبہ اردو نے کیا دوسرا حکومت مغربی بنگال کے زیر اہتمام ؟

اردو اکیڈیمی بھوپال مسلم ایجوکیشنل ٹرسٹ جبل پور' اور مسلم ایجوکیشنل ٹرسٹ وینم باڑی کے سیمینار بھی یادگاری سیمینار تھے۔ اس ضمن میں بہار کے اردو فارسی اور عربی انسٹیٹیوٹ کا اقبال سیمینار بھی ایک مستقل اہمیت کا حامل قرار دیا جاسکتا ہے۔ میسور یونیورسٹی اور بمبئی یونیورسٹی نے اقبال پر لیکچروں کا اہتمام کیا۔ میسور یونیورسٹی کے لیکچر بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوئے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک اقبال سیمینار کا ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے ایک اور سیمینار 1986ء میں شعبہ فارسی کے زیر اہتمام اس یونیورسٹی میں منعقد ہوا۔ یہ ایک انٹرنیشنل سیمینار تھا جس میں پاکستان اور دوسرے ملکوں سے اقبال پر کام کرنے والے حضرات نے شرکت کی۔

یونیورسٹیوں میں اقبال چیئر کا قیام یقیناً ایک مستحسن قدم ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یونیورسٹی آف کشمیر کے علاوہ اور جن دو یونیورسٹیوں میں اقبال چیئر کا قیام عمل میں آیا ہے وہاں وہ محض برائے نام ہی ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی اور کلکتہ یونیورسٹی' ان دونوں یونیورسٹیوں

میں اقبال چیئر کے قیام کی خبریں اخبارات میں بڑے زور شور سے شائع ہوئی تھیں لیکن حقیقت یہ تھی کہ اردو کے پروفیسر کی پوسٹ کا نام اقبال چیئر رکھ دینے ہی پر اکتفا کی گئی تھی۔ کلکتہ یونیورسٹی میں کئی برس ہوئے اقبال چیئر کے لئے فیض صاحب منتخب ہوئے تھے' فیض صاحب کی زندگی میں یہ خبریں ہم لوگوں تک پہنچتی رہیں کہ وہ کلکتہ آکر اقبال چیئر کا عہدہ سنبھالنے پر رضامند نہیں ہیں۔ چنانچہ یہ عہدہ خالی رہا اور اب سنا ہے وہ موجودہ صدر شعبہ اردو کی پوسٹ ہی کا نام اقبال چیئر رکھ دیا گیا ہے۔

جہاں تک یونیورسٹی آف کشمیر کی اقبال چیئر کا تعلق ہے اس کی خصوصیت صرف یہی نہیں ہے کہ وہ واقعی اقبالیات سے متعلق کام کے لئے معرض وجود میں آئی بلکہ بعد میں اسی نے اقبال انسٹی ٹیوٹ کی صورت اختیار کی اور اسے یہ بھی ایک مقام امتیاز حاصل ہے کہ یہ دنیا بھر کی یونیورسٹیوں میں پہلی اقبال چیئر ہے۔ 1977ء کی بات ہے لاہور اور سیال کوٹ میں پہلی اقبال عالمی کانگریس منعقد ہوئی وہاں جنرل محمد ضیاء الحق نے جو اس وقت پاکستان کے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تھے ہم مندوبین کو گورنمنٹ ہاؤس لاہور میں چائے کی دعوت دی۔ وہاں باتوں باتوں میں راقم التحریر نے جنرل صاحب سے کہا کہ غالباً" یہاں پنجاب یونیورسٹی میں اقبال چیئر تو ہو گی' یونیورسٹی کے وائس چانسلر پر خیرات محمد ابن رسا بھی وہاں چائے پر مدعو تھے۔ جنرل صاحب نے ان سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا کہ آزاد صاحب کیا پوچھ رہے ہیں۔ وائس چانسلر نے جواب دی ابھی تک اس یونیورسٹی میں اقبال چیئر قائم نہیں ہوئی ہے۔ راقم التحریر نے کہا کہ گویا اس ضمن میں کشمیر یونیورسٹی بازی لے گئی کہ وہاں شیخ صاحب محترم نے اقبال چیئر قائم کر دی ہے۔ اس دعوت میں پاکستان کے شعراء' ادباء' نقادان اور محققین کے علاوہ اخبارات ریڈیو اور ٹی وی کے نمائندے بھی بڑی تعداد میں موجود تھے۔ چنانچہ دوسرے دن کے اخبارات میں یہ خبر بڑے اہتمام سے شائع ہوئی کہ کشمیر یونیورسٹی میں شیخ محمد عبداللہ کی بدولت اقبال چیئر قائم ہو چکی ہے لیکن پنجاب یونیورسٹی لاہور میں ابھی یہ چیئر قائم نہیں ہوئی۔ اس شام کو فیصل آڈیٹوریم میں جنرل ضیاء الحق نے انٹروڈکٹری سیشن کی صدارت فرمائی اور اپنی تقریر میں یہ اعلان کیا کہ ہم پنجاب یونیورسٹی لاہور میں اقبال چیئر قائم کر رہے ہیں۔ راقم التحریر کے بعض دوستوں نے ہنسی مذاق میں اس فیصلے کی مبارک باد راقم

التحریر کو دی۔

چنانچہ بہت جلد وہاں اقبال چیئر قائم ہو گئی جس پر ڈاکٹر جاوید اقبال کا تقرر ہوا لیکن ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی ہوا کہ جب تک جسٹس جاوید اقبال ہائی کورٹ میں جج رہیں گے ان کی جگہ پر پروفیسر مرزا محمد منور' پروفیسر اقبال چیئر کے طور پر کام کریں گے (جسٹس جاوید اقبال بعد میں پنجاب ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مقرر ہوئے اور اب وہ سپریم کورٹ کے جج ہیں)

اس کے بعد کیمرج یونیورسٹی میں حکومت پاکستان کے تعاون سے اقبال چیئر قائم ہوئی اور اس پر ڈاکٹر معز الدین کا تقرر ہوا۔ میونخ یونیورسٹی کی اقبال چیئر اس سلسلے کی جدید ترین کڑی ہے۔ جہاں اس وقت پروفیسر فتح محمد ملک اقبال پروفیسر کے طور پر کام کر رہے ہیں۔

حضرات پنجاب یونیورسٹی لاہور' کیمرج یونیورسٹی اور میونخ یونیورسٹی کی اقبال چیئر کے ذکر کی اس مقالے میں گنجائش نہیں تھی لیکن پنجاب یونیورسٹی لاہور کی اقبال چیئر کی بات چونکہ یونیورسٹی آف کشمیر کی اقبال چیئر سے چلی تھی اس لئے بر سبیل تذکرہ میں نے اس کا ذکر کر دیا ہے۔

میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ اقبال پر جو کتابیں یا مقالے ہندوستان میں لکھے گئے وہ چونکہ کسی نہ کسی صورت میں قارئین کرام کے سامنے ہیں اس لئے ان کا ذکر میں اس مقالے میں نہیں کروں گا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ دو باتوں کا ذکر ضروری ہے۔

ایک بات تو اقبال کے خاندان اور آبائی گاؤں کے متعلق ہے۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر سرزمین جموں و کشمیر کے اقبال شناسوں نے جو کام کیا ہے اور اپنی بحث میں جو جو سوال انہوں نے اٹھائے ہیں ان کی ادب اقبالیات میں بڑی اہمیت ہے اس ضمن میں غلام نبی ناظر' محمد یوسف ٹینگ' بی پی شرما' اکبر حیدری اور اوتار کرشن رہبر کا کام اس معیار کا ہے کہ ہم اس سے متفق ہوں یا نہ ہوں اسے نظر انداز کر کے ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہندوستان میں (اور پاکستان میں بھی) اقبال کے فکر پر جتنا کام ہوا ہے اس کے مقابلے میں اقبال کے فن پر بہت ہی کم کام ہوا ہے میری ناقص رائے یہ ہے کہ اقبال کو اگر ہم بطور شاعر کے نظر انداز کر دیں گے تو اقبال پر بحیثیت مفکر یا بحیثیت سیاست داں ہماری بات ادھوری رہے گی

اور فکر کی بات یہ ہے کہ ہم نے اقبال کی شاعری کو فلسفہ سمجھ لیا اور ان کے شعری مجموعوں ہی کو بنیاد بنا کر ان پر فلسفیانہ بحث کے انبار لگا دیے ہیں اور ان کے فلسفے کی کتاب

The Reconstruction of Religious thought in Islam

کو ہم فراموش کر گئے ہیں حالانکہ اگر ہم دیانت داری سے اقبال کے فلسفے کو سمجھنا چاہتے ہیں تو ہمیں

The Reconstruction of Religious .Thought in Islam

میں ڈوبنا پڑے گا۔ میں یہ عرض کرنے کی کوشش نہیں کر رہا ہوں کہ ہم نے مذکورہ کتاب کو زیب طاق نسیاں بنا کے رکھ دیا ہے ایسا نہیں ہے صرف اتنی بات ہے اس پر کام اقبال کی شاعری کے مقابلے میں بھی کم ہوا ہے۔ پاکستان میں بھی اور ہندوستان میں بھی۔ پاکستان میں غالباً" صرف تین مصنفین نے سنجیدگی سے اس کتاب کے مباحث پر قلم اٹھایا ہے۔ ان میں ایک ہیں خلیفہ عبدالحکیم ' دوسرے ڈاکٹر سید عبداللہ اور تیسرے ڈاکٹر محمد معروف ہندوستان میں بھی اس موضوع پر جہاں تک میرے محدود علم کا تعلق دو تین ہی اقبال شناس اہل قلم نے اپنی تحریروں میں بحث کی ہے مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے تو اس موضوع پر ایک کتاب جو ان کے اقبال انسٹی ٹیوٹ میں دیے ہوئے لیکچروں پر مشتمل ہے پیش کردی ہے دوسرے دو حضرات ہیں پروفیسر اسلوب احمد انصاری اور پروفیسر مشیر الحق اور اگر آپ اجازت دیں تو میں اس ضمن میں کانٹ ویل اسمتھ کا نام بھی لوں گا اگرچہ وہ ہندوستانی نہیں ہیں لیکن وہ ہندوستان میں رہے ہیں اور ان کی کتاب Modern Islam in India اور پھر اس کا نیا ایڈیشن Modern Islam in India and Pakistan جس میں اقبال کے فلسفے پر خاصی بحث موجود ہے' ہندوستان ہی میں چھپی ہیں یہ کتاب

Tbe Reconstruction of Religious Thought in Islam

کے ذکر سے بھی خالی نہیں۔ اور آخر میں یہ عرض کرکے اس بات چیت کو ختم کروں گا کہ اس مختصر سی فہرست میں ڈاکٹر معین شاکر کی کتاب From Khilafat to Partition کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔

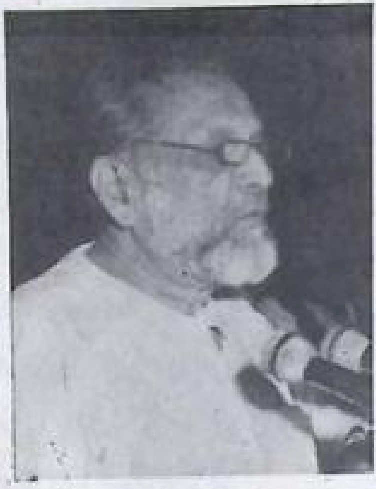

اشفاق احمد

اُردو میں سائنسی تعلیم

یہ مضمون میں آپ کی خدمت میں ایک پبلشر کی حیثیت سے پیش کر رہا ہوں جہاں فضل و دانش کا ذکر تو نہ ہو گا البتہ ایسی عملی اشارت ضرور میسر ہو گی جس سے آپ اب تک ناآشنا رہے ہیں۔ یہاں میں ان عملی مشکلات کا ذکر کروں گا جو ایک ایسے ناشر کی راہ میں حائل ہوئی ہیں جس نے اردو زبان میں سائنسی موضوعات پر اب تک سب سے زیادہ کتابیں شائع کی ہیں۔

اردو میں سائنس کی کتابیں تیار کرنے اور تیار کروانے میں سب سے بڑی مشکل اس بے یقینی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے جو ہم سب کے دلوں میں گھر کر چکی ہے کہ سائنس کی تعلیم انگریزی زبان کے علاوہ دنیا کی کسی اور زبان میں بالعموم' اور اردو میں بالخصوص دی ہی نہیں جا سکتی۔ ایک عام پڑھا لکھا آدمی بڑی ایمانداری کے ساتھ' گھر کے اندر اور گھر سے باہر' ہر وقت یہ محسوس کرتا ہے کہ انگریزی زبان ہی تانبے کا وہ موصل تار ہے جس سے سائنس کا کرنٹ دور تک پہنچ سکتا ہے۔ اس عام پڑھے لکھے سے میری مراد بی۔ اے پاس' اور کبھی کبھی ایم اے اور ایم ایس سی پاس نیک دل سرکاری افسر' بافراغت سیاستدان' کامیاب تاجر' اور بے فکر پختہ جاگیردار سے ہے جو اپنی سوچ میں سو فیصد

مخلص اور اپنے مشاہدے میں پوری طرح سے دیانت دار ہے۔

۱۹۵۱ء میں جب پہلی مرتبہ اٹلی پہنچا اور روم یونیورسٹی میں ایک لیکچرر کی حیثیت سے اردو کی تدریس کا سلسلہ شروع کیا تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ وہاں سائنس کے بھی ضروری مضامین اطالوی زبان میں پڑھائے جاتے تھے اور روم یونیورسٹی کے سائنس کے استادوں کو سوائے اطالوی کے اور کوئی زبان آتی ہی نہ تھی۔ چنانچہ دوسرے ہی مہینے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو کر میرے سامنے آگئی کہ چونکہ اٹلی میں سائنس اطالوی زبان میں پڑھائی جاتی ہے۔ اس وجہ سے یہاں کی نیٹ کار کا قد چھوٹا رہ گیا ہے ۔اگر کہیں یہاں بھی سائنس کی تعلیم انگریزی زبان میں ہوتی تو اٹلی کی گاڑیاں بھی Six Seater ویگن نما ہوتیں۔

آج سے چند سال قبل ہمارے ساہیوال کے ایک ڈپٹی کمشنر کو یہ سن کر بہت حیرت ہوئی کہ جرمنی میں سائنس جیسا اہم مضمون ' جرمن زبان میں ہی پڑھایا جاتا ہے حالانکہ جرمن لوگ کافی دلیر اور ذہین ہوتے ہیں۔ ان کے نائب تحصیلدار نے اس کوتاہی کی بڑی ادب سے وضاحت کی تھی کہ سرکار اسی وجہ سے تو جرمن جنگ ہار گیا اگر اس نے سائنس کا علم سائنس کی اصل زبان انگریزی میں پڑھا ہوتا تو کبھی بھی شکست نہ کھاتا اور اس وقت ساری دنیا پر راج کر رہا ہوتا۔

پچھلے سال جب ہم کوپن ہیگن میں تھے تو ہم نے ڈنمارک کی چیز (پنیر) حریص بچوں کی طرح کھائی شروع کی اور اپنے سات روزہ قیام میں چیز کی مختلف اقسام کے ساتھ ہی سوکھی روٹی کھاتے رہے۔ بانو قدسیہ کے لئے ڈینش ادیب دور دور سے "چیز" کے تحفے لے کر آتے رہے اور اپنے خلوص کا اظہار کرتے رہے۔ کوپن ہیگن میں بانو کی عید ہو گئی اور انہوں نے اعلان کر دیا کہ ڈنمارک سے بڑھ کر مزیدار پنیر دنیا کا کوئی اور ملک بنا ہی نہیں سکتا۔ اس شوق میں انہوں نے ڈنمارک کی چیز فیکٹری دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو مقامی ادیبوں نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ ' منٹوں سیکنڈوں میں چیز فیکٹری پہنچا دیا۔ بڑی بڑی مشینیں ' اونچے اونچے کولڈ سٹور ' تیز رفتار کمپریسروں کی گھرر گھرر چک چک آوازیں اور لیبارٹری میں عمل کیمیائی کے ماہر مرد عورتوں کے اجتماع نے بانو قدسیہ کو کچھ پریشان سا کر دیا۔

دوران گفتگو جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ اتنے سارے کیمسٹ اور ٹیکنالوجسٹ انگریزی بالکل نہیں جانتے تو انھوں نے بڑے دکھ سے کہا کہ میں بھی حیران تھی کہ ڈینش چیز سے کھٹی بو کیوں آتی ہے۔

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ اردو میں سائنس کی کتابیں تیار کروانے میں سب سے بڑی مشکل اس بے یقینی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے جو ہم سب کے دلوں میں گھر کر چکی ہے۔ کہ انگریزی کے علاوہ دنیا کی کسی اور زبان میں سائنس کی تعلیم دی ہی نہیں جا سکتی۔ اس طرح اس نظریے کے برعکس جو اصحاب سائنس کے علوم کو ملکی یا قومی زبان میں منتقل کرنے کے حق میں ہیں ان کا رویہ بھی بڑا غیر سائنسی بے حد جذباتی اور کافی حد تک شاعرانہ ہے۔ وہ بجائے اصل عمل کے محض لفظی بحث میں الجھ کر قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جس کام کو اب تک بہت آگے پہنچ جانا چاہئے تھا وہ ابھی تک اس طرح اپنی ابتدائی منازل کی الجھنوں میں گرفتار چلا آتا ہے۔ یہ حضرات اس سیدھے سادے بزرگ گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جس کا خیال ہے کہ اونٹ کی کوہان پر پلستر باندھنے سے اس کی کمر کا قب دور کیا ہو سکتا ہے۔ کاش یہ صاحبان یقین انجمن آرائی کی بجائے سائنسی کتابوں اور مسودوں کی تیاری پر توجہ دے کر نئے علوم سے اردو کو اور اردو جاننے والوں کو آشنا کر سکتے۔ لیکن ایسے ہو نہیں رہا کہ اس کی بھی بہت سی وجہیں ہیں۔

پہلی 'ایک عام' سیدھی سادی' سامنے کی وجہ تو یہ بیان کی جاتی ہے کہ اردو میں چونکہ سائنس کی مخصوص Technical Terms موجود نہیں ہیں اس لئے اس زبان میں سائنسی مواد فراہم نہیں کیا جا سکتا۔ ایک حد تک یہ وجہ معقول' منطقی اور جائز نظر آتی ہے اور ایک عام پڑھے لکھے انسان کو متاثر کرنے کے لئے بظاہر کافی مضبوط دکھائی دیتی ہے مگر حقیقت میں یوں نہیں ہے۔ جو لوگ سائنسی موضوعات پر اردو میں لکھتے ہیں۔ وہ اپنی تحریر میں بلا تکلف اردو کی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں اور اس کے آگے قارئین کی آسانی کے لئے ان کے انگریزی مترادفات بھی درج کرتے جاتے ہیں۔ چھاپتے وقت ہم نے بھی اس چلن کا خاص خیال رکھا لیکن نکتہ چینوں نے اس پر بھی یہ کہہ کر اعتراض کیا کہ جب انگریزی کی ایک طے شدہ اصطلاح اپنے صحیح تک سک کے ساتھ دنیا کے ہر

گوشے میں انجمن آراء ہے تو اردو میں اس کا ترجمہ کیا جانا ضروری ہے؟ وہی ٹرم اردو رسم الخط میں بھی بڑی آسانی کے ساتھ لکھی جاسکتی ہے۔ اور ہر کوئی اسے آسانی کے ساتھ اٹھا سکتا ہے۔ جب سٹیشن ریڈیو' موٹر' ٹیلیویژن' ڈیپ فریزر' ٹریفک' یونٹ' ہسپتال' جیسے ہزار ہا الفاظ ہمارے ذخیرہ الفاظ کا حصہ بن چکے ہیں تو انگریزی کی سائنسی اصطلاحات کیوں نہیں بن سکتیں۔ بات معقول تھی اور تسلیم کئے بغیر چارہ نہ تھا۔ سو کر لیا گیا لیکن یہ دعوئے جب لیبارٹری کے اندر لے جایا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ صاحبان قال کا دعوئے ہے جنہیں حال سے آگاہی نہیں ہے۔

دیکھئے! لفظ کرسٹل تو آسانی سے اردو میں لکھا جاسکتا ہے اس کی املاء بھی ٹھیک ٹھاک ہے' دیکھنے میں بھی خوبصورت نظر آتا ہے لیکن جب اس کی کرسٹلائزیشن ہوتی ہے اور آگے چل کر جب اس کو کرسٹلی فیکشن کے عمل سے گزرنا پڑتا ہے تو اس کی شکل و صورت میں سو سو بل پڑنے لگتے ہیں پھر جب اردو میں CRYSTALLOLUMISCENCE لکھنا پڑتا ہے تو ہر صاحب نظر رک کر ادھر ادھر دیکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے اس طرح جب ہمارے کاتب کو ایک مسودے میں چار بار یہ لفظ اردو املا میں لکھنا پڑا تو وہ مسودہ واپس کر گیا اور دو گولی اسپرو گرم چائے کے ساتھ لے کر گہری نیند سو گیا۔۔۔۔ تجربے کے بعد معلوم ہوا کہ جو لوگ سائنسی اصطلاحات کو من و عن اردو میں لے لینے پر اصرار کرتے ہیں وہ نہ سائنس سے واقف ہیں نہ اصول اصطلاحات سے اور نہ اردو زبان سے۔

اس کے بعد ایک اور گروہ ان معزز لوگوں کا ہے جو سائنسی اصطلاحات کے اردو ترجموں پر نہ صرف ہنستے ہیں بلکہ سائنس اور اردو دونوں کے عبرتناک انجام کی خبر ایک ساتھ دیتے ہیں۔ ان حضرات نے انگریزی سائنسی اصطلاحات کے اردو ترجموں کو دیکھا پرکھا تو نہیں ہوتا لیکن کسی ایک مثال کا سانتا پکڑ کر عامتہ الناس کو خواب خرگوش سے جگانے کا فریضہ سرانجام دیا کرتے ہیں۔ انہیں اردو اصطلاحات کے کئی لاکھ ترجموں سے صرف دو کے نام یاد ہوتے ہیں۔ ایک آلہ مکبرالصوت دوسرا مقیاس الحرارت اس کے بعد ان کی ہر طرح کی دلیل خاتمے کو پہنچتی ہے۔

جب ہم نے تین جلدوں میں سائنسی فرہنگ اصطلاحات شائع کی تو اس حلقے میں ہاہا کار مچ گئی کہ اردو اصطلاحات انگریزی اصطلاحات سے بھی مشکل ' پیچیدہ ' اور دقیق ہیں اور ان کو تحریر اور تقریر کی زبان میں کھپانا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ تقریباً" سبھی لوگوں کا خیال تھا کہ آسان ترین انگریزی اصطلاحات کو چھوڑ کر خواہ مخواہ عربی فارسی زدہ اصطلاحات کو اپنانے کا ڈول ڈالا گیا ہے جو ہم کسی بھی صورت میں قبول کرنے کو تیار نہیں۔۔۔۔۔۔ معترضین نے کہا کہ "برقی مقناؤ" کیسا بے ہنگم بے معنی اور بھاری بھرکم لفظ ہے جس کی ادائیگی بچے تو ایک طرف بڑے بھی آسانی کے ساتھ نہیں کر سکتے جبکہ اس کے مقابلے میں انگریزی کیسا آسان ' سادہ ' عام فہم اور ہلکا پھلکا لفظ Electromagnetisation موجود ہے۔ ایک صاحب نے فون کیا کہ آپ نے Monomerosomatous کا کیا جناتی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ میں نے کہا ڈکشنری اس وقت سامنے موجود نہیں ' اس لئے کچھ عرض نہیں کر سکتا ' انہوں نے کہا کہ میں خود عرض کئے دیتا ہوں ' آپ کی ڈکشنری میرے ہاتھ میں ہے اور میں تین روز سے اپنا خون کھولائے بیٹھا ہوں۔ آپ نے Monomerosomatous جیسے سیدھے سادھے لفظ کا اردو ترجمہ "یک جزی" کیا ہے۔ اب بتایئے کہ "یک جزی" کبھی سائنٹیفک ٹرم بن سکتی ہے۔ میں نے کہا "سر کیوں نہیں" تو فرمانے لگے اس قدر سادہ اور آسان اور بازاری ٹرم جس کا مطلب ایک جلد ساز بھی سمجھتا ہو کبھی سائنٹیفک ٹرم نہیں بن سکتی۔ سائنس ایک معزز اور معتبر علم ہے آپ دو دو ٹکے کے ڈرامے لکھنے والے اس کی ہیبت اور تبحر کو کیا سمجھیں۔ "یک جزی" جیسی لاغر ٹرم نکال کر اس کی جگہ کوئی سنائنسی ٹرم لائیں ورنہ چھوڑ دیں یہ کام۔

ابھی چند روز پیشتر ایک صاحب دفتر تشریف لائے اور بڑی بے تکلفی کے انداز میں کہنے لگے۔ اشفاق صاحب یہ جو آپ نے Metamorphosis کا ترجمہ "قلب ماہیت" کیا ہے تو کس قدر الجھانے والا اور غیر مانوس ترجمہ کر دیا ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ اس کی جگہ Metamorphosis ہی رہنے دیا جاتا۔ میں نے کہا "سر Metamorphosis کی املا اردو میں ذرا مشکل سی ہو جاتی اور کچھ غیر مانوس سی نظر آتی۔ بولے۔ بالکل نہیں ہرگز نہیں۔

م سے ے ث الف ٹائیٹا اور میم واؤ 'ر۔ مور۔ اور فسز= ف سین ززز۔۔۔۔۔ز۔۔
۔۔۔

میں نے کہا "سر اردو تحریر میں لکھا ہوا اچھا نہ لگتا۔" کہنے لگے واہ ایسا آسان اور خوبصورت لفظ اردو میں اچھا نہ لگے گا۔ آپ کمال کرتے ہیں۔ اردو کو Enrich کیجئے اردو کا دامن وسیع کیجئے۔ اس میں Metamorphosis جیسے الفاظ ـــــــ لایئے یقین کیجیے ـــــــ آپ کی اردو کو اس کی ضرورت ہے۔

میں نے کہا" سر آپ کا تعلق سائنس سے ہے یا لٹریچر سے؟ کہنے لگے میرا تعلق ان دونوں میں سے کسی کے ساتھ بھی نہیں' میں تو کھاریاں میں ٹھیکے دار ہوں۔ میں نے آٹھویں جماعت میں پڑھائی چھوڑ کر ٹھیکیداری شروع کر دی تھی۔ کیونکہ ان دنوں کھاریاں چھاؤنی بن رہی تھی۔ اب بڑا خدا کا فضل ہے آپ رکیں تا کبھی اسلام آباد جاتے ہوئے اور Matamorphosis کا لفظ ضرور اردو میں داخل کر کے آئیں۔ مجھے تو یہ لفظ بہت ہی اچھا لگا۔ اردو کو وسیع کیجیے۔ آپ کی اردو کو اس کی ضرورت ہے۔

اس طویل تمہید سے میرا مقصد آپ کو اس حقیقت کے قریب تر لانا ہے کہ سائنس کی تعلیم 'مذہبی' اخلاقی معاشرتی اور جغرافیائی تعلیم کی طرح اپنی زبان میں ہی ہو سکتی ہے۔ کسی دوسری زبان میں نہیں۔ کسی اور زبان کے ذریعے فراہم کی ہوئی سائنسی تعلیم سائنس پڑھانے کے تو کام آسکتی ہے سائنس پھیلانے سائنسی عمل عام کرنے میں مدد نہیں دے سکتی۔

آپ نے دیکھا ہو گا کہ پچھلے چھیالس برسوں میں ہم سائنس کے بہترین استاد اور پروفیسر تو پیدا کر سکے ہیں لیکن سائنس دان اور اعلیٰ ٹیکنالوجسٹ پیدا نہیں کر سکے۔ ہمارے یہاں تو سائنس کے بہت سے استادوں نے بڑے بڑے پیچیدہ علوم میں ڈاکٹریٹ تو حاصل کئے ہیں لیکن اس سے ان کے ملک کو یا ان کی قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکا۔ اصل میں سائنسدان اور ٹیکنالوجسٹ جب تک لیبارٹری اور معمل کے اندر بسیرا نہ کرے۔ سائنسدان نہیں بن سکتا اور لیبارٹری میں بسیرا کرنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ اس کا دماغ یکسوئی کے ساتھ مسئلہ کی کھوج میں لگا رہے۔ اور یکسوئی کے ساتھ مسئلہ کی کھوج اور

منزل کا سراغ اپنی زبان میں ہی ملتا ہے۔ کسی اور زبان کی گرامر کے نکات اور اس کے ذخیرہ الفاظ کی تلاش میں سرگرداں رہنے سے اصل مباحث گم ہو جاتے ہیں۔ اور منزل بالکل سامنے ہونے کے باوصف دسترس سے دور رہتی ہے۔

انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم اور ذریعہ اظہار نہ بنا کر لیکن اس کی تحقیقات سے فائدہ اٹھا کر جن ملکوں نے ہماری نظروں کے سامنے ترقی کی ہے ان میں جاپان کوریا اور تائیوان وغیرہ کے نام سر فہرست ہیں۔ یہاں کے دانش مندوں نے اپنی ساری قوم کو انگریزی پڑھنے پر نہیں لگایا۔ بلکہ ایک مخصوص گروہ کو اس کام پر مامور کیا ہے دانش گاہوں اور درسگاہوں میں ذریعہ تعلیم ملکی زبانیں ہیں اور تحقیق و تفتیش کا سارا کام انہی زبانوں میں ہوتا ہے۔ صرف اپنی آسانی کے لئے انہوں نے ھندسے اور ان کے ساتھ سائنس اور ریاضیاتی سمبل البتہ انٹرنیشنل یا انگریزی والے اختیار کر لئے ہیں باقی سب کچھ اپنی زبان میں ہے۔

چند سال پیشتر میں ان کے طریق کار کا قریب سے مطالعہ کرنے کے لئے جاپان گیا تو پتہ چلا کہ وہاں پر ہر بڑے شہر میں ایک دارالترجمہ اور ادارۂ فنون و علوم قسم کا دفتر قائم ہے۔ جہاں چاق و چوبند مترجموں کا ایک خرد مند اور روشن فکر گروہ ہر وقت سرگرم عمل ہے۔ جاپانی حکومت کی طرف سے دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں میں ایسے جاپانی دانشور بھیجے جاتے ہیں جو وہاں شائع ہونے والی سائنس اور ٹیکنالوجی کی کتابیں "کتابچے' پمفلٹ' مونو گراف' درس پارے روز کے روز خرید کر متعلقہ دارالترجمہ میں بھجواتے رہتے ہیں۔ جونہی یہ مواد ان اداروں میں پہنچتا ہے مترجمین اس کا خلاصہ جاپانی میں تیار کر کے فوراً سائیکلوسٹائل کرواتے ہیں اور پھر یہ سائیکلو سٹائیل نقلیں ان اداروں میں "سپیڈی پوسٹ" سے بھجوا دی جاتی ہیں جہاں متعلقہ موضوعات پر یا مصنوعات پر کام ہو رہا ہوتا ہے۔ پرانی' تجربہ یافتہ' کلاسیکی' جاپانی' کاریگری پر نئی غیر ملکی جانکاری کا اضافہ ایک نئے روپ میں ابھرتا ہے اور جاپانی مصنوعات دھڑا دھڑ منڈیوں میں پہنچنا شروع ہو جاتی ہیں۔

اگر ایسا ہو سکے کہ پاکستان کے دانش مند نوجوان اور با استعداد کاریگر اپنی ملکی زبان میں فنی تعلیم حاصل کر کے مختلف فیکٹریوں کارخانوں فنی اداروں اور معملوں میں مصروف

عمل ہوں ان کاریگروں کو تواتر کے ساتھ دنیا کے گوشے گوشے سے نئی ایجادات اختراعات اور مفروضات کا تازہ بہ تازہ اور نو بہ نو علم ان کی اپنی زبان میں ان تک پہنچ رہا ہو اور وہ اس مواد کو اپنے تجربات کی روشنی میں چھان پھٹک کر اپنی مصنوعات اور اپنی اختراعات کو ایک نیا رخ دے رہے ہوں۔ زندگی کے رشتے سے سائنس کا عمل جاری ہو اور سائنس ثقافت کی شکل میں پھیل رہی ہو تو کس قدر اچھا ہو!۔۔۔۔ لیکن اگر ایسا ہو سکے تو!!

لیکن ہم ایسا کر نہیں سکتے کہ ہم مجبور ہیں۔ ہمارے سیانے ایک ہی راگ الاپ رہے ہیں کہ سائنس کی تعلیم سوائے انگریزی کے اور کسی زبان میں دی ہی نہیں جا سکتی۔

آج سے کوئی چار سو برس پہلے دنیا کا مشہور سائنس دان نیوٹن بھی اس خیال کا حامل تھا کہ سائنس کی تعلیم سوائے لاطینی زبان کے اور کسی زبان میں دی ہی نہیں جا سکتی اس کا خیال تھا کہ سائنس اور ریاضیاتی موضوعات کے لئے انگریزی زبان نہ صرف ناقص ہے بلکہ وہ سائنس کے دقیق مسائل کی کسی بھی صورت میں متحمل نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اس نے اس فلسفے کے پیش نظر بہ امر مجبوری' اپنی ساری کتابیں لاطینی میں لکھیں اور اسی زبان میں شائع کیں۔

میں نیوٹن کا سا دماغ اور اس جیسا خیال رکھنے والے اپنے ہم وطنوں سے جھگڑا تو نہیں کر سکتا البتہ ایک درخواست اور چھوٹی سی عرضداشت پیش کرنے کی جرأت ضرور کر سکتا ہوں کہ "اصلی اور وڈھی" سائنس کو تو بھلے آپ انگریزی میں ہی رہنے دیں لیکن ٹیکنالوجی کے بنیادی اصولوں اور اس میں در آنے والی نئی نئی ایجادات اور اختراعات کو اردو میں منتقل کرنے کی اجازت دیدیں تاکہ وہ لوگ جو نسلوں سے اپنے اپنے پیشے اور اپنی اپنی حرفت کے ساتھ وابستہ ہیں وہ متعلقہ موضوعات میں ہونے والی نئی ایجادوں اور نئے رویوں سے واقفیت حاصل کر سکیں۔ اس وقت سیالکوٹ کے علاقے میں کھیلوں کا سامان بنانے والے کاریگر اردو زبان میں لیکس اور سینتھیٹک ربڑ اور چیپیدوں یعنی Adhesives کی تفصیلات اور ان کے فارمولے جاننے کے لئے تڑپ رہے ہیں۔ گوجرانوالہ کے کاریگر اردو زبان میں فولاد پر عمل حرارت' منی موٹرز کی آرمیچر وائنڈنگ' بلینڈرز' چاپرز اور جوسر وغیرہ کے بلیو پرنٹ اور آڈیو ویڈیو ہیڈز کی تفصیلات اردو زبان

میں جاننے کے بڑی دیر سے خواہشمند ہیں۔ اس طرح گجرات، وزیر آباد میں میڈیکل کے آلات بنانے کو کچھ صاحب نظر اور تجربہ کار مستری موجود ہیں لیکن وہ تمام معلوماتی مواد اردو میں مانگتے ہیں۔ پھر ہمارے لاہور میں کچھ ایسے مڈل پاس اور انڈر میٹرک کاریگر موجود ہیں جو الٹرا سانک اور لیزر مشینوں کی کارکردگی اور کارگزاری کو اپنے خاندانی اور موروثی دانش کے زور پر سمجھ تو بیٹھے ہیں لیکن انگریزی نہ جاننے کی وجہ سے اردو میں ایسے لٹریچر کے متمنی ہیں جو ان کو متعلقہ مشینوں کے بنیادی اصولوں سے آشنا کر کے ان کی سوچ کو صاد کرے یا اس کے بطلان کرے۔ لیکن اردو میں ایسا لٹریچر کہیں بھی دستیاب نہیں انگریزی کی اعلیٰ پائے کی کتابیں درسگاہوں اور دانشگاہوں میں ضرور موجود ہیں لیکن وہاں کے استاد اور طالبعلم صرف تھیوری جانتے ہیں ان میں نہ تو مستریانہ صلاحیت موجود ہے نہ ہی انہوں نے کبھی ہاتھ سے کوئی کام کیا ہے۔ ڈگریاں ان کے پاس اعلیٰ درجے کی موجود ہیں یہاں کی بھی اور باہر کی بھی، اور علم بھی ان کے پاس پورا ہے۔ اور وہ لوگ ہیں بھی لائق لیکن خیر نہیں پڑ رہی۔ نہ خود کو، نہ گھر والوں کو نہ ہم وطنوں کو۔

فرض کیجئے تجربے کے طور پر اگر ہم اردو میں سائنس کی تعلیم بہم کر کے اس کے نتائج دیکھنے کے متمنی ہیں تو ہمیں ایک لیبارٹری ٹیسٹ سے گزرنا پڑے گا۔ میں سمجھتا ہوں اس کام کی ابتدا ہمارا میزبان شہر کر سکتا ہے۔ اگر اس کانفرنس کے بعد ڈی سی صاحب اپنے محدود ذرائع میں رہ کر یہاں ایک دارالترجمہ کی بنیاد ڈال سکیں اس دارالترجمہ میں چھ سات وقف وفا اور فدائی قسم کے مترجمین جمع کر سکیں تو یہ اکیلا مرکز سارے ملک کی تیکنیکی طلب اور فنی معلومات پوری کرنے کو اسے جاپان کوریا تائیوان کی نہج پر ڈال سکتا ہے۔ ملتان کا دارالترجمہ دنیا بھر میں ہونے والی نئی نئی اختراعات، ایجادات اور عملی دریافتوں کے اردو ترجمے ڈایا گراموں، عملی نسخوں، فارمولوں، اور ٹیکنیکل نقشوں کی صورت میں سائیکلوسٹائل اور فوٹو کاپی کر کے ان اداروں کے کاریگروں کو بھجوا سکتا ہے۔ جو انگریزی زبان سے ناآشنائی کی بنا پر ابھی تک اپنے اپنے فنون کی پہلی سیڑھی پر ہی بیٹھے ہیں، مجھے یقین ہے کہ عمل کی دنیا سے وابستہ یہ کاری گر اور تجربہ کار لوگ اپنے جدی علوم کو نئی دریافتوں کا پیوند لگا کر دنیائے سائنس میں انقلابی قدم اٹھا سکتے ہیں۔ اور اپنی

بدیمہ سازیوں سے ساری دنیا کو مستفید کر سکتے ہیں۔ کسی درسگاہ ' دانشگاہ ' وزارت یا کسی کنج سیاست کو مشکل میں ڈالے بغیر اس ادارے کی ایک سالہ کارکردگی سے بڑا واضح اور عملی ثبوت مل جائے گا کہ اردو زبان میں فنی اور تیکنیکی آموزش ہو سکتی ہے یا نہیں۔ ارفع سائنس کا علم عطا کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ کیا جا سکتا ہے تو کس قدر اور نہیں عطا کیا جا سکتا تو کیوں نہیں!

میں نے اس کام کے لئے ملتان کو یوں منتخب کیا ہے کہ سائیں اور سائنسٹ دونوں ہی ترجمہ اور انہماک کے طالب اور اپنی رو کے بھگت ہوتے ہیں اور اس کی اساس صرف مشاہدے اور مراقبت پر ہوتی ہے۔ ملتان اگر سائیں پیدا کر سکتا ہے تو سائنس دان پیدا کرنے کا مقام بھی یہی ہے۔ کسی بڑی درگاہ سے ایک "دارالترجمہ لیبارٹری" جیسی اور اسی طور پر وابستہ کر دیجئے ' ابن سینا ' جابر بن حیان ' البیرونی ' اور ابن الہیثم خود بخود پیدا ہونے لگیں گے۔ اور ہمارے علوم کی گم شدہ کنجی صدیوں کے ڈھیر سے پھر برآمد ہو جائے گی۔

پروفیسر پریشان خٹک

اردو۔ قومی رابطے کی زبان

دنیا بھر کے ماہرین زبان دانی اور اس امر پر متفق ہیں کہ اردو زبان کی ماہیت اور صلاحیت ناقابل یقین حد تک جاذب اور وسعت پذیر ہے۔ یہ زبان خصوصی طور پر برصغیر کے ہر اس خطے کو راس آئی جو براہ راست عرب حاملین اسلام سے فیض یاب ہوا یا بالواسطہ طور پر اسلامی تہذیب وتمدن سے متاثر ہوا۔ بلوچستان، سندھ، پنجاب اور سرحد پر جب تک سلطنت دہلی کی گرفت تھی۔ فارسی زبان و ادب بزعم خویش مسلط کی جاتی رہی۔ لیکن جونہی برصغیر انگریز سامراج کے قبضے میں بتدریج آتا گیا تو ہر خطے کے مسلمانوں کو اور خصوصی طور پر ان مسلمانوں کو جو انگریزوں کی آمد سے پہلے برصغیر کے مختلف خطوں پر حکمران اور فرماں روا تھے۔ ایک دوسرے سے وابستگی اور باہمی تعلق کا احساس شدت کے ساتھ ہونے لگا۔ چنانچہ ہوا یوں کہ انگریزوں کی برصغیر میں آمد کے ساتھ ہی عصری تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اس وقت کے ادباء محققین اور زبان دان اردو کی جانب متوجہ ہوئے۔ کیونکہ یہی برصغیر کے مسلمانوں کی وحدت ملی کی مظہر اور ان کے ربط باہمی کی ضامن تھی۔

اہالیان برصغیر کا بلکہ ان علاقوں کے لوگوں کا جو اب پاکستان کا حصہ ہیں۔ اردو زبان کی طرف مائل ہونا صرف اس زبان کے اساسی مزاج ہی کے باعث نہ تھا بلکہ ان علاقوں کے

لوگوں کا مزاج بھی لسانی تغیر کے لئے برصغیر میں سب سے زیادہ موزوں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان علاقوں کے لوگوں کی کثیر اللسانی انہیں برصغیر کے دوسرے علاقوں سے ممیز کرتی ہے اور جہاں ان کی اپچ اور ذہانت کی مظہر ہے وہاں برصغیر جیسے مختلف اللسان خطہ ارض میں ان کی انفرادیت کی بھی غماز ہے۔ لہٰذا ان علاقوں کے لوگوں کے لئے اردو کو اپنا لینا قطعی مشکل نہ تھا۔

اگر ہم لسانی اعتبار سے ارض وطن کا جائزہ لیں تو احساس ہوگا کہ یہاں کے مختلف علاقوں میں بیک وقت کئی کئی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ صوبہ سرحد میں پشتو ھندکو اور فارسی زبانیں باقاعدہ طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ بلوچستان میں بلوچی براھوی اور پشتو زبان بولنے والے کثیر تعداد میں ملتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ سندھی اور سرائیکی بھی بولی جاتی ہیں۔ سندھ میں سندھی کے ساتھ ساتھ سرائیکی بھی زیادہ تر لوگوں کے لئے بولنا اور سمجھنا چنداں مشکل نہیں۔ پنجاب میں پنجابی کے ساتھ ساتھ سرائیکی' پوٹھواری کشمیری رو ہتکی لہجے بھی یکساں طور پر بولے جاتے ہیں۔ کشمیر میں کشمیری کے ساتھ ساتھ ذیلی علاقوں کے لہجے بھی اپنا بھرپور اثر رکھتے دکھائی دیتے ہیں۔ شمالی علاقہ جات میں بلتی' شینا چترالی وغیرہ کے ساتھ ساتھ ملحقہ علاقوں کی زبانیں بھی بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان علاقوں کے لوگوں میں یہ حیرت انگیز صلاحیت ہے کہ بیک وقت دو یا دو سے زیادہ زبانیں بولنے اور سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اس لئے ان کے لئے ایک ایسی زبان کو اپنا لینا جو ان کے لئے لاتعداد وجوہ کی بناپر محض اجنبی نہیں ہے' چنداں مشکل نہیں۔

اردو زبان کی ہمہ گیریت اس کی ہیئت ترکیبی میں واضح طور پر نظر آتی ہے۔ ملک بھر کے جید اھل علم اور اھل نظر حضرات کی موجودگی میں کیا عرض کروں کہ اردو میں دوسری زبان کے الفاظ من و عن اپنا لینے کی صلاحیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اس کے بیشتر الفاظ مختلف زبانوں ہی سے لے کر اردو کا جزو صمیم بنا دیے گئے ہیں۔ فارسی عربی ترکی انگریزی اور دوسری بڑی زبانوں کا تو ذکر کیا۔ ہماری علاقائی زبانوں کے ہزارہا الفاظ اردو زبان کا باقاعدہ حصہ ہیں۔ میں نے اس موضوع پر خاصی تحقیق بھی کی ہے اور انہی موضوعات پر میری تحقیقی کتابیں یقیناً" آپ جیسے دانشوروں کی نظروں سے بھی گزری ہونگی۔ میں نے اپنی تحقیق میں برملا طو

پر یہ امر منظر عام پر لانے کی سعی کی ہے کہ پاکستان کی علاقائی زبانوں ' پنجابی ' سندھی ' پشتو ' بلوچی ' براہوی ' سرائیکی ' کشمیری بلتی شینا وغیرہ کے لاتعداد الفاظ ایسے ہیں جو ہم اردو میں بھی انہی معنوں میں بولتے ہیں جن معنوں میں علاقائی زبانوں میں بولے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی سندھی کسی پشتون یا پنجابی کے ساتھ بات کرتا ہے تو وہ بلا جھجک اردو میں بات کرتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کی اپنی زبان میں گفتگو کرنے سے اس کے مخاطب کے پلے کچھ نہیں پڑے گا۔ یہی حال دوسری علاقائی زبانوں کا ہے۔ آپ پاکستان کے کسی بھی خطہ زمین پر چلے جائیں اور آپ ان کے علاقے کی زبان سے یکسر نابلد ہوں۔ آپ بغیر کسی تردد کے اردو میں بات کریں آپ کی بات یقینی طور پر سمجھی جائے گی۔ نہ صرف گفتگو بلکہ تحریر کی صورت حال اس سے بھی دوچند ہے۔ پاکستان کے کسی بھی دور افتادہ علاقے میں بیٹھ کر کسی بھی دوسرے علاقے میں اگر خطوط لکھے جاتے ہیں تو محض اردو ہی کا سہارہ لیا جاتا ہے اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ اردو کو پڑھنے اور سمجھنے والے ہر علاقے میں بکثرت دستیاب ہوتے ہیں۔ گویا وطن عزیز میں اردو زبان کا مقام قومی رابطے کی زبان کی حیثیت سے مسلمہ ہے نہ کوئی اس امر واقعہ کو جھٹلا سکتا ہے۔ اور نہ ہی اس واضح حقیقت سے روگردانی کر سکتا ہے۔ کیونکہ میرا ایمان ہے کہ اگر ہم اردو کی مسلمہ حیثیت کو پس پشت ڈالتے ہوئے کوئی اور راستہ اختیار کرنے کا خیال بھی دل میں لائیں تو یہ اقوام پاکستان کی یکجہتی یگانگت اور علاقائی تعلقات کے خلاف ایک سازش کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہوگا۔ ہمیں چاہیے کہ ہم پاکستان کے اتحاد اور استحکام کو مزید تقویت دینے کے لئے اردو کی ترویج کے لئے اپنی تمام تر صلاحیتیں صرف کردیں تاکہ پاکستان کے تمام تر علاقوں کے لوگ آپس میں قریب تر ہو سکیں۔ اور ان میں مقصد تشکیل پاکستان اور ملکی تعمیر و ترقی کا جذبہ اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ اجاگر کیا جا سکے۔

maablib.org

ڈاکٹر عرش صدیقی

اردو کے لئے انگریزی کی ضرورت

اردو اور انگریزی الگ الگ لسانی خاندانوں سے تعلق رکھنے کے باوجود ارتقاء اور پھیلاؤ کے عمل میں ایک دوسرے سے حیران کن حد تک مماثل ہیں ان دونوں زبانوں کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ آغاز سے ان کی تشکیل و تعمیر میں بہت سی زبانوں نے اہم کردار ادا کیا ہے' یوں تو جدید دنیا کی کوئی بھی ترقی یافتہ زبان ایسی نہیں جس نے بعض دوسری زبانوں سے کچھ نہ کچھ اثر نہ لیا ہو۔ لیکن جو صحت اردو اور انگریزی کی ہے اس کی مثالیں یہ آپ ہیں' اردو زبان پر برّصغیر کے اندر اور باہر کی جن زبانوں کے اثرات ہیں انہیں ہم نے قبول کیا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد ہماری اردو میں ایرانی اور عربی زبانوں کے اثرات کا بوجوہ اضافہ نظر آتا ہے' بھارت میں صورت حال کو اس کے برعکس مستحکم کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن وہ تبدیلی جو ہندی میں آسکی اردو اسے قبول نہیں کرسکی جس کی بڑی وجہ اردو کا عربی رسم الخط ہے اردو میں آغاز سے اب تک مسلسل تبدیلی آ رہی ہے' اس عمل کو روکنے کی کوششیں بھی کی گئیں لیکن یہ ممکن ہی نہیں کہ زبان کو زندہ بھی رہنا چاہئے اور تبدیلی سے محفوظ بھی رہے اور جامد ہو کر بیٹھ رہے۔ اگر زبان کو بدلتی ہوئی معاشرتی صورت حال اور میل جول میں آنے والی دوسری زبانوں سے بچا کر رکھنے کی

کوشش کی جائے تو زبان پہلے جامد اور پھر مردہ ہوجاتی ہے زبان کو اس حالت تک ہمیشہ تنگ نظری کا وہ رویہ پہونچاتا ہے۔ جو زبان کی طہارت اور دوسری زبانوں سے اختلاط سے تحفظ پر اصرار کرتا ہے۔ اس قسم کا پیوری ٹن رویہ جہاں بھی دنیا میں رائج ہوا اس نے سوائے ترقی کی راہ مسدود کرنے کے اور کوئی کام نہیں کیا۔ چند برس پہلے جو زبان کے پیوری ٹن علماء اردو میں "اشک" اور "آنسو" کے ہوتے ہوئے "اتھرو" اور "ہنجو" کے استعمال پر غصہ سے کہتے تھے کہ اردو کا چہرہ اوادنا" مسخ کیا جا رہا ہے اور جو حضرات اپنے مبلغ علم کو ہندی' فارسی عربی الفاظ کو اضافت سے ملانے سے روکنے پر صرف کردیتے تھے ہیں تو اب بھی پرانی روش پر' لیکن خاموش ہیں کہ ارتقاء کی حقیقتوں نے انھیں غلط ثابت کردیا ہے۔ جو لفظ بھی اردو میں آگیا وہ کسی بھی زبان کا ہو اسے اردو میں رائج کسی بھی دوسرے لفظ سے اضافت سے ملانا درست ہے۔

پیوری ٹن رویے پر اصرار کرنے والے لوگوں نے ایک عرصہ اردو اور علاقائی زبانوں کے میل جول پر سخت اعتراض کئے۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن ڈراموں نے اردو میں علاقائی زبانوں کو جس طرح ملانے کی کوشش کی وہ قابل تعریف ہے' زبانوں کے ارتقاء میں طہارت کا نظریہ بے معنی ہوتا ہے ہم سنسکرت کا حال دیکھ چکے ہیں۔ قدیم زبانوں میں سے صرف عبرانی ہی ایک ایسی زبان ہے جو آج بھی زندہ ہے اس کی کئی وجوہات ہیں۔ اس زبان کو بولنے والوں نے اسے بہت ملکوں میں تقسیم ہوجانے کے باوجود اپنے محدود حلقے میں زندہ رکھا اور پھر موقع پاتے ہی اسے اپنے ملک کی سرکاری زبان بنا دیا اور پیوری ٹن رویے کو زبان اور قوم کی معاشرتی ترقی میں رکاوٹ نہیں بننے دیا۔ جس طرح عبرانی نے اپنے آپ پر دنیا بھر کے سائنسی علوم کے دروازے کھول دیئے اس کے بعد یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ عبرانی زبان دوسری زبان سے اثرات نہیں لے رہی ـــــ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں لوگ انگریزی زبان کے الفاظ کے استعمال سے گریز پر ضد کرتے ہیں اور عربی فارسی الفاظ کو قبول کرتے ہیں لیکن خود عربی اور ایرانی نے لاتعداد انگریزی اور فرانسیسی اور بعض دوسری زبانوں کے الفاظ کو بلا تامل قبول کرلیا ہے اور انھیں معرب اور مفرس کرکے اپنی زبان کا مستقل حصہ بنا لیا ترکوں نے تو عرصہ ہوا پیوری ٹن رویے کو

مکمل طور سے ترک کر دیا تھا۔ ہمارے ہاں عملاً یہ رویہ مسلسل شکست سے دو چار ہے پھر بھی بار بار سر اٹھاتا رہتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارے ہاں خرد دشمنی کا رویہ شاعری اور پورے ادب میں ہی نہیں۔ بلکہ پوری معاشرتی زندگی میں ہی صدیوں سے حاوی چلا آ رہا ہے۔ اور ان حقائق کو بدلنے اور تسلیم نہ کرنے پر مصّر ہے جنہیں نہ بدلا جاسکتا ہے نہ جلد یا بدیر تسلیم کئے جانے سے روکا جاسکتا ہے۔ اس رویّے کے مستحکم ہونے کی بہت سی وجوہات ہیں جن کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں۔

اردو زبان بار بار کھڑی کی جانے والی رکاوٹوں کے باوجود انگریزی زبان سے اثر لے رہی ہے۔ ادھر انگریزی زبان گذشتہ ایک ہزار سے زیادہ برس سے مسلسل اپنے ذخیرہ الفاظ میں خوشدلی کے ساتھ دوسری زبانوں کے زیر اثر اضافہ کئے چلی جا رہی ہے اور اس سلسلہ میں اس نے برصغیر کی زبانوں سمیت دنیا کی کسی بھی زبان پر اپنے دروازے بند نہیں کئے۔ اردو زبان کے مزاج میں' اس کی ساخت اور اس کی بنیاد میں وہ توانائی اور انجذاب کی وہ قوت پوری طرح موجود ہے جو انگریزی زبان سے ایک ہزار برس سے زیادہ عرصہ سے خاص چلی آ رہی ہے۔ انگریزی نے اس توانائی سے فائدہ اٹھایا ہے اور اس سلسلہ میں باقاعدہ منصوبہ بندی سے بھی کام لیا ہے جبکہ اردو کو' انگریزی زبان کو مردود قرار دینے والوں کی ضد کی وجہ سے پھلنے پھولنے کا موقع کم ملا ہے۔ دراصل انگریزی کے بارے میں ابھی تک ہمارے ذہن صاف نہیں ہوئے برصغیر میں انگریزی تسلّط سے نفرت کو انگریزی زبان سے نفرت میں بدلنا ایک وقت تک فطری اور درست تھا لیکن اب عالمی صورت حال اتنی بدل چکی ہے کہ ہمیں اپنے تعصبات پر نظر ثانی کی اشد ضرورت ہے۔ انگریزی زبان کی عالمی حیثیت سے اب انکار ممکن نہیں ہے اسے نظر انداز کرنے میں ہمارا نقصان ہی نقصان ہے۔ ہمارے ہاں کچھ سمجھدار گروہوں نے اس نکتے کو سمجھا ہے اور انگریزی زبان سے حاصل ہونے والے فوائد کو اپنے کنبوں کے لئے مخصوص کر کے عوامی سطح پر انگریزی کے خلاف پہلے سے موجود نفرت میں شدت پیدا کی ہے اس گروہ نے پوری قوم کو انگریزی زبان سے نفرت کا سبق ازبر کرا دیا ہے اور کامیابی کے ساتھ دیا ہے اور پھر تعلیمی نصاب کی ہر سطح پر انگریزی زبان کا جو حال انہوں نے کیا ہے اس کے سوائے

نقصان کے کچھ حاصل نہیں۔ خود دشمنی کا رویہ تو ہمارے ہاں پہلے سے رائج تھا۔ پھر منافقت کو اس طور معاشرے میں مستحکم کیا گیا کہ اب یہ بھی ہماری قومی خصوصیت معلوم ہوتی ہے سمجھدار با اثر لوگ اپنے بچوں کو انگریزی کی تعلیم دلواتے ہیں۔ ان میں بہت سے دینی علماء کے بچے بھی شامل ہیں' لاکھوں روپے سالانہ خرچ پر بچوں کو امریکہ تعلیم کے لئے بھیجتے ہیں۔ لیکن یہ سب لوگ اپنی تقریروں میں مضامین میں 'اخباری کالموں میں' مذاکروں میں 'انگریزی زبان سے نفرت کے جذبے کو مسلسل ہوا دیتے رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں ہر سطح پر انگریزی میں فیل ہونے والے طالبعلموں کی ہوشربا تعداد کو وہ اس زبان کے مشکل ہونے کا ثبوت قرار دیتے ہیں حقیقت میں ایسا نہیں ہے انگریزی میں فیل ہونے والی طلبہ کی کثیر تعداد کا سبب یہ ہرگز نہیں کہ یہ کوئی مشکل زبان ہے بلکہ یہ ہے کہ نفرت کی مضبوط دیوار درمیان میں حائل ہے اور نفرت ہو تو کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔ ہمارے ہاں انگریزی زبان سے نفرت کا دباؤ صرف عوامی سطح پر ہے اور بہت شدید ہے اوپر کے طبقے آزاد ہیں راہ نمایانِ قوم اور اوپر کے طبقے عوام کو حقیقتِ حال سے غافل رکھتے ہیں اور ان کی غفلت کو اپنے لئے نعمت سمجھتے ہیں۔

ایک بات آغاز ہی میں واضح طور سے کہتا جاؤں کہ پاکستان میں دفتری زبان کے طور پر اردو کے استعمال میں مجھے کوئی دشواری نظر نہیں آتی سوائے ان خود غرض لوگوں کی بددیانتی کے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ انگریزی ہمیں کس حد تک جاننا چاہئے یہ سوال اس کے بعد کا ہے ـــــ ہمیں معلوم کرنا ہے کہ کیا ہمیں کسی بین الاقوامی زبان کی ضرورت ہے! ہے تو کس زبان کی اور کس حد تک؟ تاریخ کے ایک ناخوشگوار دور کی وجہ سے اتفاقاً" انگریزی پورے ملک میں رائج ہے اور چند علاقوں کے استثنیٰ کے ساتھ پرائمری سے اوپر کے درجوں میں بی اے۔ بی ایس سی تک ایک لازمی مضمون کے طور پر نصاب میں شامل ہے۔ لیکن ان طویل برسوں میں ایک طرف تو اساتذہ یہ زبان نہایت بے دلی سے پڑھاتے ہیں اور ساتھ ساتھ انگریزی زبان سے نفرت کا جذبہ بھی ابھارتے رہتے ہیں۔ اس صورت حال میں انگریزی زبان میں طالب علموں کی دلچسپی بہت کم ہو جاتی ہے اور اس زبان کو ایک مصیبت سمجھا جاتا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ ہم نے نہ تو خود سوچا

ہے اور نہ طالب علموں کو سمجھایا ہے کہ ہمیں انگریزی زبان کی ضرورت ہے اور ہمیں یہ سمجھنا چاہئے کہ آج ہر ملک کو ایک بین الاقوامی زبان کو ثانوی زبان کے طور پر ضرورتاً اختیار کرنا لازمی ہے۔ ہمیں انگریزی کا حصول مشکل نہیں کیونکہ یہ اتفاق سے پورے ملک میں پہلے ہی بطور ثانوی زبان کے بلکہ بعض صورتوں میں بطورِ اولیّن زبان کے رائج ہے۔ اب اگر ہمیں انگریز سے نفرت کی وجہ سے انگریزی کو ترک کرنا ہے تو پھر کونسی زبان ہے جسے ہم بین الاقوامی زبان کے طور اپنا سکتے ہیں ایسی کوئی زبان نہیں۔ ہر نئی زبان کو قومی سطح پر سیکھنے سکھانے کا عمل بہت دشوار ہوگا۔ اس لئے جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں ہمیں اپنے تعصبات پر نظر ثانی کرنا چاہیے اور انگریزی سے نفرت جاری رکھنے کی بجائے اسے اپنی اشد ضرورت سمجھتے ہوئے خوشدلی سے سیکھنا چاہئے۔ ایک بار رویّے میں مثبت تبدیلی آجائے تو اس مضمون میں فیل ہونے والے طلبہ کی تعداد بہت کم رہ جائے گی۔ ہمارا مقصد انگریزی زبان بجائے خود نہیں ہے بلکہ اس زبان کو اپنی بہت سی ضرورتوں کی تکمیل کا ذریعہ بنانا ہے؟ جو کام ہم اس زبان سے لے سکتے ہیں وہ نہ اردو سے لئے جاسکتے ہیں نہ دنیا کی کسی اور زبان سے۔

یقیناً" ہمارا ایک تعلیم یافتہ طبقہ ایسا بھی ہے جو انگریزی کی اردو کے لئے اور پاکستان کے لئے ضرورت کو محسوس کرتا ہے۔ اس طبقہ میں کچھ سیاستدان ' یونیورسٹی اور کالج اساتذہ ' اردو کے نقاد اور محقق ' لغت نویس وغیرہ شامل ہیں۔ یہ لوگ جانتے ہیں کہ بالآخر قوم انگریزی کی ضرورت کو محسوس کرے گی۔ یہ لوگ بساط بھر اس دن کے لئے کام کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ خرابی در اصل یہ ہے کہ یہ لوگ بھی عوام کے دلوں میں راسخ انگریزی زبان سے نفرت کو ختم نہیں کرسکتے۔ اس صورت کو وہ لوگ مزید خراب کر رہے ہیں جو انگریزی زبان کو تضحیک کا نشانہ بناتے ہیں۔ آج کل ان کے سرخیل اشفاق احمد ہیں ۔ اشفاق احمد کو اردو سائنس بورڈ کا ڈائریکٹر بنایا گیا۔ ان کی ذہانت اپنی جگہ لیکن یہ کام ان کے سپرد کرنا مناسب نہ تھا۔ بہرحال گلے میں پڑا ڈھول انہوں نے ذہانت کے ساتھ بہت مزے لے لے کر بجایا۔ انہوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں قطعاً" غیر سائنسی رویہ اختیار کرتے ہوئے بہت سے نئے پرانے اور کچھ خود گھڑے ہوئے لطیفوں کی مدد سے عوام

کے لئے دلچسپ بنایا۔ ان کی ان لطیفوں سے پُر باتوں کو قوم نے دلچسپی سے سنا اور تالیاں بجائیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ عرصہ سے ہمارے راہ نما اور سیاستدانوں نے قوم کو صرف دلچسپ باتیں سن کر تالیاں بجاتے رہنے کی تربیت کے سوا دیا ہی کچھ نہیں ادھرٹی وی ڈراموں کو بھی حکومتوں نے اسی مقصد میں قید کرنے کی کوشش کی۔ ارفع سنجیدگی کا اس کے عمومی پروگراموں میں فقدان رہا ہے۔ سنجیدگی جہاں نظر آئی مصنوعی لگی۔ زیادہ توجہ اس پر رہی کہ پروگرام دلچسپ ہوں اور عوام تالیاں بجاتے رہیں۔ ان لوگوں نے سن لیا تھا کہ حسِ مزاح کو زندہ رہنا چاہئے سو انہوں نے موقع بے موقع سستے مذاق اور جگت بازی اور "مخول ٹھول" کو ہی سب کچھ جان لیا۔ پھر یہ عوام کی عادت بھی بن گیا اور ضرورت بھی' اشفاق احمد کے ہاں جگت بازی تو نہیں لیکن انہوں نے اپنی ذہانت سے کچھ ایسے لطیفے جمع کر لئے جن کے ذریعے انگریزی زبان کا مضحکہ اڑایا جا سکے۔ مثلاً" وہ لطیفے جو انہوں نے اپنی بیگم سے وابستہ کئے ہیں۔ یا وہ لطیفہ جس کے مطابق ایک شخص نے ان سے ملاقات کی اور پوچھا کہ METAMORPHOSIS ایسے عام لفظ کا ترجمہ آپ نے "کایا بدلی" کیوں کیا؟ اشفاق احمد نے پوچھا کہ آپ کیا کام کرتے ہیں جواب ملا کھاریاں میں ٹھیکے داری کرتا ہوں۔ پوچھا تعلیم کیا ہے بتایا کہ مڈل پاس ہیں۔ اب کوئی اس واقعہ کے سچے ہونے پر کیونکر یقین کر سکتا ہے۔ اشفاق احمد کی شخصیت اہم ہے بالخصوص ریڈیو کے لئے تلقین شاہ اور ٹی وی کے ڈرامہ نگار کی حیثیت سے۔ بطور اردو سائنس بورڈ کے ڈائریکٹر کے ان سے ارفع سنجیدگی کی توقع کرنا بے جا نہیں ہوگا۔ کیونکہ ان کے نظریات انگریزی کے خلاف اس نفرت کو مزید مستحکم کر سکتے ہیں جو پہلے سے ہمارے نوجوانوں کے دلوں میں راسخ کر دی گئی ہے۔ انگریزی کا تمسخر اڑانے کے بعد وہ اپنی ہر تقریر میں قدرے سنجیدہ ہو کر یہ بھی کہہ جاتے ہیں کہ اس تمام گفتگو سے میری مراد یہ ہرگز نہیں کہ انگریزی زبان کی کوئی اہمیت نہیں ــــــ وغیرہ وغیرہ۔ اشفاق احمد کی باتوں کا نوٹس لینا اس لئے ضروری ہے کہ ان کا ایک نام ہے اور لوگ ان کی بات کو اہمیت دیتے ہیں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ ان دنوں ان کی باتوں میں حقیقت پسندی کا فقدان ہوتا ہے۔ مثلاً" انہوں نے کہا کہ بڑے پیمانے پر دارالتراجم قائم کئے جائیں تاکہ انگریزی سے سارا علم اردو میں

منتقل ہو جائے اور ان وارترجموں کو بزرگوں کے مزاروں اور خانقاہوں کی تحویل میں دے دیا جائے۔ اب بزرگوں کا احترام اپنی جگہ لیکن تجویز کی نامعقولیت اپنی جگہ۔ لوگوں کے جذبات کے ساتھ کھیلنے اور ان کے استحصال سے سستی شہرت کو قائم رکھنے کا یہ طریقہ ہمیشہ سے رائج ہے۔ اشفاق احمد کو بڑھاپے میں اس کی ضرورت محسوس ہوئی' یہ حالت افسوس ناک ہے۔ ان کو بتانا یہ چاہیے کہ انگریزی میں موجود تمام سائنسی علوم کو کس طور اردو میں منتقل کیا جاسکتا ہے۔ اصل مسئلہ صرف یہی ہے۔ وہ ذریعہ جو اشفاق احمد نے تجویز کیا ہے۔ دیوانے کی بڑ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ یہ اتنا بڑا کام ہے کہ اس کے لئے منصوبہ بندی بھی اتنی ہی بڑی درکار ہے۔ جاپان نے جس طرح مغربی زبانوں بالخصوص انگریزی زبان سے سائنسی علوم کو اپنی زبان میں منتقل کیا۔ اس سے آج سبھی واقف ہیں۔ اس موقع پر صرف اتنا کہا جانا ضروری ہے کہ یہ کام چند برسوں میں ہی ہو گیا۔ بلکہ قدامت پسند جاپان نے اس وقت اس کام کا آغاز کیا تھا جب یہ کام قدرے آسان تھا اس کے بعد وہاں ایک ایسا نظام قائم کر لیا گیا۔ جس نے مغربی دنیا میں دریافت ہونے والے علم کی جاپان میں فوری منتقلی کو یقینی بنا دیا۔ جرمنی' روس' فرانس وغیرہ میں بھی اسی نوع کا نظام کام کر رہا ہے۔ کوریا بھی اب پیچھے نہیں ہے۔ کیا پاکستان میں کوئی ایسا طریقہ نظر آتا ہے جو سائنسی علوم کے اردو ترجمے کو یقینی بنا دے۔ اگر اس سوال کا مثبت جواب موجود ہے تو مسئلہ حل ہو جاتا ہے لیکن بد قسمتی سے اس سوال کا مثبت جواب موجود نہیں ہے۔

ترجمے کی بات ہوتی ہے تو یہ ہمارے تلقین شاہی ماہرین سمجھتے ہیں کہ اصطلاحات کا ترجمہ ہو جائے تو کافی ہے۔ یہ خیال سراسر غلط ہے۔ انگریزی زبان میں ہی نہیں دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں اور یورپ کی تو سبھی زبانوں میں سائنس' ادب' آرٹس' فلسفہ' تاریخ تمام علوم کی اصطلاحات کا ڈھانچہ یکساں ہے کیوں کہ سب کے ہاں اطالوی اصطلاحات کو اس کے اشتقاقات کے ساتھ اپنی اپنی زبان کا حصہ بنایا گیا ہے اور یہ وہ قدم ہے جس کی ضرورت اور اہمیت کو ہمارے ہاں تسلیم نہیں کیا جا رہا۔ ہمارے ہاں قومی سطح پر بعض منفی رویے رائج ہو چکے ہیں جو ہمارے کام کرنے کی صلاحیت کو متاثر کر رہے ہیں۔

چلیے مان لیتے ہیں کہ سائنسی علوم کا ترجمہ دشوار ہے۔ تو کیا ہم نے کسی قابل ذکر

وسیع پیمانے پر دنیا کے دوسرے علوم کو اردو میں منتقل کرلیا ہے؟ کون نہیں جانتا کہ دنیا بھر کے بیشتر ممالک کے ادب، تاریخ، علوم اور تہذیب کے بارے میں جو معلومات انگریزی زبان میں یکجا ہو گئی ہیں اور کسی زبان میں نہیں ہیں ہمارے ہاں جس طرح بعض سائنسی علوم پر کتابوں کے اِکا دُکا ترجمے مل جاتے ہیں اسی طرح دوسرے علوم میں بھی ہوا ہے ہم سے کہیں زیادہ کام ایران میں ہو چکا ہے۔ عرب ممالک میں بھی صورت حال مایوس کن ہے اور ہم نے تو مسلمان ممالک کے ادب اور دینی اور تاریخی کتب کا بھی ترجمہ اردو میں پوری طرح نہیں کیا۔ ہمیں جس طرح ہمارے سیاسی راہنماؤں نے ہنسنے اور تالیاں بجانے کے لئے وقف کردیا ہے تو یہ رویہ ہماری پہچان بن گیا ہے۔ اشفاق احمد اسی تکنیک کے سہارے زندہ ہیں۔ ٹی وی کے نصف سے زائد ڈراموں کی یہی بنیادی خصوصیت ہے جن میں بار بار دہرائے ہوئے لطیفوں کو ذرا سی تبدیلی سے پیش کر کے ڈرامے کو کامیڈی نہیں بلکہ مسخرے پن کی پست مثال بنا دیا جاتا ہے۔ جس طرح کئی کمپیئر ہر بار دو چار لطیفوں کے سہارے پروگرام کو بھانڈوں کا تماشہ بنا کر چلتے بنتے ہیں اور پھر آنے کی بشارت بھی دے جاتے ہیں پچھلے دنوں ہمارے دانشور اداکار محمد قوی خان نے کیا اچھی بات کہی کہ ہمارے فنون لطیفہ میں سے فنون تو خارج ہو گئے ہیں بس لطیفہ باقی رہ گیا ہے۔ عید بقر عید اور دوسری سالانہ تقریبات میں بھی یہی مزاج نمایاں ہوتا ہے یہ رویہ اتنا پختہ ہو چکا ہے کہ اسمبلیوں کے وہ اراکین بھی بے حد کامیاب سمجھے جاتے ہیں جو اسے استعمال کرتے ہیں ادھر پیر پگاڑا نے اس روّیے کو مزید استحکام بخشا ہے۔ مجموعی طور سے اس روّیے نے پوری قوم سے سوچنے سمجھنے اور کام کرنے کی صلاحیت چھین لی ہے۔ یہ درست ہے کہ کوئی قومی عذاب ہو تو ہم مل کر اس کا مقابلہ کرسکتے ہیں لیکن یہ بھی درست ہے کہ اس سے باہر ہم سوائے ہنسنے اور تالی بجانے کے کچھ نہیں کرسکتے۔ ہماری دوسری خوبیاں بھی تساہل، منافقت، محنت کے بغیر دولت کے حصول کی خواہش، بے خبری میں سرور و انبساط کے مزے لینے کی عادت، تصورِ جاناں کے بہانے دکھی پریم نگری بن کر پوری زندگی بے معنی درد، غم اور انتظار کی حالت میں نیم مردہ سانسوں کے ساتھ زندہ رہنے کو معیارِ حیات سمجھنے کی عادت، جب حشر کا دن آئے گا اس روز دیکھا جائے گا کہ نظریہ پر حماقت کی حد

تک ایمان، خرد افروزی سے اجتناب اور جذبوں کی اسیری میں خوش و خرم زندگی کے مزے لوٹنے کی روایت، یہ سب ہماری کامیابی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ ادھر ملک کے بہت سے با اثر اور قوی لوگوں کا ڈاکوؤں کو تحفظ دینا۔ خود بھی ڈاکو بن جانا، منشیات اور اسلحہ کی اسمگلنگ کی تجارت کرنا اور محفوظ رہنا یہ وہ زہر ہیں جن کی وجہ سے قوم نے رہا سہا حوصلہ بھی گنوا دیا ہے۔ پہلے شور مچانے سے کوئی مسئلہ حل ہو جاتا تھا۔ اخبار میں ذکر آجاتا تو مصیبت آجاتی۔ اب بدنامی ہی نیک نامی اور عظمت ہے۔ ادیبوں شاعروں نے اپنی تمام تر توتیں ٹی وی کے ڈراموں کے لئے وقف کر دی ہیں جو ادب کے زمرے سے خارج ہیں۔ ہر کہ و مہ ضرور تاً" دو چار غزلیں اور دو چار غزل نما نعتیں جیب میں ڈالے پھرتا ہے اور ٹی وی کے علاوہ ملک بھر کے اونچے ایوانوں، مشاعروں مذاکروں اور ملک سے باہر تقریبات کا اہل قرار پاتا ہے ہمیں محنت کی ضرورت نہیں۔ چالاکی ہوشیاری اور بددیانتی کی ضرورت ہے محنت کرنے والے اپنی عزتِ نفس کو سینے سے لگائے بیٹھے رہتے ہیں اور چالاک لوگ روس چین امریکہ یورپ اور ایوانِ صدر کے چکر لگاتے رہتے ہیں اس قوم سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ تالیاں بجاتے ہاتھوں سے کوئی سنجیدہ اور مفید کام کر دکھائے۔ میں پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہم جدید علوم کو اردو میں منتقل کرنے کی صلاحیت سے یکسر محروم ہیں۔ اِکا دُکا ہونے والے تجربوں کی اس لئے کوئی حیثیت نہیں کہ ان کی اہمیت تو سمندر میں قطرے سے بھی کہیں کم ہے لیکن آج دنیا میں آبرو مندانہ زندگی گزارنے کے لئے ان تمام سائنسی علوم کا حصول ضروری ہے جو ہمارے پاس نہیں ہیں اور مغرب کے پاس ہیں یا مشرق کے ان چند ملکوں کے پاس ہیں جو وقت پر ہوش میں آگئے تھے، ہمارا المیہ یہ بھی ہے کہ ہم اپنی اس کمزوری کو بھی تسلیم نہیں کرتے اور سینہ پھلا کر کہتے ہیں کہ وہ کونسا کام ہے جو ہم نہیں کر سکتے۔ میں اپنا سینہ دبا کر انکسار سے یہ کہتا ہوں کہ کر تو سکتے ہیں لیکن کبھی کریں گے نہیں۔ میں تو یہ طے سمجھتا ہوں کہ تمام سائنسی علوم کو اردو میں منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ اب چونکہ یہ ایک حقیقت ہے اور چونکہ ہم دنیا بھر کے علوم کو اردو میں منتقل کرنے کے لئے نہ سرمایہ رکھتے ہیں نہ ارادہ نہ توانائی نہ امنگ اس لئے لازم ہے کہ ہم انگریزی زبان کو اردو کے بعد لازمی ثانوی حیثیت میں

اختیار کیے رکھیں۔ انگریزی زبان ہمارے لئے قدیم و جدید علوم کی دنیا میں داخل ہونے کا پوری طرح کشادہ صدر دروازہ ہے جسے قوم اور اردو پر کھلا رہنا چاہئے۔

یہ بات کہ انگریزی کو بطور ثانوی زبان کے اختیار کیے رکھا جائے ہمارے سبھی پڑھے لکھے لوگ کہتے ہیں اور عملاً" یہ ہو بھی رہا ہے پھر جھگڑا کیا ہے؟ جھگڑا یہ ہے کہ ایک تو ہمارے نکھٹو لئے دانشوروں نے ہمارے ہاتھوں کو تالیوں کے لئے وقف کرلیا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہم اس معاملے کو بطور پالیسی طے نہیں کرپاتے جو عملاً" طے ہوچکا ہے۔ ہم یہ بھی طے نہیں کرسکتے کہ تعلیم کے مختلف درجوں میں انگریزی زبان کو کس درجہ میں کتنی اہمیت دینا ہے کیا یہ بات قومی وقار کے منافی نہیں کہ ملک کی دو جنرل یونیورسٹیاں بی اے بی ایس سی میں انگریزی کو بطور لازمی مضمون نہیں پڑھاتیں؟ اور ملک میں "انگلش" میڈیم تعلیم کے نام پر وسیع پیمانے پر دھوکا جاری ہے کسی بھی زاویے سے دیکھیں تو اردو کے لئے انگریزی کی بے حد ضرورت ہے۔ یہ مطالبہ تسلیم کرنے کے بعد کہ ذریعۂ تعلیم اردو ہو بی اے ایم اے کی سطح پر اجازت دے دی گئی کہ پڑھنے پڑھانے اور امتحان دینے کے لئے آزادی ہے کہ اردو استعمال کی جائے یا انگریزی۔ اس سے یہ ہوا کہ اردو اور انگریزی دونوں میں کمزوری آگئی ہے۔ یہ بات نہیں کہ سائنس صرف انگریزی ہی میں پڑھائی جاسکتی ہے اردو میں نہیں۔ بلکہ بات یہ ہے کہ قومی توانائی اور نوجوانوں کی عمر کے اہم ترین برسوں کا مفید ترین استعمال کیسے ہوسکتا ہے۔ انگریزی ہو یا عربی جو زبان ہمارے کام آسکتی ہے اور جس حد تک آسکتی ہے اس کے اس حد تک استعمال میں نصف صدی بحث میں گذار دینا حماقت ہے۔ پرائمری کے پہلے دو برس بعد انگریزی زبان کی تعلیم کا آغاز کردینا چاہیے۔ اور ایم ایس سی انجینئرنگ، طب وغیرہ کے سلسلے میں بھی بے دلی کی پالیسی ختم کرکے مضبوط فیصلہ فوری طور سے ہونا چاہیے۔ ایم اے کی سطح پر بی اے کی سطح پر بھی دوغلی پالیسی ختم کرکے ایک واضح فیصلہ کیا جانا چاہئے۔ انگریزی زبان ہماری ایک ایسی ضرورت ہے جیسی کہ ایٹمی توانائی۔ ضروری ہے کہ عوام کے دلوں سے انگریزی کے خلاف نفرت دور کی جائے تاکہ طالب علم دلجمعی کے ساتھ اس زبان کو سیکھیں اور فیل ہونے والے طالبعلموں کی تعداد کم ہو۔

انگریزی زبان سے نفرت کا جواز صرف یہ ہے کہ یہ انگریز کی چھوڑی ہوئی ہے اور یہ ایک ہتھیار تھا جو انگریز نے ہمارے خلاف استعمال کیا اور جاتے ہوئے میدان جنگ میں چھوڑ گیا یا بھول گیا یا ہم نے اس سے چھین لیا۔ اس صورت میں ہمیں انگریزی زبان کو دشمن سے چھینے ہوئے ہتھیار کی طرح استعمال کرنے کا سلیقہ آنا چاہئے۔ آخر ہم نے انگریز کی بنائی ہوئی نہروں' سڑکوں' پلوں اور ریلوے لائنوں کو بھی تو سنبھال کر رکھا ہے اور انہیں مزید مستحکم کرلیا ہے۔ انگریزی زبان کو ہم کتنا بھی استعمال کریں اردو کو اس سے کوئی خطرہ نہیں۔ زندہ زبان کو تو بہرحال بدلنا ہے لیکن صَرف و نحوؔ کے بنیادی اصول قائم رہتے ہیں اس لئے زبان کی بنیاد قائم رہتی ہے۔ صرف مختلف علوم کے حوالوں سے ذخیرۂ الفاظ و تراکیب اور اصطلاحات میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ جسے منظم کرلیا جائے تو زبان کو استحکام مل جاتا ہے وَلی دکنی کے دور کی اردو آج کی اردو سے مختلف لگتی ہے لیکن صَرف و نحوؔ کی بنیاد قائم ہے۔ قدیم انگریزی جس کا دور ۱۱۰۰ء تک متعیّن کیا گیا آج نہ تحریر میں مستعمل ہے نہ تقریر میں اور حد تو یہ ہے کہ چاسر جس کا تعلق وسطی انگریزی سے تھا اور جس کا انتقال حال ہی میں صرف ۵۹۲ برس قبل ۱۴۰۰ میں ہوا خود انگریزوں کو بھی اس وقت تک سمجھ میں نہیں آتا جب تک اس کا ترجمہ جدید انگریزی میں پیش نہ کیا جائے۔ ہر زندہ زبان اس عمل سے گزرتی ہے اور لاطینی اور یونانی کا بھی یہی حال ہے ماہرین بتاتے ہیں کہ آج نہ جولیس سیزر کی لاطینی بولی جاتی ہے نہ پیری کلیز کی یونانی' چنانچہ انگریزی کے زیرِ اثر اردو کے مسخ ہوجانے کے خوف سے ہمیں خود کو مکمل طور سے آزاد کرالینا چاہئے اور جان لینا چاہئے کہ بدلتی ہوئی معاشرتی فضا اور ضروریات سے ہم آہنگی میں ہی ہماری زبان کی بقا اور قوم کی ترقی کا راز مضمر ہے۔ اگر اس آویزش کے نتیجے میں کبھی ایسا ہو کہ اردو اور انگریزی سے مل کر ایک نئی اردو وجود میں آجائے تو بھی ہمیں پریشان نہیں ہونا چاہئے۔اردو آج خود برطانیہ اور امریکہ۔ اور کینیڈا میں بہت سے گھروں میں بولی جاتی ہے پورا افغانستان اسے سمجھتا ہے سارا بھارت سنگاپور اور برما اس سے واقف ہے۔ نئے عالمی تناظر میں وسط ایشیا کی ریاستوں میں بھی اردو کے پہونچنے کے امکانات ہیں۔ اردو کا مستقبل بہت روشن ہے صرف ہمیں تمام علوم اور زبانوں کے

دروازے کھلے رکھتا ہیں اور انگریزی کا صدر دروازہ تو لمحہ بھر کے لئے بند نہیں ہونے دینا۔ میں سمجھتا ہوں کہ منصوبہ بندی کی جائے تو اردو کو بین الاقوامی سطح پر مستحکم کیا جاسکتا ہے۔

انگریزی زبان سے تعلق کا ایک اور بڑا (ہر چند کہ ضمنی) فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے ہمارا کچھ نہ کچھ رابطہ یورپ کی دوسری زبانوں سے قائم نظر آتا ہے۔ انگریزی میں برطانیہ کی اصل زبان کے الفاظ اس طرح کم ہو کر رہ گئے ہیں جس طرح اردو میں دوسری زبانوں کے۔ انگریزی کا شجرۂ نسب جرمن خاندان سے ملتا ہے یہ تعلق تمام جرمنوں' ڈچ قبیلوں کی سبھی زبانوں آئس لینڈک نارویجین ڈینش اور سویڈش وغیرہ سے قربت کی وضاحت کرتا ہے۔ جرمن کو قدیم ہند یورپی زبانوں کے مغربی خاندان میں شامل کیا گیا ہے۔ مشرقی خاندان میں ایرانی' آریائی اور ہند آریائی زبانیں شامل ہیں گویا ایک تعلق تو یہیں سے نکل آیا اس تعلق کے ذریعے کسی حد تک بعض مشرقی زبانوں سے بھی پیچھے جاکر جرمن حوالوں سے انگریزی لغت کے ساتھ رشتہ تلاش کیا جاسکتا ہے۔ سکندر اعظم کے حملے کے بعد یونانی اثرات اردو پر زیادہ نہیں تھے لیکن بعد میں انگریزی کے ذریعے جو یونانی زبان کے اثرات اردو پر وارد ہوئے وہ لامحدود ہیں۔ اینگلو سیکسن جرمن تھے انہوں نے چھٹی صدی عیسوی میں برطانیہ پر ایسا سیاسی اور تہذیبی تسلط حاصل کرلیا جیسا کہ آریاؤں نے دراوڑوں پر کردیا تھا۔ رومن اثرات برطانیہ میں پہلے سے موجود تھے۔ گیارہویں صدی عیسوی ۱۰۶۶ء میں ولیم ڈیوک آف نارمنڈی کے تسلط کے بعد فرانسیسی اثرات بڑھ گئے عیسائیت کی تبلیغ نے رومن اثرات کو مستحکم کیا۔ جرمن روس اور فرانسیسی اثرات الگ وارد ہوئے لیکن ان میں ایک باہمی لسانی رشتہ پہلے سے موجود تھا جس کی وجہ سے الفاظ کے انجذاب کا عمل بہت آسان ہوگیا۔ یونانی سنسکرت اور لاطینی زبانوں کی بعض نمایاں مثالیں بھی قابل غور ہیں۔ انگریزی نے خود پر وارد ہونے والے اثرات کو اردو پر وارد کیا ہے اور یوں لاتعداد ایسے الفاظ جو انگریزی زبان کے نہیں ہیں بلکہ دوسری یورپی زبانوں کے ہیں اردو میں در آئے۔ اس صورت حال سے اردو چاہے تو علمی فائدہ حاصل کرسکتی ہے۔ ہمیں جاننا چاہئے کہ علم نوع انسانی کا مشترکہ سرمایہ ہے اور تاریخی عمل میں

محبتیں اور نفرتیں مستقل نہیں ہوتیں۔ یقیناً" لوگوں نے سرحد پار سے حال ہی میں اٹھنے والے ہندی چینی بھائی بھائی کے نعرے سُنے ہوں گے تاریخ میں کچھ بھی مستقل نہیں ہوتا۔ دوستیاں دشمنیاں عارضی ہوتی ہیں۔ ایک وَرلڈ کلچر وجود میں آچکا ہے جس میں طاقتور زبانوں اور قوموں کا دباؤ مسلسل بڑھ رہا ہے قوموں کی ترجیحات بدل رہی ہیں۔ ہمیں بھی اپنے قومی مقاصد کے لئے نئی منصوبہ بندی اردو کے بارے میں کرنا چاہئے۔ اس منصوبہ بندی کا تعلق قومی سطح کے علاوہ بین الاقوامی سطح سے بھی لازما" ہوگا ضروری ہے کہ ہمیں اپنے تعصبات پر نظر ثانی کرنی چاہئے حقیقت یہ ہے کہ بڑی حد تک ایسا ہوچکا ہے اور باوجود برطانیہ اور امریکہ اور فرانس کی بعض بے انصافیوں کے ہمارے ہاں عام طور سے انگریز سے اب نفرت نہیں کی جاتی۔ اپنائیت کا جذبہ اتنا شدید ہے کہ اگر ملک کی تمام آبادی کو اجازت مل جائے کہ وہ دنیا کے جس ملک میں چاہے جاکر آباد ہوجائیں تو اسّی فی صد لوگ برطانیہ' امریکہ' کینیڈا میں جابسیں گے۔ باقی بیس فی صد وہ ہوں گے جو جانے والوں کی جائدادوں کو اونے پونے داموں خرید کر پہلے سے زیادہ بڑے مالدار اور جاگیردار بننا چاہیں گے ایسا ہے تو پھر انگریزی زبان سے نفرت کا کیا جواز ہے' اردو کو انگریزی زبان کی بے حد ضرورت ہے۔ ایٹمی توانائی سے بھی زیادہ! ہمارا تعلیمیافتہ روشن دماغ طبقہ اس حقیقت سے واقف ہے۔ دفتروں میں تو اوپر سے نیچے تک اردو کے لازمی استعمال میں کوئی دشواری ہو ہی نہیں سکتی۔ ہاں تعلیم کے بعض درجوں یا شعبوں میں اس کے ذریعہ تعلیم بنانے کے سلسلے میں کچھ دشواریاں یقیناً" ہیں لیکن وہ ہرگز ایسی نہیں ہیں کہ انہیں فوری طور سے دور نہ کیا جاسکے۔

maablib.org

ڈاکٹر سلیم اختر

اردو کی ترقی میں علمی و ادبی اداروں کا کردار

زمانۂ قدیم کے عظیم بادشاہوں کے تذکرے میں ان کی فتوحات اور اصلاحات کے ساتھ ساتھ علم اور علماء، ادب اور ادباء اور شعر اور شعراء کی سرپرستی کا احوال بھی سنایا جاتا ہے۔ چنانچہ ایسے سخی بادشاہوں کے طلسم ہوشربا قسم کی سخاوت کے واقعات مشہور ہیں جنہوں نے شاعر کا منہ موتیوں سے بھر دیا۔ ہم وزن ٹکوں میں تولا۔ ہاتھی عنایت کر دیا اور لونڈی بخش دی اب یہ الگ بات ہے کہ کم ظرف شاعر کے لئے ؎

بخشش نے مجھ کو ابرِ کرم کی کیا خجل

والی بات ہی درست ثابت ہو۔

اب جبکہ تاریخ نے بادشاہوں کو صرف تاش کے ۴ بادشاہوں تک محدود کر دیا ہے حکمرانوں کی بخشش کا عمل اب بھی جاری ہے البتہ موتیوں سے منہ بھر دینے کے انداز و اسلوب میں تبدیلی آچکی ہے یعنی اب پلاٹ، لائسنس (کبھی کبھی تو لائسنس ٹو کل بھی) گریڈ اور مراعات یافتہ منصب ملتے ہیں جب یہ سب میسر ہو تو پھر لونڈی خود ہی مل جاتی ہے۔

ملک کے علمی، ادبی اور تحقیقی اداروں اور ادب کے بارے میں لکھے جانے والے

مضمون کی ایسی شروعات ' خاصی ناعاقبت اندیشانہ ثابت ہو سکتی ہے۔ ایسے مضمون کی تحریر کا بہتر طریقہ اور محفوظ اسلوب تو یہ ہے کہ اداروں کی تاریخ بیان کر کے ان کے عہدہ داروں کی فہرست اسماء اور مطبوعات و جرائد کی کتابیات مدون کر دی جائے اور بس۔ چلئے یوں ہی شروع کرتا ہوں چل میرے خامے -- بسم اللہ۔

جہاں تک اردو کی ترقی میں اداروں کے فعال کردار کا تعلق ہے تو اس کی افادیت مسلّم ہے کہ یہ ادارے بالواسطہ طور سے سہی مگر ملک میں علمی و ادبی لسانی اور فکری جہات پر تحقیق کا عمل جاری رکھتے ہیں ان کے نام اور بالخصوص مطبوعات کی اہمیت اس بنا پر زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ عام اداروں اور کمرشل ناشروں کے لئے یہ سب بھاری پتھر ثابت ہوتے ہیں چنانچہ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے زیر انتظام متعدد ادارے ' مقررہ حدود میں اسلام ' اقبال ' سائنس ' اردو ' لسانیات ' اصطلاحات اور تنقید کے فروغ کے لئے کوشاں ہیں ' جامعات سے وابستہ ادارے ان پر مستزاد ہماری بعض قد آور شخصیات ان اداروں سے وابستہ ہیں احمد ندیم قاسمی ' وحید قریشی ' اشفاق احمد ' ڈاکٹر جمیل جالبی ' ڈاکٹر فرمان فتح پوری ' اور پروفیسر مرزا محمد منور معتبر علمی شخصیات ہیں اور انہوں نے انفرادی حیثیت میں اتنا کام کر رکھا ہے کہ کسی ادارہ کی سربراہی تاج ثابت نہیں ہوتی۔

میرے متعدد ادبی گناہوں میں سے ایک گناہ بلکہ گناہ کبیرہ میرا سالانہ ادبی جائزہ بھی ہے۔ ہر برس کے آغاز پر میں سالِ گذشتہ کی تخلیقی بیلنس شیٹ تیار کرتا ہوں کیا آپ یقین کریں گے کہ سالِ گذشتہ میں بھی مجلس ترقی ادب ' اقبال اکیڈیمی اور بزم اقبال جیسے معروف اور فعال ادارے کوئی کتاب شائع نہ کر سکے اور ان جیسے دیگر ادارے گرانٹوں کے گرداب میں پھنسے رہے۔

در اصل ہمارے ملک کے علمی ادبی اور تحقیقی اداروں کی تعمیر ہی میں اِک صورت خرابی کی مضمر ہوتی ہے کہ سرکار انہیں معرضِ وجود میں لاتی ہے ہم جب سرکار کی بات کرتے ہیں تو اس سے مراد حکمران نہیں ہوتے کہ وہ بے چارے تو دور کہیں اولمپس میں بستے ہیں حکمران تو در اصل وہ اہل کار اور عہدہ دار ہوتے ہیں جنہیں تحفہ سے نہیں اپنے گفٹ چیک کرنے والے سرخ فیتہ سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے اب احمد ندیم قاسمی لاکھ

بڑے شاعر بنے پھریں' اشفاق احمد بہت بڑے تلقین شاہ سی اور ڈاکٹر وحید قریشی' ڈاکٹر جمیل جالبی اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری' محقق مورخ دانش ور کے طور پر مشہور ہوں گرانٹ تو حاصل کرنی ہے لہٰذا صورت یہ ہوتی ہے

تری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے!

اشفاق احمد البتہ حضرت نکلے اپنی عمارت آپ کھڑی کر کے خود کفیل ہو گئے باقی سب اس شعر کے برعکس نظر آتے ہیں۔

آگے کسو کے کیا کریں دستِ طلب دراز

جبکہ دوسرے مصرعہ۔

وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

کی تکمیل ہر ممکن صورت میں کرتے نظر آتے ہیں۔

جہاں تک گرانٹ کی رقم اور اس کی تقسیم کے انداز کا تعلق ہے تو بیشتر صورتوں میں یہ رسی بلکہ کھونٹا ثابت ہوتی ہے۔ قوتِ پرواز مجروح ہو جاتی ہے اور ادارہ دودھ نہ دینے والی گائے بن جاتا ہے اور آپ مسلمانوں کو تو یہ بتانے کی ضرورت نہ ہونی چاہئے کہ جب گائے دودھ نہیں دیتی تو اس کے ساتھ کیا حسن سلوک کیا جاتا ہے فزوں تر افراطِ زر کے عہد میں اب روپے کی صورت یہ ہو چکی ہے کہ ہاتھ میں آنے سے قبل ہی اس کی قیمت یعنی قوتِ خرید کم ہو چکی ہوتی ہے لہٰذا جب جون کی گرانٹ ستمبر اکتوبر میں ملتی ہے تو صرف اس تاخیر کے تناسب ہی سے ادارہ بعض ممکنہ فوائد گنوا چکا ہوتا ہے اس پر مستزاد عملہ' دفتر اور طباعت وغیرہ کے اخراجات میں مہنگائی کا پیدا کردہ مسلسل اضافہ!

جن اداروں کے سربراہ زیادہ پھرتیاں دکھاتے ہیں ان کا انجام ڈاکٹر وحید قریشی جیسا ہوتا ہے جنہوں نے ۱۹۹۰ میں کتابوں کی فروخت سے بزمِ اقبال کے لئے ۳۵ ہزار روپے کمائے اس پر شاباش یوں ملی کہ ۱۹۹۱ء کی گرانٹ میں سے ۳۵ ہزار کی تخفیف کر دی گئی۔ ہور چُوپو!

اس صورتِ حال کے نتیجہ میں بیشتر اداروں کے پاس اتنی چادر بھی نہیں ہوتی کہ پاؤں پھیلا سکیں' بے چارے ٹانگیں سکیڑے پڑے رہتے ہیں کوئی پریس کا مقروض تو کسی

نے کاغذ والے کا بل ادا کرنا ہے۔ یہ تو اس مرتبہ محترم غلام حیدر وائیں نے ذاتی دلچسپی لے کر ان نیم جان اداروں کو اضافی گرانٹ کی صورت میں نیو رو بیان کا انجکشن لگا کر ان کے اور ان سے لینے والوں کے آنسو پونچھے۔

ذہنی بنجر پن کے باعث آج ہم فکری بحران کا شکار نظر آتے ہیں لهٰذا ان تہذیبی اور تخلیقی رویوں کی آبیاری کی ضرورت ہے جو معاشرے میں حیات بخش تصورات کی صحت مند رَو موجزن کر سکیں اس مقصد کے لئے جہاں اور بھی بہت کچھ کیا جا سکتا ہے وہاں ملک کے علمی ادبی اور تحقیقی اداروں کے توسط سے ایسی کانفرنسوں اور سیمینارز کے انعقاد کی ضرورت ہے جہاں ہر ذہن، فکر اور تصوّر کے حامل اہلِ علم اور اہلِ قلم اپنے خیالات کا بلا روک ٹوک اظہار کر سکیں آج متحارب (بالعموم سیاسی) گروپوں نے ایسی POLARITY پیدا کر دی ہے کہ مختلف الخیال افراد کا ایک میز ایک پلیٹ فارم سے بحث مباحثہ یا تبادلہ خیال محال ہو چکا ہے جس کے باعث مکالمہ نے مجادلہ کی صورت اختیار کر لی ہے اور مخالف کی بات سننے کی بجائے اس کی زباں بندی زیادہ آسان نظر آتی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں سرے سے ایسے گھاٹ ہی موجود نہیں۔ جہاں شیر اور بکری ہی نہیں بلکہ سبھی علمی تشنگی بجھانے کا جتن کر سکیں میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے علمی ادبی اور تحقیقی ادارے ایسے پلیٹ فارم مہیا کر سکتے ہیں جہاں ہر انداز و اسلوب کے اہل علم اہل قلم اور اہل دانش جمع ہو سکتے ہیں علامہ اقبال کے علاوہ بھی متعدد ایسی شخصیات ہیں جن کے حوالے سے مجلس مقالات مرتب کی جا سکتی ہے اگر دوحہ (قطر) میں میر تقی میر سیمینار ہو سکتا ہے تو لاہور ملتان بہاول پور سکھر اور پشاور میں کیوں نہیں'

وائیں صاحب کے ذاتی شوق توجہ اور مالی امداد کی وجہ سے اگر ملتان میں عالمی اردو کانفرنس منعقد ہو سکتی ہے تو ان ہی کی توجہ سے دیگر شہروں میں بھی ایسے ہی اجتماعات ہو سکتے ہیں مخلص کارکنوں کی کمی نہیں بات صرف فنڈز کی ہوتی ہے۔ اگر حکومت سے وافر گرانٹیں ملیں اور اگر ہر ادارہ سال میں صرف ایک ہی کانفرنس کرا سکے تو بھی بزم ادب سال بھر پُر رونق رہے گی۔

بھارت میں بھی اس نوع کے ادارے ہیں ان کے بھی وسائل کم اور مسائل زیادہ

ہوں گے لیکن وہاں کے ادارے اشاعتِ کتب کے لئے مصنفین کو مالی امداد کے ساتھ ساتھ علمی مسائل اور ادبی و تحقیقی موضوعات پر کانفرنسیں کرتے رہتے ہیں ان کا حوالہ دینے پر جواب ملتا ہے یہ سب تو پراپیگنڈہ کے لئے کیا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ زیادہ اہم ہے کہ اس کا ثمر؟ اپنے پراپیگنڈہ کے لئے ہی سہی مگر آپ بھی تو کچھ Motive کیجئے نا۔

اب تک کی گفتگو سے اگر یہ احتمال ہو کہ کانفرنسیں اور سیمینارز سونٹھ کی گانٹھ ہیں یعنی تمام قومی عوارض ملّی مسائل اور عوامی پریشانیوں کے لئے کانفرنسیں امرت دھارا ثابت ہو سکتی ہیں تو ایسا نہیں ہے۔ میں تو صرف ذہنی زندگی میں علم و دانش کا فعال کردار اجاگر کرنے کی کوشش کر رہا ہوں ویسے بھی اہلِ علم' اہلِ قلم اہلِ دانش اور اہلِ فکر خود بے اقتدار ہوتے ہیں اس لئے ان کے مسائل کے حل کی توقع عبث ہے مگر اپنی تحریروں' استدلال' آراء اور سوچ سے فکری سانچوں میں یقیناً" تبدیلیاں پیدا کر سکتے ہیں کہ یہ تصور گر اور نظریہ ساز ہوتے ہیں اور اداروں کو شخصیات سے ہم آہنگ کر کے ایسے مقاصد کا حصول ممکن ہے۔

تمام علمی ادارے بقدر ظرف کتابیں طبع کرتے ہیں' بلحاظ موضوع ایسی کتابیں' کمرشل ناشر جن کی اشاعت کا خطرہ مول نہیں لے سکتا ان کتابوں کی علمی ادبی اور تحقیقی اہمیت مسلّم مگر فروخت محال ہوتی ہے ادھر ان اداروں کو محترم علمی شخصیات کی کتابیں طبع کرنے کے باوجود بھی مارکیٹ نہیں ملتی' لہٰذا کتابوں کی فروخت ہمیشہ غیر تسلی بخش ہی رہتی ہے۔ یوں سٹاک بذات خود مسئلہ کی صورت اختیار کر جاتا ہے اس ضمن میں میری یہ تجویز ہے کہ ایسے اداروں کی کتابوں کے سیٹ بنا کر بھارت اور دیگر ممالک کی جامعات' علمی اداروں' معروف لائبریریوں اور نامور علمی شخصیات کو بطور تحفہ پیش کئے جائیں بالخصوص ان ممالک اور وہاں کی لائبریریوں کے لئے یہ اہم علمی تحفہ ہو گا جہاں جہاں بھی اردو کی تدریس ہوتی ہے جس طرح پانی کے بہاؤ سے دریا' دریا کہلاتا ہے اسی طرح الفاظ و تصورات کے بہاؤ سے ہی زبان تشنگانِ علم کی پیاس بجھاتی ہے اور مؤثر انتظامی منصوبہ بندی اور مالی استحکام سے ملک کے محض علمی ادبی اور تحقیقی اداروں کو حقیقی معنوں میں

علمی ادبی اور تحقیقی اداروں میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

آپ پوچھ سکتے ہیں کہ تم نہ تین میں نہ تیرہ میں پھر ایسی گفتگو کیوں کرتے ہو جواباً عرض ہے کہ مردہ اپنی نماز جنازہ خود تو نہیں پڑھا سکتا یہ فرض کفایہ ان لوگوں ہی کو ادا کرنا ہوتا ہے جو اتفاق سے مرے نہیں!

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

پاکستانی یونیورسٹیوں میں

اردو تحقیق کی روایت اور صورتِ حال

کانفرنس کے منتظمین کی جانب سے میرے لئے جو مصرعہ تجویز ہوا ہے وہ ہے "پاکستانی یونیورسٹیوں میں اردو تحقیق کی روایت اور صورت حال" اس مصرعے اور موضوع میں غزل سے زیادہ مرثیہ خوانی کے امکانات ہیں کہ اس میں مقامات آہ و فغاں بہت ہیں! لیکن میں تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ میری باتیں بہت مسلسل اور مرتب بھی نہ ہوں شاید اس کے باوجود یہ اچھی غزل ہو' یہ ضروری نہیں۔

یہ کانفرنس ملتان کی سرزمین پر منعقد ہو رہی ہے۔ زکریا یونیورسٹی ملتان سمیت قرب وجوار کی نئی اور پرانی یونیورسٹیوں (یعنی اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور' اور پنجاب یونیورسٹی لاہور) یا ان یونیورسٹیوں سے ملحق ان سب کالجز میں جہاں ان دنوں اردو میں پوسٹ گریجویٹ ٹیچنگ کا انتظام اور اہتمام ہے۔ کوئی ایسا معلم اور مدرس اس وقت بر سر کار نہیں جس نے مجھ سے پہلے اردو میں پی ایچ ڈی کی سند فضیلت پائی ہو۔ اس حوالے سے مقصود بتانا یہ ہے کہ اس موضوع پر سوچنے کا موقع مجھے نسبتاً زیادہ ملا ہے اور یونیورسٹی کی سطح پر اردو میں تحقیق کی منصوبہ بندی سے میرا تعلق پرانا ہے اگرچہ یہ تعلق ہے محض دور دور کا ......

رشید احمد صدیقی کے الفاظ اور اسلوب میں یہ بات میں بارہا کہا کرتا ہوں کہ کار تحقیق نے

کسی اور کام کا نہ رکھا! یہ سخت گیر اور شکی محبوب کی طرح نہیں چاہتا کہ اس کے ادنیٰ مطالبات سے بھی گریز کیا جائے یا اس کے سوا کسی اور طرف ملتفت ہوا جائے تحقیقی کام میں گم اور مگن اصحاب کو جہاں تہاں گفتار کے غازیوں کی جانب سے "قلیل العاشرت" ہونے کا طعنہ سننا پڑتا ہے۔ اس طرح کے مجلسی بکھیڑوں کو رشید حسن خان کی یہ بات کون سمجھائے کہ تحقیق ' شرک گوارا نہیں کرتی۔ اس کے بعد جس انہماک ' یک سوئی اور ڈوب جانے والی کیفیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہنگامہ آلود زندگی اس کے منافی ہے"۔

میرے نزدیک تحقیق امر واقعہ کی تلاش اور تعین کا نام ہے۔ کسی تعصب یا تحفظ کے بغیر کسی امر کو اس کی اصل شکل میں دیکھنے اور دکھانے کی تگ و تاز اور کوشش ' بجائے خود ایک کار نیک لیکن کار دشوار ہے۔ کسی شخص ' شے یا امر کو اس کی اصل شکل دیکھنے کا رویہ مستحسن ' لیکن ایک مشکل قضیہ ہے اور یہ ہر کس و ناکس کے بس کا روگ نہیں۔ اس لئے کم لوگ تحقیق کی طرف مائل ہوتے ہیں اور ان میں بھی کم تر ہوتے ہیں جو تحقیق کا حق جیسا چاہیے ادا کر پائیں۔

"تحقیق" کی جانب اگر آپ ضرورتاً" اتفاقاً" یا مصلحتاً" نہیں آنکلے اور تحقیق ہی کا ہو کر آپ کو رہنا ہے تو آپ کو تحریص اور ترغیب سے بچنا اور بلند رہنا ہوگا۔ سماجی زندگی کی قربانی دینا ہوگی ' "ہم نفسوں" سے "ہم سخن ساتھیوں" سے نکل کر اور ہٹ کر دیکھنا ہوگا۔ تقریبات' دکھاوے اور رونمائیاں دل کو لبھائیں گی لیکن ان سے دامن کش رہنا ہوگا۔ حلقوں اور کالموں کے پھیر سے نکلنا اور اس نوعیت کی ساری بدوسری ترغیبات سے صرف نظر کرنا ہوگا۔ یہ بہت آسان بات نہیں۔

مجھے شبہ ہے کہ اردو تحقیق کے وہ بڑے بت شکن جواب ہم میں نہیں ' حافظ محمود شیرانی ' مولوی محمد شفیع ' مولانا امتیاز علی عرشی ' مسعود حسن رضوی یا قاضی عبدالودود کسی چائے خانہ عام یا کافی ہاؤس کی مستقل زینت پائے گئے ہوں۔ یا آج کے بہت سے "مسال خوردہ جوانوں" کی طرح انہوں نے "لابی" بنانے یا نیم ادبی کالموں میں جگہ پانے کا اہتمام کیا ہو۔

ادب میں "باقی" رہنے کی فکر سے زیادہ "تازہ" رہنے کے شوق بے مہار کو میں

ادب یا ادیب کے لئے فال نیک نہیں جانتا۔ شعبہ یا میدان کچھ بھی ہو' کوئی گہرا دائمی نقش چھوڑا ہی نہیں جاسکتا۔ جب تک اس مخصوص شعبے یا فن کے اونی مطالبات تک سے استوار اور پائیدار پیمان نہ باندھ لیا جائے اور ریاضت کو شیوہ اور شعار نہ بنا لیا جائے۔ اس کے لئے ہمیں ---------- وہی بات کہ میزبانی' حلقوں اور کالموں' گروپنگ' لابنگ اور کمپیئرنگ کے پھیر اور غول سے نکلنا اور بلند ہونا ہوگا۔

تحقیق بے حد مشقت طلب اور صبر آزما کام ہے۔ اس میں رشید حسن خان کے لفظوں میں جلد بازی' آسان پسندی' بوالہوسی اور خفیف الحرکاتی کو مطلق دخل نہیں ہوتا اس میں کچھ حاصل کرنے کے لئے بڑی ریاضت کرنا پڑتی ہے۔ تحقیق میں آنکھوں کا تیل ٹپکانا پڑتا ہے اور دل خون کرنا ہوتا ہے۔ تب ایک مصرعۂ تر کی صورت ہاتھ آتی ہے۔ اور بات بن پاتی ہے۔ اس لئے اچھے تحقیقی کام آئے دن سامنے آتے رہیں' یہ تقاضا یا توقع کرنا فعل عبث ہوگا۔ بڑے پیمانے اور قریم کے کام روز روز سامنے نہیں آتے' آ بھی نہیں سکتے۔ ہر بڑے اور باقی رہنے والے کام یا کارنامے کے پس پشت ایک بڑی محکم شخصیت کا وجود ناگزیر ہے جو کسی شعبہ ادب کو کبھی کبھار ہی میسر آتی ہے اور آسکتی ہے۔

اچھے اور بڑے محقق کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ شبہ کرسکے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ صاحب نظر ہو' اس کے کندھوں پر اس کا اپنا سر ہو۔ وہ معاملات کو اپنے نظرے دیکھنے اور اپنی عقل سے پرکھ سکنے کا اہل ہو ------ وہ آزادانہ دیکھ اور سوچ سکتا ہو' بھیڑیا ہجوم کا محض ایک فرد نہ ہو' اپنی ایک الگ شخصیت اور پہچان رکھتا ہو پھر انکار کرنے کی جرأت کے ساتھ ساتھ محقق کے لئے اعتراف کرنے اور اپنی کمی یا کمزوری کو مان لینے کی عالی حوصلگی بھی شرط لازم کی حیثیت رکھتی ہے۔

استناد و استشہاد اور تعدیل و تجزیے کی اساس پر مسلمات کا انہدام اور نئی صداقتوں کا اعتراف اور ان کی صورت گری محقق کے واجبات میں سے ہے لیکن "چونکا دینا" مقصود نہیں ہونا چاہئے۔ تلاش اور کھوج کے نتیجے میں کوئی ایسی مخفی صداقت ہاتھ آئے جو مسلمات کی نفی کرتی ہو تو اس کے لئے بھی اظہار اور گفتار کے اسلوب پر قابو رکھنا ضروری ہے۔

تحقیق، معلوم سے نامعلوم کی طرف سفر کرتا ہے۔ یہ گویا الٹے قدموں چلنے کا عمل ہے۔ اسے پیچھے دیکھنا اور آگے کے لئے راستہ بنانا ہے۔ یہاں رفتار کبھی تیز نہیں ہو سکتی۔ لانگ پھلانگ سے یہاں کام نہیں چل سکتا۔ گر جانے یا منزل کے نہ پانے یا اس سے دور رہ جانے کا خطرہ ہر دم لاحق رہے گا۔ اس لئے ثابت قدمی، تحقیق سے مزاجی مناسبت کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ مفاہمت 'یا مصلحت کو تحقیق سے کوئی نسبت نہیں اور راستبازی' استقامت ریاضت اور صلابت اس کے لوازم میں سے ہیں۔ لچکدار اور سیال ہونا، آج سیاست دانوں کے لئے نشان امتیاز نہیں رہا۔ چہ جائیکہ محقق یا نقاد سے کوئی اس کی توقع یا مطالبہ کرے جو ہمارے قومی ضمیر کی آواز اور پہچان ہوتے ہیں یا کم از کم ہونے چاہئیں۔

ہمارے ہاں یونیورسٹیوں میں اردو میں تحقیق کی روایت خاصی پرانی اور پائیدار رہی ہے۔ لیکن بہ صورت موجودہ اور بحیثیت مجموعی اسے قابل رشک نہیں کہا جاسکتا۔ قیام پاکستان کے آٹھ ماہ بعد اپریل ۱۹۴۸ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی میں شعبہ اردو کا قیام عمل میں آیا پنجاب یونیورسٹی لاہور نے اسی برس اردو میں ایم اے کی کلاسز شروع کیں۔ لیکن تدریس کا آغاز ڈھاکہ یونیورسٹی سے چھ ماہ اکتوبر ۱۹۴۸ء میں ہوا۔ اس طرح ڈھاکہ یونیورسٹی کو پاکستان میں پہلے پہل ایم اے کی سطح پر اردو کی تدریس کا انتظام و انصرام کا امتیاز حاصل ہوا۔

پی ایچ ڈی کی سطح پر اردو میں پہلا تحقیقی کام بھی پاکستان کی حد تک ڈھاکہ یونیورسٹی ہی میں پورا ہوا۔ یہ ڈاکٹر شوکت سبزواری کا تحقیقی مقالہ تھا۔ "اردو زبان کا ارتقاء" جو ۱۹۵۲ء میں پی ایچ ڈی کے لئے پیش کیا گیا۔ یہ پاکستان میں اردو زبان کی پہلی ڈاکٹریٹ کی ڈگری ہے۔ میرے علم اور یقین کی حد تک کسی پاکستانی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کے لئے منظور ہونے والا تازہ ترین مقالہ "میرا جی کی شخصیت اور فن" پر ہے جو ڈاکٹر رشید امجد کی سعی کا حاصل ہے۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر رشید امجد، یعنی پہلے اور (اس وقت تک کے) آخری مقالے کے درمیان چالیس برس کا فاصلہ ہے۔ ہر دو اصحاب کی علمی وجاہت، وجہ شہرت اور ان کے مزاج و منہاج یا موضوعات کا تقابل یہاں مقصود نہیں لیکن اس سے پہلے

موجودہ "آخری" حوالے سے صورت حال کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں رہ جاتا کہ ان برسوں میں راوی کے پل سے کتنا پانی بہہ چکا اور بات کہاں سے کہاں پہنچ چکی۔

میرے نزدیک تحقیق' چراغ سے چراغ جلانے کا عمل ہے۔ پچھلے چراغوں کو بے نور یا گل کرنے کا شغل نہیں۔ رشید احمد صدیقی کی طرح میرا عقیدہ یہ ہے کہ کوئی بڑا شاعر یا محقق اور نقاد' اپنا درجہ کبھی نہیں کھوتا ------------ بعد کے آنے والے شاعر یا محقق اور نقاد نہ اس کو پیچھے دھکیلتے ہیں۔ نہ اس کی جگہ لیتے ہیں۔ بلکہ شاعری یا تحقیق و تنقید میں ایک نئے حسب و نسب یا سطح اور سمت کی نشاندہی کرتے ہیں۔

ان چالیس پینتالیس برسوں (۱۹۴۷ - ۱۹۹۲ء) میں پاکستانی یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے اردو میں کوئی دو سو کے قریب تحقیقی مقالے ڈاکٹریٹ کی سند کے مستحق پائے ہوں گے ان کا ایک بڑا حصہ ابھی چھپا نہیں ہے۔

پاکستان میں اردو سے متعلق ڈی لٹ کی پہلی ڈگری پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ۱۹۶۵ء میں ڈاکٹر وحید قریشی (ولادت گوجرانوالہ ۱۴ - فروری ۱۹۲۵) کو "میر حسن اور ان کا زمانہ" پر دی گئی انہوں نے ۱۹۵۲ء میں پنجاب یونیورسٹی سے انشا لٹریچر ان پرشین ' اے کریٹیکل اسٹڈی کے موضوع پر فارسی میں ڈگری حاصل کی۔ وحید قریشی نے فارسی میں پی ایچ ڈی کیا تو ان کی عمر ستائیس برس اور جب انہوں نے اردو میں ڈی لٹ کی ڈگری لی تو وہ عمر عزیز کے چالیسویں برس میں تھے۔ اس امتیاز میں کم لوگ ان کے شریک ہوں گے۔

کراچی یونیورسٹی سے اردو میں ڈی لٹ کی پہلی ڈگری حاصل کرنے کا اعزاز ڈاکٹر فرمان فتح پوری (ولادت فتح پور ۲۶ - جنوری ۱۹۲۶ء) کو حاصل ہوا۔ یہ اعزاز انہیں ۱۹۷۴ء میں ان کی معروف کتاب "اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری" پر حاصل ہوا۔ ۱۹۶۵ء میں انہوں نے کراچی یونیورسٹی ہی سے "اردو کی منظوم داستانیں" کے موضوع پر اردو میں پی ایچ ڈی کی سند فضیلت پائی پاکستان کی کسی یونیورسٹی سے وابستہ وہ پہلے محقق اور پروفیسر ہیں جنہیں اردو میں پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کی اعلیٰ ترین علمی اسناد پانے کا امتیاز حاصل ہوا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی (ولادت علی گڑھ ۱۲ جنوری جون ۱۹۲۹ء) نے ۱۹۷۱ء میں "قدیم اردو

ادب کا تحقیقی مطالعہ" کے موضوع پر سندھ یونیورسٹی سے اردو میں پی ایچ ڈی کیا۔ ۱۹۷۶ء میں سندھ یونیورسٹی ہی نے انھیں ان کے بے مثال تدوینی اور تحقیقی کارنامے "مثنوی نظامی دکنی المعروف بہ کدم راؤ پدم راؤ" پر اردو میں ڈی لٹ کی ڈگری عطا کی۔ وہ پاکستان کے پہلے اور اب تک واحد ریسرچ اسکالر ہیں جنھوں نے پانچ برس کی ریکارڈ مدت میں اردو کی یہ دو اعلیٰ ترین علمی اسناد حاصل کرنے کا امتیاز پایا۔

سابق مشرقی پاکستان سے قطع نظر، موجودہ پاکستان میں اردو میں پی ایچ ڈی کی سب سے پہلی ڈگری پانے کا اعزاز ڈاکٹر صابر علیخان مرحوم (کوئن میری کالج، لاہور) کو حاصل ہوا۔ انھیں یہ ڈگری ۱۹۵۵ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور کی طرف سے ان کے تحقیقی کام "سعادت یار خان رنگین، حیات و کلام" پر دی گئی۔ پاکستان میں اردو میں پی ایچ ڈی کی سب سے پہلی ڈگری حاصل کرنے والی خاتون اسکالر کا نام مس للیان نازرو (Nazroo Miss Lilione ہے وہ پاکستان (کراچی) میں فرانس کے سفارت خانے سے وابستہ ایک خاتون تھیں۔ جنھوں نے ۱۹۷۱ء میں کراچی یونیورسٹی سے گارسان دتاسی کی فرانسیسی زبان میں لکھی گئی تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی کے اردو ترجمے اور تعلیقات پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹر صابر علی خان اور ڈاکٹر للیان نذور نے اپنا تحقیقی کام ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی نگرانی میں انجام دیا۔

یہ بات بھی لکھنے کے قابل ہے کتاب میں!

اردو میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے والی پہلی پاکستانی خاتون ہونے کا اعزاز ڈاکٹر حسین بانو کو حاصل ہوا جنھوں نے سندھ یونیورسٹی سے ۱۹۶۸ء میں "تاریخ اور ان کے تلامذہ" کے موضوع پر کامیابی کے ساتھ تحقیقی مقالہ لکھا۔

"ہمارے کیسے کیسے مشاہیر جمیل الدین عالی کے لفظوں میں کتنے بڑے بڑے کام کر کے تمام ہوئے مگر اب تک ان پر کام کرنے والے نظر نہیں آتے۔ میر، غالب، اور اقبال اردو شعر و ادب کی بڑی اہم منزلیں اور عہد ساز شخصیتیں ہیں۔ میر اٹھارہویں صدی، غالب انیسویں، اور اقبال بیسویں صدی کی نمائندہ اور تابندہ ترین متاع ہیں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ پاکستانی یونیورسٹیوں میں میر پر پی ایچ ڈی کی سطح کا کوئی کام نہیں ہوا۔ غالب

اور اقبال پر پاکستان میں پی ایچ ڈی کی اولین ڈگریاں پانے کا اعزاز اور امتیاز ڈاکٹر سید معین الرحمٰن اور ڈاکٹر ابوسعید نورالدین کو حاصل ہوا۔

اُدھر چند برسوں سے ہماری یونیورسٹیوں میں قریبی معاصرین پر توجہ کا رجحان بڑھا ہے' یہ برا نہیں بشرطیکہ حد اعتدال سے نہ بڑھے۔ معاصرین میں ابن انشاء (ولادت ۱۵ جون ۱۹۲۷ء وفات ۱۱ جنوری ۱۹۷۸ء) بہ اعتبار عمر سب سے چھوٹے تھے۔ جو پی ایچ ڈی کی سطح پر اردو میں تحقیق کا موضوع بنے۔ ان کے انتقال کے آٹھویں برس ہی ان پر ڈاکٹریٹ کا کام مکمل ہوگیا اور یہ امتیاز اور خوش بختی کتنی لائق رشک ہے کہ ان کے بارے میں جو تحقیقی کام ہوا ہے وہ چھپ بھی گیا ہے۔

اردو میں تحقیقی کام زیادہ تر پاکستان اور بھارت کی یونیورسٹیوں میں ہوا ہے' اور جنوبی ایشیا سے باہر مغرب میں بھی۔ میرے ذاتی ذخیرہ کتب کا ایک گوشہ یونیورسٹیوں کے مطبوعہ 'غیر مطبوعہ تحقیقی مقالات پر مشتمل ہے۔ اس میں دنیا بھر کے پچاس سے زیادہ یونیورسٹیوں کے کوئی پانچ سو کے قریب ایسے مقالات محفوظ ہیں جن پر کوئی اعلیٰ علمی سند تفویض کی گئی ہے۔ اس ذخیرے کا بڑا حصہ قابل لحاظ نہیں اور میں رشید حسن خان کی اس رائے سے اپنے آپ کو بڑی حد تک متفق پاتا ہوں کہ۔

"ہماری یونیورسٹیاں تحقیقی مقالوں کے کارخانوں کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں طلباء کے علاوہ دانش گاہوں کے اساتذہ بھی حسب توفیق اس شمار میں اضافہ کرتے رہتے ہیں اور یہ حقیقت ہے اس کثرت اور تیز رفتاری نے پستی معیار کو عام کر دیا ہے۔

بھارت کی یونیورسٹیوں کے بارے میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا اعتراف اور احساس یہ ہے کہ وہاں اردو میں پی ایچ ڈی کی ڈگری۔

> "اب ہر اس شخص کو ملنے لگی ہے جو تین چار سو صفحے کالے کر لے' خواہ اس میں کوئی قابل ذکر بات کی گئی ہو یا نہیں کم سے کم میرے علم میں تو سوائے ایک آدھ کے کوئی ایسا مقالہ نہیں جسے ممتحن حضرات نے قطعی طور پر نامنظور کر دیا ہو۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ یونیورسٹیوں میں تحقیق کا معیار روز بروز گر رہا ہے۔

ڈاکٹر نارنگ نے یہ بات ' اب سے کوئی نو برس پہلے ۱۹۸۳ء میں کہی اور لکھی تھی خدا کرے اب وہاں یہ صورت حال نہ ہو۔ اور خدا نہ کرے کہ خود پاکستان میں ہم خام بدہن اس نوبت یا انجام کو پہنچیں۔

اور اب آخری بات ' یہ میرے لئے عقیدے کی طرح سچی اور پکی ہے۔ اور اپنے عزیزوں سے یہ بات میں نے بارہا کہی ہے اور کہتا رہتا ہوں کہ "تحقیق کا راستہ آسان نہیں اور نہ لازماً" بار آور۔ یہ پر پیچ بھی ہے اور دشوار گزار بھی۔ تحقیق عمل جانکاہی کا مطالبہ کرتا ہے اور بڑی یکسوئی چاہتا ہے۔ آج کی پر شور ' تیز رفتار اور ہنگامہ آلود زندگی اسے بالخصوص راس یا سازگار نہیں۔ اس لئے اچھے محقق (جن پر بھروسہ کیا جاسکے) پہلے بھی کم یاب اور کم نام رہے ہیں۔ آج بھی یہ بہت عام یا معروف نہیں ایسے میں کہ "شارٹ کٹ" معیوب نہ رہ گیا ہو ' شہرت اور شو بزنس کا سامان اور امکان موجود اور دسترس سے زیادہ دور نہ ہو ' کسی کا تحقیق کی بے رنگ و بے آب وادی کی طرف مائل اور متوجہ رہنا کچھ کم اہم بات نہیں!

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جس معاشرے میں علم کی قدر نہ ہو اور اہل علم کی توقیر نہ کی جاتی ہو' وہ معاشرہ کبھی پنپ نہیں سکتا اور یہ صرف ہمارے معاشرے ہی کی شرط اور قید نہیں ——— جہاں بھی خود اہل علم و قلم اپنے اپنے حلقہ اثر کی تشکیل کے لئے جوڑ توڑ سمجھوتوں اور مفاہمتوں اور معاملت میں مسرور اور مصروف رہیں گے وہاں تحقیق' یعنی سچ کے سربلند رہنے کی روایت ' سرسبز یا بار آور نہیں ہو سکتی ——— لیکن کام کرنے والوں کے لئے بے آس اور ناامید ہونے کی ضرورت نہیں۔

سرپھرے ' ترغیبات سے بے نیاز اشخاص کب نہیں ہوئے اور کہاں نہیں ہوئے؟ تعداد ان کی کبھی بھی اور کہیں بھی بہت زیادہ نہیں رہی لیکن مصلحتوں سے بلند اور مناصب یا اعزازات سے بے نیاز گوشہ نشین لیکن اپنے کام میں مستعد ثابت قدم اور صاحب کردار اصحاب ہمیشہ سب ہی کمزور معاشروں میں ہوئے ہیں۔ اردو تحقیق اب بھی ایسے لوگوں سے خالی نہیں۔

جن سے مل کر زندگی سے عشق ہو جائے وہ لوگ
آپ نے دیکھے نہ ہوں گے' ہاں مگر ایسے بھی ہیں

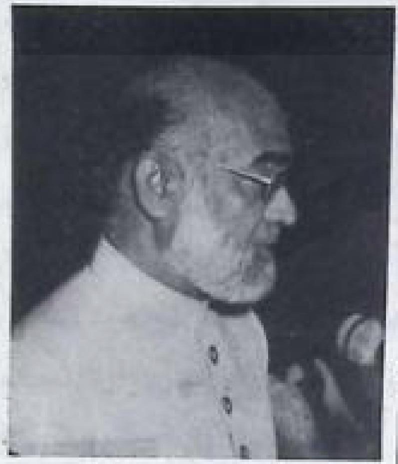

محمد صلاح الدین
مدیر اعلیٰ ہفت روزہ "تکبیر" کراچی

اردو کی ترویج میں صحافت کا کردار

دنیا کے کسی بھی معاشرے میں زبان کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں۔ اول روز مرہ کی بول چال اور دوم کتابی ادب۔

برصغیر میں اردو زبان اٹھارہویں صدی تک عام طور پر بول چال کی زبان تھی، اس کا کوئی ادبی سرمایہ تھا تو وہ صرف شعری ادب تک محدود تھا۔ نثر میں جو کچھ تصنیفات ملتی ہیں ان سب کا موضوع مذہب یا داستان گوئی ہے۔ ان موضوعات کی حدود میں نثر کو پوری طرح پنپنے کا موقع نہیں مل سکا۔ انیسویں صدی عیسوی کے آغاز کے ساتھ فورٹ ولیم کالج کا قیام اردو نثر کی ترقی میں اہم سنگ میل ثابت ہوا ہے۔ اس ادارے کے مصنفین نے داستانوں اور مذہبی قصوں کے ساتھ ساتھ معاشرت، تاریخ اور اخلاقیات جیسے

موضوعات پر کتابیں تصنیف کیں۔ جن سے ہمارے نثری ادب میں خوشگوار تبدیلی آئی، اور تنوع پیدا ہوا" تاہم علمی اور معاشرتی سطح پر اردو کے مقابلے میں فارسی کا رواج عام تھا۔ فارسی سرکاری زبان ہی نہیں تھی عام طور پر برتری اور سماجی مرتبے کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ اس زمانے میں جو اردو لکھی جاتی تھی اس کی عبارت پیچیدہ اور مرصع و مسجع اور بڑی حد تک نظم نما ہوتی تھی۔ تحریری سطح پر اردو زبان کی عدم مقبولیت کا یہ حال تھا کہ اردو کا پہلا اخبار "جام جہاں نما" (۱۸۲۲ء) جاری ہوا تو چند شماروں کے بعد اس کے مدیر نے اس اعلان کے ساتھ اس کی زبان فارسی کردی کہ "پڑھنے والے اردو عبارت کا ذوق نہیں رکھتے۔ فارسی تحریر چاہتے ہیں۔

اردو زبان کی ترقی کا دور اس وقت شروع ہوا جب ۱۸۳۵ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے فارسی کی سرکاری حیثیت ختم کردی اور اردو کو اس کی جگہ رائج کردیا۔ سرکاری زبان بننے کے بعد اردو دفاتر میں مستعمل ہو گئی اور عموماً" سرکاری سمن اور پروانے اور اکثر تجاویز و احکام اردو میں تحریر کئے جانے لگے۔ لیکن اس کے باوجود ۱۸۵۷ء بلکہ اس سے دس پندرہ برس بعد تک جتنی کتابیں نظم میں لکھی گئیں اور شائع ہوئیں ان کا آٹھواں حصہ بھی نثر میں نہیں لکھا گیا۔

اس پس منظر میں اردو زبان کی ترقی کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اردو اخبارات نے اردو زبان کو لکھنے پڑھنے کی زبان بنایا۔ "جام جہاں نما" نے جو اردو کی عدم مقبولیت کی وجہ سے فارسی میں نکلنے لگا تھا۔ فارسی اخبار میں چار صفحات کا اردو ضمیمہ شائع کرنا شروع کیا۔ مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے دہلی اردو اخبار (۱۸۳۶ء) جاری کیا اس کے ایک سال بعد سرسید کے برادر بزرگ سید محمد نے "سید الاخبار" نکالا اور یوں اردو اخبارات تیز رفتاری سے نکلنے لگے۔ ان اخبارات نے اردو نثر کے ارتقاء میں زبان کو مانجھنے، صاف کرنے اور اس کی ژولیدگی کو دور کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

انیسویں صدی کے ربع دوم میں دہلی کالج کا قیام عمل میں آیا اور یہاں کے نامور اساتذہ نے اردو زبان کو علمی زبان بنانے کی راہ میں اہم اقدامات کئے۔ اور اس کا ایک

ذریعہ انہوں نے رسائل کو بھی بنایا' ماسٹر رام چندر نے "خیر خواہ ہندی" جاری کیا۔ اس کالج سے "محب ہند" اور "فوائد الناظرین" بھی نکلے۔ ان رسائل نے اردو کو سائنسی اور علمی موضوعات سے آشنا کیا۔ یہ بات حیرت انگیز بھی ہے اور قابل افسوس بھی کہ اردو نثر کی ترقی کا جب بھی جائزہ لیا جاتا ہے تو اس میں خطوط غالب کا تذکرہ تو کیا جاتا ہے' لیکن ان سینکڑوں اخبارات و رسائل کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ جو بر صغیر کے چھوٹے بڑے شہروں سے نکل رہے تھے اور رائے عامہ کی ترجمانی اور اس کی تشکیل کے ساتھ ساتھ اردو زبان کے فروغ کا فریضہ بھی انجام دے رہے تھے۔ اردو زبان کو مقبول بنانے اور اسے لکھنے پڑھنے کی زبان کا درجہ دلانے میں اردو اخبارات نے جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اس کا تفصیلی جائزہ لینے کی ضرورت ابھی باقی ہے۔ اردو زبان کی اب تک جتنی تاریخیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں ایک آدھ باب اردو اخبارات پر بھی لکھا گیا ہے۔ لیکن یہ تذکرہ اتنا سرسری ہے کہ اس سے اردو صحافت کی لسانی خدمات کا پوری طرح اندازہ نہیں ہوتا۔ اس سلسلہ میں سب سے وقیع کام مولانا امداد صابری دہلوی مرحوم کا ہے جن کی ۵ جلدوں پر مشتمل تاریخ صحافت اردو شائع ہو چکی ہے۔ لیکن اس تاریخ کو آج کے دور تک از سر نو مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ ۳۷-۱۸۳۶ء سے انیسویں صدی کے اختتام کا زمانہ اردو صحافت کے فروغ اور ترقی کا زمانہ ہے' اس زمانے میں جہاں اردو زبان میں خود ان گنت اصطلاحات اور تراکیب الفاظ نے جنم لیا' وہاں غیر ملکی زبانوں کے ہزاروں الفاظ ابلاغ کی ضرورتوں کے تحت ہماری زبان میں در آئے اردو زبان میں ایجنٹ' مجسٹریٹ' ڈپٹی' سرٹیفکیٹ' پولیس' اسٹامپ' لیفٹیننٹ' ریونیو' فیشن' کلکٹر' سیشن' اور ریذیڈنٹ جیسے انگریزی الفاظ سب سے پہلے "جام جہاں نما" اور دہلی اخبار کے ذریعے رائج ہوئے۔

اردو نثر کی ترقی میں مرزا غالب کے خطوط کے بعد سب سے زیادہ تذکرہ سرسید احمد خان کا کیا جاتا ہے۔ سرسید احمد خان کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے "تہذیب الاخلاق" اور "سائنٹیفک سوسائٹی میگزین" کے ذریعے مسجع اور استعاراتی اسلوب کے بجائے ایک سائنسی اسلوب کی بنیاد ڈالی' جو صحافت اور عصری علوم کے لئے مناسب اور موزوں

اسلوب تھا۔ زبان کی نشو ونما میں دو متضاد قوتیں ہمیشہ کار فرما رہتی ہیں۔ ایک مرکزیت یا معیار پر اصرار کرنے والی قوت اور دوسری مرکز سے گریز کی قوت' موخرالذکر قوت زبان کو اظہار کے نئے سانچے عطا کرتی ہے۔ اس کی توانائی میں اضافہ کرتی ہے اور اسے نیا خون بہم پہنچاتی ہے' جب کہ اول الذکر قوت نشو ونما میں اعتدال ' تسلسل اور تدریج کے اصول برقرار رکھنے کا باعث ہوتی ہے' زبان کے ارتقاء کا راز ان ہی دونوں اصولوں کے معتدل اور صحت مند امتزاج میں پوشیدہ ہے۔ اردو صحافت کی ترقی پذیر دور میں صحافیوں نے ان دونوں اصولوں کا لحاظ رکھا' جس سے زبان کو فروغ حاصل ہوا۔ سرسید احمد خان کی نثر میں مرکز گریز قوت کارفرما تھی۔ شاید اسی لئے ان کے زمانے میں وہ اخبارات ' جو سرسید کی مخالفت میں نکالے گئے۔ انہوں نے سرسید نثر نگاری کی پیروڈی کی کوشش کی' لیکن اس سے بھی اردو زبان کو فائدہ ہی پہنچا۔ اور زبان جہاں سادہ اور سہل ہوتی گئی وہاں نئے نامانوس الفاظ مستعمل ہوتے گئے۔ان اخبارات میں ایک نام ""اودھ پنچ"" لکھنؤ کا تھا۔ اردو صحافت نے ہر دور میں فکر و ذہن اور زبان کی پرورش میں غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں۔ اخبارات و رسائل نے زندگی کے تمام شعبوں کی نمائندگی کی ہے۔ ان میں ادب کے ساتھ ساتھ معاشی اقتصادی ' تاریخی 'جمالیاتی ' سائنسی ' سیاحتی ' تہذیبی ' تمدنی اور معاشرتی موضوعات پر ان گنت مضامین اشاعت پذیر ہوئے۔ اسی طرح انہوں نے ہر قسم کے موضوعات پر اطلاعات اور معلومات کے خزانے سے اردو زبان کے دامن کو بھر دیا۔ یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہوا ہے کہ انیسویں صدی میں سینکڑوں کی تعداد میں ایسے اخبارات و جرائد جاری ہو چکے تھے۔ جنہیں آج کی اصطلاح میں تخصیصی صحافت (Specialised journalism) کہا جاتا ہے۔ مذہب ' ادب و تاریخ' طنز و مزاح ' قانون ' صحت و طب ' زراعت ' صنعت ' تجارت ' تعلیم ' کھیل اور عورتوں ' بچوں ' فوجیوں ' سپاہیوں کے علاوہ جانوروں کی نگہداشت تک کے موضوعات پر اخبارات منظر عام پر آئے۔ جس نوعیت کے اخبار کی ضرورت اور مانگ دیکھی جاتی تھی۔ ویسا ہی اخبار جاری کر دیا جاتا تھا' مثلاً" جب انگریز نے نئے نئے قوانین وضع کئے اور ان کا نفاذ عمل میں آیا۔ تو عوام کو ان قوانین سے واقف کرانے کے لئے قانونی اخبارات جاری ہو گئے۔

پہلا قانونی اخبار "فوائد الشائقین دہلی ۱۸۳۶ء تھا اور قانونی اخبارات جو جاری ہوئے انکی تعداد بھی پچیس سے زیادہ ہی تھی۔ ان اخبارات کے ذریعے انگریزی قوانین کی اصطلاحات کے ترجمے کا کام وسیع پیمانے پر ہوا یا بہت سی انگریزی اصطلاحات بعینہٖ رائج ہو گئیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد اردو صحافت پر انگریزوں کا عتاب نازل ہوا۔ مولوی محمد باقر گولی سے اڑا دیئے گئے متعدد صحافیوں کو قید و بند کی سزائیں سنائی گئیں۔ اکثر اردو اخبار بند ہو گئے' لیکن سرسید کی تحریک کے بعد جب مسلمانوں کو نئی قوت ملی تو ایک بار پھر اخبارات کو ابھرنے کا موقع ملا۔ اور یوں انیسویں صدی کے وسط کے بعد اردو صحافت میں از سر نو ترقی کے آثار پیدا ہوئے اور بڑے بڑے اخبارات جاری ہوئے۔ مثلاً اودھ اخبار لکھنؤ' اخبار عام لاہور' پیسہ اخبار لاہور' اودھ پنچ لکھنؤ' آگرہ اخبار' ریاض الاخبار گورکھپور' منشور محمدی بنگلور' دبدبہ سکندری رام پور' وکیل امرتسر' وطن لاہور' ایشا اٹاوہ' نیر اعظم مراد آباد' ہندوستانی لکھنؤ' انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ' رہبر دکن حیدر آباد وغیرہ اپنے زمانے کے نہایت معیاری اور بلند پایہ اخبارات تھے۔ ان سب نے زبان و بیان اسلوب و انشا پردازی' وغیرہ کے لحاظ سے اردو زبان کی خدمت کی۔ سیاسی' تہذیبی اور سماجی مسائل کے حل کرنے اور اس ضمن میں عوام کا شعور بیدار کرنے میں گراں قدر حصہ لیا۔

اس سلسلے میں علمی و ادبی رسائل کا تذکرہ بھی ناگزیر ہے۔ مثلاً "تہذیب الاخلاق' اور "دلگداز" نے فن مقالہ نگاری کے ارتقاء میں سب سے زیادہ مدد دی۔ اور بہت مختصر عرصہ میں ادب و انشاء اور فکر و تخیل کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ منشی نثار حسین کے "پیام یار لکھنؤ" نے شعر و غزل کا صحیح معیار اور اعلیٰ نمونہ پیش کیا۔ حکیم محمد علی کے "مرقع عالم" حیدر آباد دکن کا رسالہ "حسن" مولوی وحید الدین سلیم کا معارف علی گڑھ وغیرہ اپنی علمی و ادبی خدمات کے لحاظ سے بہت ممتاز رسائل تھے۔

بیسویں صدی میں اخبارات و رسائل نے پچھلی صدی کی بہترین صحافتی روایات کو اپنے اندر سمویا اور نئی روایات قائم کیں۔ یہ دور اخبارات و رسائل کی ترقی کے لحاظ سے بہت روشن اور تیز رفتار ہے۔ اس دور میں جہاں پچھلی صدی کے متعدد نمایاں

اخبارات جاری رہے۔ وہاں بے شمار نئے اخبارات و رسائل منظر عام پر آئے۔ مولانا ظفر علی خان کا "زمیندار" مولانا محمد علی جوہر کا "ہمدرد" ابوالکلام آزاد کا "الہلال" سید جالب دہلوی کا روزنامہ "ہمدم" قاضی عبدالغفار کا "روزنامہ جمہور و صلاح" ابو سعید بزمی کا مدینہ بجنور اور دہلی کے الجمعیۃ نے اردو زبان پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ قومی جوش و ولولہ دینی حمیت اور اعلیٰ انسانی قدروں کے احترام کا گہرا احساس ان اخبارات کے صفحوں پر پایا جاتا ہے ادبی رسائل میں شیخ عبدالقادر کے "مخزن" دیا نرائن نگم کے "زمانہ" حسرت موہانی کے اردوئے معلی اور اس کے کچھ عرصہ بعد مولانا ظفر علی خان کے دکن ریویو، ظفر الملک کے "الناظر" اور شاہ دِلگیر کے "نقاد" آگرہ نے اردو ادب کا مزاج ہی بدل دیا۔ مغربی اصناف ادب کو اردو زبان میں مقبول کرانے میں ان رسائل نے نمایاں کردار ادا کیا۔ شاعری میں نظم نگاری، نثر میں تنقید، افسانہ، ڈرامہ نگاری کی روایات کو ان رسائل نے مستحکم کیا اور پھر ان ہی کی تقلید میں بعد ازاں ساقی عالم گیر، نیرنگ خیال، سویرا، ادبی دنیا جیسے معیاری اور صحت مند ادبی رسائل جاری ہوئے۔

اسی دور کے صحافی بیک وقت ادیب، دانشور، عالم دین شاعر تھے۔ چنانچہ ان اخبارات و رسائل کا ادبی و علمی معیار بلند ہوتا تھا۔ مثلاً زمیندار نے سیاست میں اپنا کردار ادا کرنے کے علاوہ زبان و ادب کا معیار بھی ملحوظ رکھا۔ اس طرح الہلال نے مذہبی بیداری کے ساتھ ساتھ صحافتی نثر کو علمی اور ادبی نثر سے ہم آہنگ کیا۔ مولانا غلام رسول مہر اور عبدالمجید سالک کے "انقلاب" نے منطقی اور معروضی نثر نگاری کو رواج دیا۔ غرض کہ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۵۰ء تک تین دہائیوں کی صحافت کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اردو صحافت نے علمی فکر کا ساتھ دیا اور اس عہد کے مفکرین کے قدم سے قدم ملایا ہے۔

اردو صحافت کا ایک نیا دور برصغیر کی آزادی کے بعد شروع ہوا۔ جس میں نہ صرف موضوعات یکسر تبدیل ہو گئے۔ بلکہ اسلوب اظہار بھی بدل گیا، پہلے بدیسی حکمران مخاطب تھے۔ اب دیسی حکمران اس کے مخاطب بن گئے مسائل کی نوعیت بھی بدل گئی۔ اردو زبان چونکہ تحریک پاکستان کے دوران مسلمانان برصغیر کی زبان بن گئی تھی اور ہندو پریس ہندی زبان کا علمبردار اور اردو کا مخالف تھا۔ اس لئے پاکستان میں اردو صحافت کو جس رفتار سے

فروغ پانے کا موقعہ ملا' ہندوستان میں وہ اسی رفتار سے انحطاط کا شکار ہوئی اور ہندی اور سنسکرت الفاظ کی جبری بھرمار نے اسے ایک نیا رنگ بھی دیا' جو پاکستان کی اردو صحافت سے بالکل مختلف تھا۔ تاہم دونوں ملکوں میں عوام سے وسیع تر رابطہ کا ذریعہ یہی زبان بنی رہی اور بتدریج ہندوستان میں بھی اردو صحافت کو سنبھلنے ' پنپنے اور پھیلنے کا موقع ملتا چلا گیا لیکن پاکستان میں وسائل کی فراوانی نے اردو صحافت کو نہ صرف جدید ترین طباعتی سہولتوں اور فنی ترقی سے ہم آہنگ رکھا' بلکہ وہ انگریزی صحافت سے آگے نکل گئی' مگر ہندوستان میں ایک طرف درسگاہوں سے اردو کے اخراج اور دوسری طرف مسلمانوں کی معاشی پسماندگی نے اردو صحافت پر منفی اثرات مرتب کئے۔ تاہم "شمع" جیسے رسالوں نے اردو کا فروغ صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے روشن رکھا اور رہنمائے دکن حیدر آباد' نشیمن بنگلور' ریاست کانپور' انقلاب بمبئی' الجمعیۃ اور "دعوت دہلی" اور ماہنامہ "برہان" الہ آباد "معارف اعظم گڑھ" "بیسویں صدی دہلی' تعمیر حیات لکھنؤ" اور دیگر اخبارات و رسائل نے اردو کی ترویج و اشاعت کے لئے غیر معمولی خدمات انجام دیں۔

پاکستان میں ' جہاں بدقسمتی سے اردو قومی زبان قرار پانے کے باوجود اب تک سرکار دفاتر میں انگریزی کی جگہ نہیں لے سکی۔ صحافت ہی نے اسے سب سے زیادہ قوت بہم پہنچائی ۔ پاکستان میں اردو صحافت نے وسعت اشاعت ' فن طباعت اور موضوعاتی ہمہ گیری میں غیر معمولی پیش رفت کی ' مگر وہ اپنے شاندار صحافتی ورثہ کے بہترین عناصر کو جذب و قبول نہ کر سکی۔ اور زبان کے معیار فکر و نظر کی بلندی اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کی پاسداری میں اس کا رنگ پھیکا پڑتا چلا گیا۔ صحافت جو پہلے مشن تھی اب صنعت بن گئی جس میں مشین کو بہرحال مشن پر فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن فکر و مزاج کی اس تبدیلی کے باوجود اردو کی ترویج و اشاعت میں صحافت ہی سرفہرست ہے۔ اب تو صحافتی ادارے ہی اپنے وسائل اور طباعتی سہولتوں کے باعث اردو زبان کے بڑے اشاعتی اداروں میں ڈھل چکے ہیں۔ روزنامہ جنگ ' ماہنامہ اردو ڈائجسٹ ' قومی ڈائجسٹ ' سیارہ ڈائجسٹ ' ترجمان القرآن ' ہفت روزہ تکبیر ' ہفت روزہ حرمت ' اور متعدد دوسرے صحافتی ادارے اپنے اخبارات و جرائد کے علاوہ سینکڑوں معیاری کتب کی طباعت و اشاعت کے ذریعے

اردو کے فروغ میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ شاہکار' کا معیاری سلسلہ کتابت بھی در حقیقت ایک صحافی کی قابل قدر کاوش کا نتیجہ ہے۔

آج پاکستان میں ایک ہزار سے زیادہ اخبارات و جرائد ملک کے گوشے گوشے میں ربط باہم کا' رابطہ عوام کا' اہل علم و دانش کی فکر و نظر سے استفادہ کا' مختلف شعبہ ہائے زندگی سے متعلق عصری علوم اور جدید ترین تحقیقات سے آگہی کا' نئی نئی اصطلاحات کی وضع و ترویج کا' اردو کے نثری و شعری ادب میں کئے جانے والے نئے تجربات سے واقفیت اور اس کے دامن میں آنے والی نئی تخلیقات سے تعارف کا' مختلف سرکاری اداروں اور دفتروں میں اردو کے رواج و نفوذ کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ یہ صحافت ہی ہے' جو قوم کی زبان اور اس کے خیالات و خواہشات اور اس کی آرزوؤں اور امنگوں کے اظہار کا سب سے مؤثر اور طاقتور وسیلہ ہے۔ ہماری دو صدیوں پر پھیلی ہوئی تاریخ اس واضح حقیقت کی آئینہ دار ہے کہ دنیا میں شاید ہی کسی ملک کی صحافت نے اپنی قومی زبان کی ترویج و اشاعت اور اس کی توسیع میں وہ کردار ادا کیا ہو' جو اردو زبان کے سلسلہ میں صحافت نے ادا کیا ہے۔ ہماری تاریخ اس امر کی بھی گواہ ہے کہ اردو نے ہندوستان میں ہندی اور انگریزی اور پاکستان میں انگریزی اور مقامی زبانوں کے دباؤ اور ہر نوعیت کی مزاحمتوں کے باوجود اپنی قوت کا لوہا منوایا ہے۔ یہ صحافت کے راستے سے اگر قومی و صوبائی اسمبلیوں میں اور سینٹ جیسے قانون ساز اداروں میں اپنی جگہ بنا چکی ہے۔ تو انشاء اللہ اسی صحافت کی قوت و توانائی کے ذریعہ یہ سرکاری دفاتر میں بھی اپنا مقام حاصل کر کے رہے گی۔

یہ مضمون میں آپ کی خدمت میں ایک پبلشر کی حیثیت سے پیش کر رہا ہوں جہاں فضل و دانش کا ذکر تو نہ ہو گا البتہ ایسی عملی اشارت ضرور میسر ہو گی جس سے آپ اب تک نا آشنا رہے ہیں۔ یہاں میں ان عملی مشکلات کا ذکر کروں گا جو ایک ایسے ناشر کی راہ میں حائل ہوئی ہیں جس نے اردو زبان میں سائنس کے موضوعات پر اب تک سب سے زیادہ کتابیں شائع کی ہیں۔

اردو میں سائنس کی کتابیں تیار کرنے اور تیار کروانے میں سب سے بڑی مشکل اس

بے یقینی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے جو ہم سب کے دلوں میں گھر کر چکی ہے کہ سائنس کی تعلیم انگریزی زبان کے علاوہ دنیا کی کسی اور زبان میں بالعموم اور اردو میں بالخصوص دی ہی نہیں جاسکتی۔

maablib.org

maablib.org

ڈاکٹر آغا سہیل

ہمارا ذریعہ تعلیم اور اردو

پاکستان میں ذریعہ تعلیم وسیع تر معانی اور مفہوم میں اردو نہیں ہے۔ جس کے بہت سے اسباب اور موانع ہیں اولاً" نظام تعلیم میں بنیادی نقائص موجود ہیں ثانیاً" نوکر شاہی بجائے خود ایک رکاوٹ ہے ثالثاً" سائنس اور ٹیکنالوجی کے مضامین اردو زبان میں منتقل نہیں ہوئے رابعاً" اردو زبان کی وسعت و پنہائی کے باب میں ایک طرف کم سوادی اور دوسری طرف عدم واقفیت کی بنا پر احساس کم تری موجود ہے خامساً" علمی اور ادبی زبان کے نایاب ذخیرے سے محض سہل انگاری کی بنا پر عدم توجہی پائی جاتی ہے۔

آج سے تقریباً" ۴۰ چالیس قبل برصغیر کے ایک نامور ماہر تعلیم خواجہ غلام السیدین نے نظام تعلیم پر اپنے مخصوص انداز میں جس طرح تبصرہ کیا وہ کچھ یوں تھا۔

"جب میں برصغیر کے نظام تعلیم پر غور کرتا ہوں تو مجھے قدیم یونان کی ایک کہانی یاد آتی ہے کہ کسی بادشاہ کا یہ پسندیدہ طریقہ تھا کہ وہ روزانہ ایک نئے مہمان کی پر تکلف ضیافت کرتا تھا ازاں بعد اسے ایک مخصوص مسہری پر استراحت کی دعوت دیتا اگر مہمان مذکور اس مسہری میں اپنے قدو قامت کے ساتھ سما جاتا تو اس کی جان بچ جاتی ہے بصورت دیگر اگر وہ مسہری سے چھوٹا رہ جاتا تو اسے اس قدر کھینچا جاتا کہ اس کی ہڈی پسلی سرمہ بن

جاتی اور اگر اس کی بدبختی سے اس کے پاؤں مسہری سے نکل جاتے تو انہیں تراش دیا جاتا۔ غرضیکہ ہمارا نظام تعلیم یہی مسہری ہے جس میں ہم اپنے طلبہ اور طالبات کے اذہان کو ٹھونس دیتے ہیں۔

آج بھی ہمارا نظام تعلیم من و عن وہی ہے' آزادی کے بعد بھی نہ تو ہم نے دنیا کی تیز رفتار ترقی کو سمجھا اور نہ اپنی حیثیت اور قومی ترقی کے اہداف کا تعین کیا۔ اکیسویں صدی ہماری دہلیز پر کھڑی ہے اور ہم بدستور اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں سانس لے رہے ہیں بلکہ ہمارے بعض برخود غلط' مجہول الفکر' عاقبت نااندیش نام نہاد اور کم سواد علماء بلکہ علمائے سوء ہمیں رجعت قہقری اختیار کرنے کے ہمہ وقت مشورے دیتے رہتے ہیں جس کے نتیجے میں ہمارا فکری نظام منتشر اور ترقی کا راستہ دھندلا ہو چکا ہے۔

۴۲۔ ۱۸۴۱ء میں جب دہلی کالج قائم ہوا تھا تو مذکورہ کالج بجائے خود بھی ارتقاء کے راستے کا ایک اہم سنگ میل ثابت ہوا کہ اس نے قدیم درس نظامیہ اور پاٹ شالائی نظام تعلیم سے نجات دلائی دوسرے اس کے نصاب کا تعین قومی امنگوں اور تقاضوں کو کسی حد تک ملحوظ رکھ کر کیا گیا تھا۔ پھر پروفیسر رام چندر کی ادارت میں اسی کالج سے جو تین مجلے بعنوان محب ہند' فوائد الناظرین اور قرآن السعدین شائع ہوتے تھے انہوں نے اس وقت کے نوجوان طلبہ کی ذہنی تربیت و تہذیب کی' ان میں محمد حسین آزاد' نذیر احمد ذکاء اللہ اور پیارے لعل آشوب شامل تھے۔ جو اردو زبان کی اور علم و ادب کی نشاۃ الثانیہ کے اہم ارکان ثابت ہوئے اور یہی اصحاب تھے جو سرسید احمد خان کی علمی ادبی اور اصلاحی تحریکوں کے رکن بنے غرضیکہ آئین نو سے جو نہیں ڈرے اور تقاضائے وقت کو سمجھتے ہوئے ترقی کی شاہراہ پر قوم کو لیکر چلے جن کی بدولت آج بھی معاشرے میں تھوڑی بہت سوجھ بوجھ اور ترقی کی روشنی نظر آتی ہے اور خواتین و حضرات یاد رہے کہ اس ترقی میں اردو ہی ذریعہ تعلیم تھی اور اسی ذریعہ تعلیم نے علم و ادب کے ساتھ ساتھ سائنس اور ٹیکنالوجی کو فروغ بخشا اور اذہان کی تربیت و تہذیب بھی کی اور اذہان کے افق کو وسعت و پہنائی بھی بخشی۔ اس وقت ہمارا نظام تعلیم اردو انگریزی کے مابین پھنسا ہوا ہے اور آدھے تیتر آدھے بٹیر کا سا معاملہ بنا ہوا ہے۔ بچوں سے لے کر نوجوانوں تک کے اذہان منتشر اور

پریشان ہیں کہ ہم نہ تو مغرب کے بن سکتے ہیں اور نہ مشرقی رہ سکتے ہیں اور اب تو مصداق اس مصرعے کے ہیں کہ "کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا"۔

نوکر شاہی انگریزی زبان کے بل بوتے پر اپنا رعب اور دبدبہ قائم رکھنا چاہتی ہے اور انگریزی زبان کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا چاہتی ہے۔ اپنے اس تفخر اور گھمنڈ میں جسے ایک نشہ سمجھنا چاہئے اور جو مغربی استعمار کے رخصت ہونے کے باوجود نوکر شاہی کے خیرہ سر افراد کے سروں سے نہیں اترا ہے اس نے قوم کو بھی نقصان پہنچایا اور ملک کو بھی' چنانچہ نظام تعلیم میں اسکولوں سے لیکر یونیورسٹیوں کی سطح تک جو انگریزی زبان علمی سطح پر نہیں بلکہ نمائشی سنوبری کے طور پر وباء کی طرح پھیلی ہوئی ہے وہ ایک ایسی دیمک ہے جس نے قوم اور ملک کو چاٹ کر کھوکھلا کردیا ہے۔ یعنی ہمارے بچوں اور نوجوانوں کو نہ تو اردو زبان پر قدرت ہے اور نہ انگریزی میں مہارت ہے چنانچہ قوم علوم سے محروم ہے اور سائنس اور ٹیکنالوجی سے بیگانہ ہے۔

چونکہ ہم دونوں زبانوں سے کماحقہ آگاہ نہیں لہٰذا کم علم ہیں انگریزی سے اس لئے واقف نہیں کہ یہ سچ مچ ہماری زبان نہیں ہے اور الاماشاء اللہ ملک کی اکثریت اس سے نابلد ہے۔ اردو اور دوسری قومی زبانوں کے بارے میں ہم احساس کم تری کا شکار ہیں' اردو اور دوسری قومی یا علاقائی زبانوں کا وقار بحال کرنا بھی اسی نظام تعلیم کا جز ہے لیکن افسوس کہ ہمیں صحیح معنی میں نہ اس کا ادارک ہے نہ شعور۔

خواتین و حضرات!

انگریزی زبان کے بارے میں میں کسی تعصب کا اظہار نہیں کر رہا اور نہ اردو سے اس کا موازنہ اور مقابلہ کرتا ہوں لیکن اپنے ان احباب سے میں ضرور مخاطب ہوں جو انگریزی زبان کے تموّل کے گن گاتے اور اردو زبان کی کم مائیگی کا رونا روتے ہیں اور کہتے کہ صاحب انگریزی بین الاقوامی زبان ہے جس میں جملہ علوم متداولہ موجود ہیں کسی حد تک ان کی یہ بات بادی النظر میں درست بھی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ چند صدیوں سے اور چند صدیوں تک مغرب کا استعماری نظام جہاں جہاں پہنچا وہاں کے قومی علمی و ادبی اور ثقافتی خزانوں سے بالواسطہ اور بلاواسطہ انگریزی زبان نے استفادہ کیا اور سائنس اور

ٹیکنالوجی کو اپنے اندر جذب کیا سو آج اس میں یہ تموّل نظر آتا ہے لیکن کیا خود یورپ میں انگریزی زبان کا جادو ہر خطّے ہر علاقے اور ہر ملک میں چلتا ہے؟ کیا فرانس ' جرمنی ' روس اور اسکنڈے نیوین ممالک میں انگریزی اسی طرح موجود ہے جس طرح اپنے سابق غلام ملکوں میں آج تک رائج رہی ہے۔ اور کیا مذکورہ ممالک سائنس اور ٹیکنالوجی میں انگریزی داں طبقات سے پیچھے ہیں۔ دور کیوں جایئے۔ جاپان ' کوریا اور چین کی سائنسی ترقیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے مذکورہ مفروضے کو اور اس کی حقیقت کو دیکھ لیجیے۔

خواتین و حضرات!

کسی زبان کے تموّل کو ناپنے کا ایک پیمانہ اور بھی ہے جو سب سے زیادہ وقیع اور اہم ہے یعنی علم لسانیات کی رو سے وہ زبان سب سے زیادہ متموّل ہوتی ہے۔ جس میں آوازیں (جو حروف تہجی کی علامتوں میں ظاہر ہوتی ہیں)۔ بکثرت ہوں ' انگریزی بیچاری کے پاس محض چھبیس آوازیں ہیں یعنی اے سے زیڈ تک کے حروف تہجی ہیں ' عربی اور فارسی کی تمام آوازیں اور ہندی زبان کی کل آوازیں اردو زبان کے حروف تہجی میں موجود ہیں علاوہ ازیں معرب مفرس اور ہند لفظوں کے خزانوں اور ان کے اصوات کے اردو کے پاس زیر زبر پیش اور دوسری علامتوں سمیت پچاس سے زیادہ آوازیں موجود ہیں انگریزی زبان کی اسی تہی دامانی کو برنارڈ شا نے محسوس کیا تھا لیکن کرچھ بھی نہیں کرسکا چنانچہ یہ کمی جوں کی توں موجود ہے اس زبان پر آج اگر آپ سائنس اور ٹیکنالوجی میں مغربی اقوام پر تفوق حاصل کرلیں اور اس میں اپنی اجارہ داری قائم کرلیں تو کل سے آپ اپنی زبان سمیت اپنا مقام خود پیدا کرلیں گے۔ آپ کا احساس کمتری بھی ختم ہوجائے گا اور قومی زبان کو اپنا کھویا ہوا وقار بھی مل جائے گا۔

اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے میں ایک عذر یہ بھی پیش کیا جاتا رہا ہے کہ اس کا رسم الخط ' ٹائپ اور کمپیوٹر کی سرعت رفتاری سے ہم آہنگ نہیں لیکن نوری نستعلیق کمپیوٹر پر منتقل کرکے اور تیز رفتار ترقی کی دوڑ میں شامل ہو کر ہم اس عذر لنگ کو بھی باطل قرار دے چکے ہیں ہمارے اخبارات رسائل ڈائجسٹ اور کتابیں شائع ہو کر دور دراز خطوں اور علاقوں تک پہنچ رہی ہیں مشرق وسطیٰ یورپ امریکہ اور کناڈا تک اردو پہنچ

چکی ہے اور اسکا دائرہ عمل پھیلتا جا رہا ہے۔ جارج گریرسن کے لسانی کمیشن کے مطابق بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش میں اردو ہی لینگو فرینکا ہے پوری دنیا میں تیسرے نمبر پر لکھی پڑھی اور بولی جاتی ہے۔ اور اگر اس کے باوجود اپنے ہی علاقوں میں اپنے جائز حقوق حاصل کرنے سے اردو محروم رہے تو اس میں ہمارے قومی سیاسی اور ثقافتی ارباب بصیرت کی کم التفاتی کو دخل ہو گا۔ جن کے وقتی مصالح پر مبنی فیصلے مستقبل کی نسلوں کو نقصان پہنچانے کا موجب ہوں گے کیونکہ سوویت یونین ٹوٹنے کے بعد مستقبل کے ممالک کا جو نقشہ بنتا نظر آ رہا ہے اس میں اردو کا کردار انگریزی اور فارسی سے بھی زیادہ وقیع ہے کہ اردو کے متعدد پلوں ہی کی نہیں ان گنت فلائی اوورز کی ہمیں ضرورت پڑے گی۔

maablib.org

[illegible]

maablib.org

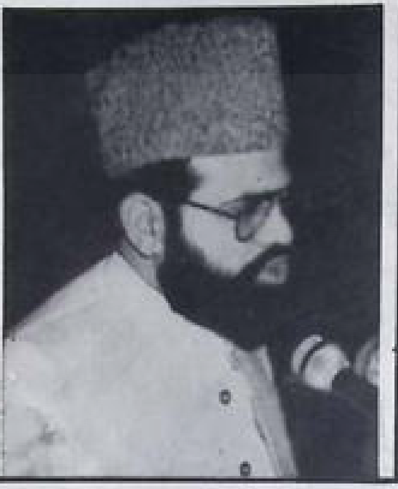

سید حامد سعید کاظمی

اردو کی ترویج میں علمائے دین کی خدمات

آج اس پروقار تقریب میں جہاں علم و ادب کے میدان کی قد آور شخصیات کی جلوہ نمائی ہے' مجھ سے کوتاہ قامت کی شرکت جہاں ایک اعزاز ہے وہاں ایک آزمائش بھی ہے۔ شاید ہر اعزاز ایک آزمائش ہوا کرتا ہے۔ مجھے اردو ادب میں علماء کے کردار پر لب کشائی کرنا ہے۔ اگرچہ مجھے علماء دین میں شمار کرنے پر شاید آپ کو کسی تنقید کا سامنا کرنا پڑے مگر۔

نافہم پارسا تو سمجھتے ہیں مجھ کو رند　　　　فہمیدہ رند جانتے ہیں پارسا مجھے

جو لوگ "رند" کے لفظ پر معترض ہوں وہ "فہمیدہ" سے بہل جائیں گے۔

اگر آج سے پہلے کسی دوست کو اردو ادب میں علماء کے کردار اور حصے پر شک رہا ہے تو انشاء اللہ آج اس مقالے کے بعد جاتا رہے گا۔ بخدا میری مراد یہ نہیں ہے کہ چونکہ یہ مقالہ میں پیش کر رہا ہوں اس لئے اب علماء کا حصہ بھی ادب میں شامل ہو جائے گا' عرض یہ ہے کہ اس مقالے کی روشنی میں علماء کا کردار اردو ادب میں نکھر کر سامنے آ جائے گا۔

پہلے پہل میں نے کوشش کی کہ اس مقالے میں علماء کے کردار کا ذکر اصناف سخن کے حوالے سے کروں' شعراء میں' مقالہ نگاروں میں' ناول نویسوں میں' انشاء پردازوں

میں' سوانح عمری لکھنے والوں میں' نقادوں میں' لیکن اس میں تکرار کا اندیشہ تھا۔ بہت سے عالم دین شاعر' ادیبوں میں شامل ہیں' بہت سے تنقید نگار' خاکہ لکھنے والوں میں شمار ہوتے ہیں اس لئے میں نے عصری ترتیب کو اصناف کے اعتبار پر ترجیح دی کہ تکرار و اعادہ تو دراصل کم فہموں اور ناسمجھوں کے لئے ہوتا ہے' مگر پسندیدہ نغمہ بھی تکرار کے بعد سر اور لے سے آزاد معلوم ہونے لگتا ہے۔ اگرچہ جناب ضمیر جعفری کا فتویٰ کچھ اور ہے۔

چلو اچھا ہوا' ناداں ہیں وہ' کم فہم ہوں میں بھی
غلط فہمی ہمیشہ دو سمجھداروں میں ہوتی ہے

صدر مجلس! عربی کے بعد اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جس میں قرآن کی اتنی تفاسیر' ترجمے' حدیث و فقہ کی مستند کتابوں کے ترجمے' شریعت اسلامیہ سے متعلق کتابیں' مقالے اور مضامین' مسلمانوں کے عروج و زوال کی تاریخی داستانیں' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' صحابہ کرام اور دنیائے اسلام کی دیگر مشہور و معروف شخصیات کی سیرتیں اور سوانح عمریاں' اس تفصیل اور اس کثرت سے موجود ہیں۔ اس کے علاوہ اردو کی نشوونما چونکہ مسلمانوں اور خاص طور پر علماء اور صوفیا کے ہاتھوں ہوئی اس لئے اس میں تہذیب و تمدن' آداب و اعتقادات اور اصول و قوانین رچ بس گئے ہیں اور اس لئے اردو کا مزاج بھی اسلامی ہو گیا ہے۔

ہمارے اسلاف کے ہاں بچے کی تعلیم کے ابتدائی مراحل ہی میں فقہ' حدیث اور تفسیر کے ساتھ ساتھ ادب' انشاء اور حکمت کی تعلیم بھی ضروری خیال کی جاتی تھی۔ یہ اس زمانے کا لازمی نصاب تھا جو ہر طالب علم کو زیورِ علم اور زیورِ اخلاق سے آراستہ کرتا تھا۔

اردو ادب میں علماء کے کردار کا صحیح معنی میں احساس و اعتراف نہ ہونا شاید ان کے موضوعات کے مختلف اور محدود ہونے کے باعث ہو۔ مذہبی مسائل و معلومات' قرآن کی تفسیر و تشریح' سیرت نگاری اور چند نصائح شاید ادب کے لئے زیادہ زرخیز زمین فراہم نہیں کرتے لیکن ضرورت و اہمیت کے اعتبار سے انہی موضوعات کو سلاست و روانی اور قادرالکلامی کی زیادہ ضرورت ہے۔

اردو کی ترویج و ترقی پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ اردو پلی بڑھی ہی علماء و صوفیاء کے زیر سایہ ہے اس کھیتی کی آبیاری ہی انہی بزرگوں کی مساعیٔ جلیلہ و جمیلہ سے ہوئی۔ حضرت امیر خسرو رحمتہ اللہ علیہ جتنے بڑے عالم دین تھے اتنے ہی بڑے صوفی تھے اور اتنے ہی بڑے شاعر۔ حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاء نے بھی اپنی بخشش کی دعا ان کے سینے کے سوز کے طفیل مانگی ہے۔ "الٰہی مرا بسوز سینہ ایں ترک بہ بخش" اور علامہ اقبال نے بھی ایک جگہ اسی انداز کی دعا مانگی ہے۔

؎ عطا کن شور رومی سوز خسرو!

ابھی تک اردو ادب کی تاریخ میں تحقیق و جستجو کے بعد حضرت امیر خسرو سے پہلے اردو کا کوئی شاعر نظر نہیں آتا۔ یہ وہ وقت تھا کہ جب پورے برصغیر میں اوڑھنا بچھونا فارسی ہی تھا۔ اس وقت اس نابغۂ روزگار نے اپنے اشعار سے اپنی کہہ مکرنیوں اور پہیلیوں سے اردو ادب میں اَنمٹ نقوش چھوڑے ان کے کلام کا سوز و گداز حسن و دلنوازی، رنگینی و رعنائی جذب و شوق، اور وارفتگی و بے خودی حضرت محبوب الٰہی ہی کے فیض و برکت سے تھی۔۔

"آج رنگ ہے ماہا رنگ ہے"

ایسو پیر پایا نظام الدین اولیاء

یا

چھاپ تلک سب چھین لی رے موسے نیناں ملائی کے

اس کے علاوہ شادی بیاہ کے گیت تو حضرت امیر خسرو کے دور سے آج تک اپنی افادیت میں اپنی مثال آپ ہیں۔ وہ آج بھی جب گائے جاتے ہیں تو ان میں وہی تازگی اور نیا پن محسوس ہوتا ہے جیسا کہ ابتداء میں بھی رہا ہو گا۔ کون ہے کہ جس کی پلکیں لڑکی کی رخصتی کے وقت حضرت امیر خسرو کے اس گیت پر بھیگ نہ جاتی ہوں۔۔

کاہے کو بیاہی بدیس رے سکھی بابل مورے

ولی دکنی جو ایک عرصے تک اردو شاعری کے بابا آدم تصور کیے جاتے رہے۔ شیخ سعد اللہ گلشن کے مرید بھی تھے اور شاگرد بھی۔ ولی نے اردو غزل کو جو بنیاد فراہم کی آج

تک غزل اُنھی بنیادوں پر قائم ہے۔ میں نے حضرت شیخ سعد اللہ گلشن کا ذکر اس لئے بھی کیا کہ وہ مرید و خلیفہ تھے حضرت شیخ عبدالاحد مجددی رحمتہ اللہ علیہ کے جو حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی کے پوتے تھے۔ حضرت شیخ عبدالاحد کا لقب "گل" تھا۔ اس رعایت سے شیخ سعد اللہ نے گلشن تخلص کیا۔ خواجہ محمد ناصر صاحب جو حضرت خواجہ میر درد علیہ الرحمتہ کے والد گرامی تھے وہ حضرت سعد اللہ گلشن کے مرید و شاگرد تھے۔ جنھوں نے اپنا تخلص اس گل و گلشن کی رعایت سے عندلیب کیا اور پھر یہ سلسلہ اس طرح آگے بڑھا کر حضرت خواجہ ناصر عندلیب کے بیٹے حضرت خواجہ میر نے اپنے والد کے تخلص عندلیب کی رعایت سے اپنا تخلص درد رکھا اور ان کے چھوٹے بھائی نے اس رعایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اثر تخلص کیا۔ حضرت خواجہ میر درد بھی بہت بڑے عالم دین اور بہت بڑے صوفی شاعر تھے۔ وہ حضرت بہاء الدین شاہ نقشبند رحمتہ اللہ علیہ کی اولاد میں سے تھے۔ ان کا تصوف اور مذہبیت رسمی نہ تھی۔ بلکہ ان کی تمام ہستی میں رچی بسی تھی اس نے ان کے اندر ایک لازوال استقامت بے مثال استغناء زبردست قناعت اور مخصوص میلان پیدا کر دیا تھا۔ جیسا کہ ہمیں ان کے کلام میں جا بجا اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ ۔

پردے کو تعیّن کے درِ دل سے ہٹا دے
کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا

؎ اس ہستی خراب سے کیا کام تھا ہمیں　　اے نشۂ ظہور یہ تیری ترنگ ہے

؎ ظالم یہ صید دل سرِ فتراک سے ترے
اس وقت سے بندھا ہے کہ تُو نے سوار تھا

بہت سے اشعار تو حضرت خواجہ میر درد کے اپنے وقت سے ابھی تک زبان زد ہر خاص و عام ہیں۔ ۔

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

؎ تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو　　دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

جدید اردو ادب کا پہلا دور اصلاحی دور کہلاتا ہے۔ جنگ آزادی کی ناکامی اور ملک پر انگریزوں کے تسلط نے مسلمانوں کو سخت زبوں حالی اور مصائب میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ عجیب کس مپرسی اور بے بسی کے عالم میں تھے۔ ان حالات میں داستان گوئی اور غزل سرائی بے وقت کی راگنیاں تھیں۔ چنانچہ سرسید کی سرکردگی میں ایک گروہ مسلمان ادیبوں اور شاعروں کا ایسا پیدا ہوا جس نے اردو ادب اور اس کے ذریعے پوری قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ سرسید کے ساتھ مولانا حالی' ڈپٹی نذیر احمد' مولانا شبلی نعمانی' محسن الملک مولوی چراغ علی وغیرہ اس گروہ کے اہم اور ممتاز ارکان تھے۔ ان بزرگوں نے ادب میں مقصدیت پیدا کی اور اسے اصلاحِ تہذیب و اخلاق کا ذریعہ بنایا۔ یہ سب کے سب مذہبی لوگ تھے۔ عالمِ دین تھے۔ یہ لوگ صرف ادیب ہی نہ تھے قوم کے رہنما بھی تھے۔ ان کا دل قوم کے درد سے لبریز تھا۔ اور یہ مسلمانوں کو ذلت کے گڑھے سے نکالنا چاہتے تھے۔ اپنے تمام تر علم و فضل اسلامیت اور مشرقیت کے باوجود سوائے مولانا شبلی اور ڈپٹی نذیر احمد کے سب کے سب مغربی تہذیب و تمدن اور علم و ادب سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ اور مسلمانوں کو دُنیوی ترقی کے لئے اسی راہ پر چلانے کے خواہشمند تھے۔ اس سلسلے میں ہم ان کے خلوص اور نیت پر کسی قسم کا شبہ نہیں کرتے۔ کیونکہ اس زمانے میں انہوں نے جو کچھ کیا وقت کے تقاضوں کو سمجھ کر کیا۔ نہایت دردمندی اور خلوص کے ساتھ قوم کی فلاح کے لئے کیا۔ ان مُصلح ادیبوں کی کوششوں سے بہت جلد اردو میں بامقصد اور پاکیزہ ادب کا ایک ذخیرہ جمع ہو گیا۔ جس نے مسلمانوں کے فکر و عمل پر دور رَس اثرات مرتب کئے اور اردو ادب نے ایک نیا اور قابلِ قدر رخ اختیار کیا۔ اس ادب نے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا۔ انہیں اپنی پستی و ذلت کا احساس دلایا اور اس سے نکلنے اور فلاح و ترقی کے راستے پر گامزن ہونے کا حوصلہ عطا کیا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس نفع کے ساتھ ایک نقصان یہ بھی ہوا کہ ان میں سے چند حضرات کی اور خاص طور پر سرسید کی تحریروں نے مغرب پرستی اور مادیت کی راہ بھی دکھلائی۔ اور مغربی تعلیم و تہذیب کے ساتھ ساتھ یہ لَے بڑھتی گئی۔ ان بزرگوں نے فارسی کی بجائے انگریزی کی تقلید کی اور اردو میں مضمون و انشاء نگاری کے ساتھ ساتھ تنقید' سوانح

نگاری ناول اور افسانہ کا بھی آغاز ہوا۔ سر سید نے پہلی مرتبہ اردو میں ہر قسم کے موضوعات پر صاف اور سادہ زبان میں مضامین لکھے۔ مولانا حالی نے تنقید نگاری اور سوانح نگاری کی بنیاد ڈالی۔ نذیر احمد نے ناول نگاری کی ابتداء کی شبلی نے اسلام کے نامور فرزندوں اور ان کے لازوال کارناموں کو تاریخ کی روشنی میں پیش کیا اور اس حلقے سے کچھ دور مولانا محمد حسین آزاد نے زبان و ادب میں تحقیق کی شمع روشن کی۔

ان بزرگوں نے اگرچہ انگریزی ادب کی تقلید کو اپنا شعار بنایا تھا۔ مگر ان کا ذہن پوری طرح مشرقی تھا۔ اور یہ لوگ انگریزی زبان سے براہ راست واقف بھی نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انکی تحریروں میں مغربی اثرات بہت محدود ہیں۔ اور مغربیت سے کہیں زیادہ مشرقیت اور اسلامیت نمایاں ہے خاص طور پر مولانا شبلی نعمانی کی تحریروں میں کہ ان کی تحریریں اسلام اور اسلامی تہذیب و تمدن کی نقیب ہیں۔

یہ دور مسلمانانِ ہند کی تاریخ کا نہایت اہم دور تھا۔ مسلمان مغربی تعلیم حاصل کر کے دنیوی مفادات کے حصول میں لگ گئے تھے اور اس کا نام انہوں نے ترقی رکھا تھا۔ جو شخص جتنا زیادہ مغرب کا نقال تھا وہ اسی قدر روشن خیال اور جدت پسند سمجھا جاتا تھا۔ مسلمان ہوتے ہوئے اسلام' اسلامی قوانین اور احکام پر نکتہ چینی کرنا اور ان میں ترمیم و تنسیخ کا مطالبہ کرنا جدت پسندی اور روشن خیالی میں شامل تھا۔ اس گمراہی اور عقلیت پرستی کو روکنے اور اسلام کی اصلیت و صداقت کو اجاگر کرنے کے لئے مولانا شبلی اور ابوالکلام آزاد' سید سلیمان ندوی' مولانا عبدالماجد دریابادی' خواجہ حسن نظامی ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے وقیع اور قابل قدر مضامین لکھے اور صالح ادب کا نمونہ پیش کیا۔ خواجہ حسن نظامی کے انشائیے اردو میں اپنا جواب آپ ہیں۔ انہوں نے یہ بات ثابت کر دی کہ ایک صاحب دل اور صاف نظر ادیب کے لئے موضوعات کی کمی نہیں۔ معمولی سے معمولی چیز بھی اعلیٰ سے اعلیٰ ادب کا موضوع بن سکتی ہے جھینگر' مچھر' دیا سلائی ایسے معمولی اور حقیر موضوعات پر نہایت نفیس' دلکش اور سبق آموز مضامین لکھے۔ مولوی عبدالحق نے تو اپنی پوری زندگی ہی اردو زبان اور ادب کی خدمت کے لئے وقف کر دی۔ ان کے مقدمات' خطبات' تنقیدات اور سیرتی خاکے ان کی وسیع النظری'

گہرے مطالعے، عالمانہ وقار، پاکیزہ جذبات، سادگی، سنجیدگی اور خلوص کے آئینہ دار ہیں۔ ۱۹۳۵ء سے اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔ یہ تحریک دراصل اشتراکیت کی تحریک تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اردو ادب پر اشتراکیت پسند ادیب چھا گئے۔ یہ لوگ مذہب و اخلاق رسم و رواج، عقائد و تمدن غرض ہر قدیم چیز سے منحرف تھے۔ اس کے خلاف آواز بلند کرنا اور اسے نیست و نابود کر دینا بہت ضروری سمجھتے تھے۔ اس دور میں بھی کچھ مسلمان ادیب ایسے ضرور تھے کہ اس تحریک سے ہمیشہ الگ رہے۔ اور عام مسلمانوں کی تحریکات خاص طور پر تحریک پاکستان کی ترجمانی کرتے رہے۔ ان ادیبوں میں مولانا صلاح الدین احمد مولانا غلام رسول مہر، رئیس احمد جعفری، پروفیسر یوسف سلیم چشتی اور جناب عبدالرحمٰن طارق پیش پیش تھے۔

اس مجموعی گفتگو کے بعد انفرادی ذکر بھی ان بزرگوں کا ضروری سمجھتا ہوں۔ سرسید احمد خان جنہوں نے اسلام کو عقل و قانونِ قدرت کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش میں بہت سے اسلامی حقائق کا انکار بھی کیا ہے۔ معجزات یا خوارق عادات کو بھی ماننے سے انکار کیا ہے، یہاں تک کہ واقعۂ معراج کو بھی عالمِ خواب کا واقعہ قرار دیا ہے، سرسید مسلمانوں کے مُسلّمہ عقیدہ کے برخلاف بائبل میں تحریفِ لفظی کے بھی قائل نہیں تھے۔ اور انہوں نے بائبل کی بھی تفسیر لکھ ماری چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جان آرنلڈ نے بائبل کی تفسیر کی بابت سرسید کو ایک خط میں لکھا کہ اگر بائبل کی تفسیر کا کام مسلمانوں ہی کے ہاتھوں میں ہو جائے۔ تو پھر عیسائیوں کو یہ ثابت کرنا دشوار نہ ہو گا کہ اگر انجیل صحیح ہے تو (نعوذ باللہ) قرآن ضرور جھوٹ ہے۔ سرسید کی ان تحریروں پر خود مولانا حالی جو ان کے بہت بڑے مدّاح ہیں۔ جنہوں نے حیاتِ جاوید لکھ کر سرسید کی شخصیت کو اور ان کے نظریات کو مستحکم کیا۔ وہ بھی اس کا اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکے، فرماتے ہیں کہ بعض آیاتِ قرآنی کے وہ ایسے معانی بیان کرتے تھے جن کو سن کر تعجب ہوتا تھا کہ کیوں کر ایسا عالی دماغ آدمی ان کمزور اور بودی تاویلوں کو صحیح سمجھتا ہے۔ سرسید نے اصلاح کے جوش میں ان چیزوں کی بھی اصلاح کرنی چاہی جس میں اصلاح کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ سرسید کی ان تحریروں کے اثرات پھر آگے چل کر اتنے خطرناک ثابت ہوئے کہ دینی اور مذہبی

معاملات میں گمراہ خیالات نے جنم لیا۔ بے راہ روی یہاں تک بڑھی کہ ایک جگہ مولانا نیاز فتح پوری یہ تک لکھ گئے کہ "مذہب کی بنیاد وجودِ خدا پر قائم ہے۔ اور خدا کا تصور جس جس طرح مختلف اوقات میں انسان نے کیا ہے اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کو انسان کا خالق کہنا شاید اتنا موزوں نہیں جتنا انسان کو خدا کا خالق کہنا" اس قسم کی گمراہ کن تحریروں سے کتابوں کے اوراق اکثر سیاہ ہوئے ہیں۔ اس کو ہم اپنی بدقسمتی کے علاوہ اور کیا نام دے سکتے ہیں۔ سر سیدؒ کی شخصیت کی ان سب کمزوریوں کے باوجود یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ کہ ایک مایوس اور دل شکستہ قوم میں ایک نئی زندگی کی لہر دوڑا دی۔ اور اسے میدان عمل میں اتار دیا۔ اس کے علاوہ سر سیدؒ کا ایک اور کارنامہ ایسا ہے جس کا ذکر علیحدہ سے کرنے کو جی چاہتا ہے' وہ ہے سر سید کی کتاب "خطبات احمدیہ" یہ کتاب سر سیدؒ نے سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمدؐ" کے جواب میں لکھی تھی۔ اس تصنیف کے لئے انہوں نے لندن تک کا سفر کیا اور اسلام اور بانیؐ اسلام کی سیرت پر لگائے گئے "ولیم میور" کے بیہودہ اور لغو الزامات کا جواب اتنے مُسکت انداز میں دیا کہ اس سے بہتر اور مدلّل جواب ممکن نہیں ہے۔ سر سید نے اس کتاب کو جس جوش و خروش کے ساتھ لکھا اور اس سلسلہ میں جو زحمتیں اٹھائیں اس کے متعلق مولانا حالی لکھتے ہیں۔

"اس کتاب کے لکھتے وقت جس قدر جوش سر سید کے دل میں تھا اور مالی مشکلات ان کو اس کے شائع کرنے میں پیش آئیں اور جو سخت محنت اس کے لکھنے میں ان کو کرنی پڑی اس کا کسی قدر اندازہ ان کے ان خطوط سے ہوتا ہے جو انہوں نے سیّد مہدی علی خان کے نام بھیجے۔ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں' ان دنوں ذرا دل کو شورش ہے "ولیم" صاحب کی کتاب کو میں دیکھ رہا ہوں اس نے دل کو جلا دیا اور اس کی ناانصافی اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا اور مصمم ارادہ کر لیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا کتاب لکھ دی جائے۔ اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے۔"

دیکھا آپ نے سر سید کا جذبہ یہ ایک عجیب بات ہے کہ مذہب کے معاملہ میں کوئی

مسلمان کتنا ہی آزاد خیال کیوں نہ ہو مگر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات والا تبار وہ محبوب ذات ہے کہ اگر کوئی بھی کسی قسم کی منفی بات کہے تو وہ برداشت نہیں ہوتی اس میں جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ اس کتاب میں سرسیّد نے ان اعتراضات کا مدلّل جواب دیا جو آنحضرتؐ کے کثرتِ ازدواج اور اسلام کے تعدّدِ ازدواج اور اجازتِ طلاق پر کیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ جہاد پر جو اعتراضات کیے گئے تھے اور اسلام پر بزورِ شمشیر پھیلنے کا جو الزام عائد کیا گیا تھا ان کا بھی نہایت مدلّل اور مفصّل جواب دیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے تورات اور انجیل کی آیتوں سے ثابت کیا کہ ان کتابوں میں آنحضرتؐ کی نبوّت کی بشارت دی گئی ہے۔ "ولیم میور" نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ اسلام انسانی معاشرت و شائستگی کا ساتھ نہیں دے سکتا بلکہ یہ اس کے حق میں مضر ہے۔ سرسیّد نے اس کی بھی پرزور تردید کی اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ثابت کیا کہ اسلام ایک نہایت شائستہ اور مہذّب مذہب ہے اور انسانی معاشرہ صحیح معنوں میں شائستہ اور مہذّب اسی وقت ہو سکتا ہے جب وہ اسلامی تعلیمات پر عمل کرے۔

مولانا محمد حسین آزاد اپنی بے مثل انشاء پردازی کی وجہ سے اردو نثر نگاری میں بہت ممتاز ہیں وہ ایک بے مثل انشاء پرداز ہونے کے علاوہ اردو کے سب سے پہلے محقق، ادبی مورخ، نقّاد، رمز نگار، تعلیمی مصنف اور ماہر لسانیات بھی تھے۔ آبِ حیات، نیرنگِ خیال، دربارِ اکبری، اور سخن دانِ فارس ان کے شاہکار ہیں۔

جدید اردو ادب میں مولانا الطاف حسین حالی جس اہمیت اور امتیاز کے مالک ہیں وہ کسی اور ادیب یا شاعر کو نصیب نہیں۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ حالی کو جس طرح نظم نگاری میں یدِ طولیٰ حاصل تھا اس طرح وہ نثر نگاری پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ انھیں مختلف اصنافِ ادب میں اولیّت کا درجہ حاصل ہے ایک طرف وہ جدید شاعری کے موجد اور اردو کے پہلے قومی شاعر ہیں اور دوسری طرف اردو نثر نگاری اور تنقید نگاری کا آغاز بھی انھی سے ہوتا ہے۔ مقدمۂ شعر و شاعری حالیؔ کا ایسا تنقیدی کارنامہ ہے جس کی مثال آج بھی اردو ادب میں نہیں ملتی۔ "حیاتِ سعدی، یادگارِ غالب، حیاتِ جاوید، مولانا حالیؔ کے سوانحی کارنامے ہیں۔ حالی ایسے پاکیزہ سیرت، ادیب و شاعر اردو ہی کیا دنیا کی دوسری

زبانوں میں بھی مشکل ہی سے ملیں گے۔ ان کے نفس کی جفت اور پاکیزگی ان کے مضامین نظم و نثر میں رواں دواں نظر آتی ہے۔

مولانا شبلی نعمانی کو مہدی افادی نے خاتم المصنفین کہا ہے۔ اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ شبلی اردو کے بہت بڑے ادیب تھے ان کے مقالات و دیگر تصنیفات میں جو تبحر علمی، وسعتِ معلومات بھری تحقیق اور اس کے ساتھ ساتھ جو رنگین و دلکش اندازِ بیان ملتا ہے یہ انداز شاید ہی اردو کے کسی اور ادیب کے یہاں ملے۔ شبلی اسلام کے پُرجوش حامی و مبلغ تھے۔ ان کی تقریباً تمام تصنیفات اسلام یا تاریخ اسلام سے متعلق ہیں شبلی کے یہاں ادب اور مذہب دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ شبلی صرف ایک ادیب اور عالم دین ہی نہ تھے بلکہ بہت بڑے مورخ اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے علمبردار تھے۔ انہوں نے ادبی علمی، تاریخی، تعلیمی، تنقیدی اور سوانحی ہر قسم کے مضامین لکھے شبلی نے مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کے لئے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ اسلامی تاریخ کی جلیل القدر اور لازوال ہستیوں کی زندگی اور سیرت کا سیر حاصل جائزہ لیا اور اس طرح مسلمانوں کے سامنے قابلِ تقلید شخصیات کے بے مثال کارنامے پیش کئے۔

ندوہ اور دار المصنفین جیسے اداروں کا قیام بھی شبلی کا بڑا کارنامہ ہے الفاروق، المامون، النعمان، الغزالی، سیرتِ مولانا روم ان کی قابل قدر اور زندہ تصنیفات ہیں، سیرت النبیؐ جلد اول و دوم ان کے عمر کے آخری حصے کی تصانیف ہیں جس پر ان کو بجا طور پر ناز تھا اور اپنی اس تصنیف کو بخشش کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک جگہ انہوں نے کہا ہے۔

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی\
مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا\
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتم\
خدا کا شکر ہے کہ خاتمہ بالخیر ہونا تھا

اور ان کے خاتمہ بالخیر کے بعد اس تصنیف کی تکمیل ان کے شاگرد سید سلیمان ندوی نے کی۔ مولانا شبلی کے یہ لائق شاگرد اور جانشین علم و فضل میں یگانۂ روزگار تھے وہ نہ

صرف ایک بہت بڑے عالم دین تھے بلکہ تاریخ عالم پر بھی گہری نظر رکھتے تھے ان کا سب سے بڑا کارنامہ "سیرت النبیؐ" کی تکمیل ہے۔ اگر وہ کچھ نہ لکھتے اور صرف "سیرت النبیؐ" ہی اپنی یادگار چھوڑ جاتے تو بھی ان کا نام اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہتا۔ انہوں نے اپنے مضامین میں اپنے استاد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ان مغربی افکار کی دھجیاں بکھیر دیں جو اسلامی اصولوں و احکام کے منافی تھے۔ انہوں نے اسلامی اصول و قوانین کو جدید حالات و مسائل کی روشنی میں پیش کر کے ان کی صداقت و اہمیت کو واضح کیا۔ سیرت النبیؐ 'سیرتِ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا' ارض القرآن' خطباتِ مدارس اور رحمتِ عالم ان کی نہایت ممتاز اور زندۂ جاوید کتابیں ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد اردو ادب میں کئی حیثیتوں سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اگرچہ ان کی سیاسی سرگرمیوں نے انہیں علمی و ادبی مشاغل کو جاری رکھنے کا موقع نہیں دیا۔ اس کے باوجود انہوں نے اردو انشاء پردازی' علم و ادب' مذہب و سیاست کو جس طرح متاثر کیا اسے ہم نظرانداز نہیں کر سکتے۔ ان کے سیاسی اور مذہبی نظریات کی مخالفت کے باوجود اہلِ علم کے نزدیک مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی کے نام اسیری کے دوران لکھے ہوئے خطوط کا مجموعہ غبارِ خاطر اردو خطوط نویسی میں ایک اچھوتی تحریر ہے۔ "الہلال اور البلاغ" میں لکھے گئے مضامین اور ان کی خود نوشت سوانح "تذکرہ" بھی قابلِ ذکر کارنامے ہیں ان کے یہاں نثر نگاری کے دوران اشعار کا برمحل اور بے دریغ استعمال بھی خاصے کی چیز ہے۔ اگرچہ ان کی تحریر اس وقت کے حوالے سے نثر نگاری کا شاندار کارنامہ سمجھی جاتی تھی۔ لیکن اب جب کہ اردو میں سلاست و روانی اور سادگی کی حکمرانی ہے' ان کی تحریر اپنی جاذبیت کھو بیٹھی ہے جس کا اظہار آج کے مشہور مزاح نگار مشتاق یوسفی نے اپنی تازہ ترین تصنیف "آبِ گم" میں اس طرح کیا ہے

"مولانا ابوالکلام آزاد اپنا سن پیدائش اس طرح بتاتے ہیں۔ "یہ غریب الدیار عہد ناآشنائے عصر' بیگانہ خویش' نمک پروردہ ریش' خرابہ حسرت کہ موسوم بہ احمد' مدعو بابی الکلام ۱۸۸۸ء مطابق ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ میں ہستی عدم سے اس عدم ہستی میں وارد ہوا اور تہمت حیات سے متہم" اب لوگ اس طرح نہیں لکھتے۔ اس طرح پیدا بھی نہیں ہوتے' اتنی

نجالت، طوالت و اذیت تو آج کل سیز رین پیدائش میں بھی نہیں ہوتی۔

مولانا محمد علی جوہر بھی ہمارے وہ قومی ہیرو ہیں جن کی طبیعت اور مزاج قوم کے درد میں سیمابی کیفیات کا حامل تھا۔ انہوں نے بھی قومی اور ملی سیاست میں اہم کردار ادا کیا اپنی شاعری سے اپنی تقریروں سے اور اپنی صحافت کے ذریعے انہوں نے آزادی کی اہمیت کو روشناس کروایا۔ اس سلسلے میں انہوں نے قیدوبند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ اس مشہور شعر کے خالق مولانا محمد علی جوہر ہی تھے۔

قتلِ حسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

فرنگی استبداد سے عمر بھر پنجہ آزما رہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں۔

یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے ہماری گردنوں پہ ہو گا اس کا امتحاں کب تک
عروسِ بخت کی خاطر تمہیں درکار ہے افشاں
ہمارے ذرہ ہائے خاک ہوں گے زرفشاں کب تک

مولانا عبدالماجد دریا ابادی بھی اپنے اخبار "صدق" میں ایک مستقل کالم "سچی باتیں" کے عنوان سے لکھتے تھے۔ برِ صغیر میں خصوصاً اور تمام دنیا میں عموماً جہاں بھی کوئی بات اسلام کے عقائد یا تعلیمات کے خلاف انہیں نظر آتی تھی وہ اس پر مخصوص انداز میں نقد و جراح اس کالم میں کرتے تھے۔ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے جملوں اور فقروں کے ذریعے خلافِ اسلام حرکات پر اس طرح طنز کے تیر چلاتے تھے کہ نشانہ بھی خطا نہ ہوتا تھا اور اسلامی تعلیمات بھی واضح ہو جاتی تھیں انہوں نے سیرت، تفسیر، فلسفہ، نفسیات، تاریخ، سیاست افسانے اور ڈرامے، غرضیکہ تمام اصناف پر قلم اٹھایا ہے اور حق یہ ہے کہ کامیاب رہے ہیں۔ ان کی کتابیں ہمارے ادب میں خوشگوار اضافہ ہیں۔

مولانا ظفر علی خان بھی ساری زندگی فرنگی استبداد سے پنجہ آزما رہے انہوں نے اپنے اخبار "زمیندار" کے ذریعے حکومت پر شدید اور کڑی تنقید کی۔ قادیانیت کے خلاف انہوں نے اپنی شاعری کو استعمال کیا ان کی شاعری کا آہنگ اچھوتا اور بالکل علیحدہ ہے۔

سرکار کی بلند عمارت پر جب بوم نے آ کر پَر رگڑا
بول مست قلندر دھر رگڑا بول مست قلندر دھر رگڑا

ان کے ہاں شاعری اپنی روایت کی پابند نہ تھی بلکہ شاعری کو انھوں نے اپنی روایت کا پابند بنایا تھا۔ مولانا ظفر علی خان اپنی نعتیہ شاعری کی وجہ سے اردو ادب میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔

اردو ناول کی ابتداء مولوی نذیر احمد کے ہاتھوں ہوئی انھوں نے اپنے ناول کو معاشرتی۔ اخلاقی اور مذہبی اصلاح کا ذریعہ بنایا۔ "توبۃ النصوح" نذیر احمد کا سب سے مشہور اور اہم ناول ہے۔ طبقۂ نسواں کی اصلاح کیلئے انھوں نے خصوصی توجہ کی اور "مراۃ العروس"۔ "بنات النعش" میں ان کی اصلاح اور رہنمائی کا فرض بڑی خوبی سے انجام دیا۔ "ابن الوقت" اور فسانۂ مبتلا بھی بہت اہم اور اور دلچسپ سبق آموز ناول ہیں۔

معروف معنوں میں تو ہم علامہ اقبال کو عالمِ دین نہیں کہہ سکتے۔ لیکن ان کے افکار و تخیلات تمام تر اسلامی تھے۔ یہی نہیں بلکہ کسی عالمِ دین کی ادبی تحریروں میں اور شاعری میں وہ تخیلات اور افکار نہیں ملتے جن کے ذریعے حضرتِ علامہ نے اردو میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ اردو شاعری کو نئی تراکیب سے روشناس کرایا۔ ان کے یہاں اس درجہ تدین پایا جاتا ہے کہ بغیر قرآن و حدیث کے مطالعہ کے ان کے کلام کو اکثر مقام پر سمجھنا بھی ناممکن ہے۔ ان کی شاعری قوم۔ معاشرے۔ ادب۔ سیاست۔ غرض یہ کہ زندگی کے ہر پہلو پر اثر انداز ہوئی۔ اقبال کے کلام سے قوم کو جو روشنی ملی جو رہنمائی میسر آئی ایک نئے وطن کے حصول کے لئے جو ولولۂ تازہ دلوں کو ملا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایک عام آدمی کا کلام نہیں ہے۔

خصوصی صلاحیتوں کا حامل دماغ ہی فکر کی ان بلندیوں کو پہنچ سکتا ہے۔ ان کے کلام کا مطالعہ ذہنوں کی تطہیر کرتا ہے۔ فکر کو بلندی عطا کرتا ہے اور سوچ کو گہرائی بخشتا ہے۔

علامہ راشد الخیری اس دور کے مصلحینِ قوم میں ایک بڑا نام ہیں۔ انھوں نے خاص طور پر مسلمان عورتوں کی اصلاح اور ان کی حمایت میں ناول لکھے ان کے یہاں عورتوں

کی مظلومیت اور مردوں کے ظلم و ستم، خاص موضوع ہیں۔ دنیائے ادب میں وہ مصورِ غم کے لقب سے مشہور ہیں۔ "صبحِ زندگی" "شامِ زندگی، شبِ زندگی، عروس کربلا، حیاتِ صالحہ، بنت الوقت، نانی عشو، اور ماہِ عجم وغیرہ ان کے مشہور ناول ہیں۔

مولانا مودودی صرف ایک عالم و مفکر ہی نہ تھے، وہ ایک سنجیدہ اور باوقار ادیب و انشاء پرداز بھی تھے۔ ان کا اسلوب اپنے اندر ایک انفرادیت رکھتا ہے۔ زبان و بیان کی سلاست، سادگی، پرزور استدلال، متانت و سنجیدگی، عالمانہ وقار اور زورِ بیان ان کے طرزِ تحریر کی خصوصیات ہیں۔ وہ ایک دینی رہنما تھے ان کا سب سے بڑا مقصد پاکستان میں اسلامی نظام کا قیام تھا۔

حضرت امیر مینائی کا ذکر رہا جا رہا ہے ان کا شمار برِصغیر کے ممتاز شعراء میں ہوتا ہے۔ مخدوم شاہ مینا لکھنوی رحمتہ اللہ علیہ ان کے سلسلۂ اجداد میں سے تھے جن کی رعایت سے وہ مینائی مشہور ہوئے۔ جناب امیر مینائی اسیر کے شاگرد تھے اور غزل میں ایک منفرد مقام کے مالک تھے۔ مشہور و معروف مصرعہ جو اکثر ضرب المثل کے طور پر بولا جاتا ہے۔

وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

حضرت امیر مینائی ہی کی ایک غزل کا ہے۔ ان کا ایک شعر سنیے جس سے ان کی شاعری کے مزاج کی وضاحت ہوتی ہے وہ چھوٹی بحر میں اچھی غزلیں کہتے تھے۔

باغباں کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی   بھیجنی ہیں ایک کم سن کیلئے

یوں تو وہ غزل کے استاد تھے۔ مگر ان کا اصل میدان نعت گوئی ہے۔ اور اس میدان میں وہ اردو ادب کے صف اول کے نعت گو شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں۔ امیراللغات کی تیاری حضرت امیر مینائی کا بہت بڑا کام ہے بلکہ ان کا سرمایۂ عمر ہے۔ اس کتاب کی صرف دو ہی جلدیں چھپ سکیں۔ جن میں صرف "الف" کا بیان ہے تیسری جلد جو "ب" کے بیان میں ہے وہ تیاری کر پائے تھے کہ بلاوا آگیا اور وہ خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ وگرنہ یہ ایک بہت بڑا کام تھا جو ہوتے ہوتے رہ گیا مولانا حسرت موہانی جن کو دنیا نے ایک سیاسی لیڈر اور ایک شاعر کی حیثیت سے ہی جانا اور ان کی تمام تر ذہنیت ....

لایا ہے دل پہ کتنی خرابی
اے یار تیرا حسن شرابی

کے پردے میں چھپی رہی۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ نہ صرف عالم دین تھے بلکہ سلسلۂ قادریہ کے صاحبِ اجازت بزرگ تھے علماء فرنگی محل کے شاگرد اور مرید تھے۔ ان کی شخصیت میں بے پایاں روحانی قوت اخلاقی جرات اور خلوص و صداقت تھی۔ آزادی کا ایسا شیدائی کوئی کم ہو گا کہ جس نے طرح طرح کی ایذائیں مصیبتیں اور عقوبتیں جھیلی ہوں۔ لیکن ان کے پائے ثبات میں کبھی لغزش نہ آئی وہ اپنے خیال کے اظہار میں نہایت بے باک تھے۔ کسی سے زندگی بھر مرعوب نہ ہوئے بلکہ دوسروں پر چھا جانے کی قوت رکھتے تھے۔ جس طرح انہوں نے سیاست میں ہنگامہ برپا کر کے آزادی۔ حق گوئی اور جرأت کی بے نظیر مثالیں پیش کی اسی طرح انہوں نے اپنے افکار اور خیالات سے شعر کا درجہ بھی بلند کیا ان کی شاعری اعتدال متانت اور حُسنِ ذوق کی شاعری ہے۔ اردو کے بہت پرانے گمنام شعراء کا کلام اکٹھا کر کے انہیں حیاتِ نو اور شہرتِ تازہ بخشی جس طرح اردو شاعری پر ان کا بہت بڑا احسان ہے' اس سے کہیں زیادہ ہماری قومی سیاست ان کی قربانی کی ممنون ہے۔

اب میں ایک ایسے عالم دین کا ذکر کرنے لگا ہوں جن کا ذکر بہت پہلے ہو جانا چاہئے تھا مگر غزل کا آخری شعر مقطع ہوتا ہے ان کی حیثیت بھی اسی مقام کی متقاضی ہے اور وہ ہیں امامِ اہلِ سنت اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمتہ اللہ علیہ۔ اعلیٰ حضرت کی شخصیت کے مختلف پہلو ہیں۔ وہ بہت بڑے عالمِ دین تھے۔ وہ بہت بڑے علمِ جفر کے ماہر تھے۔ ان کے بعد اب اس میدان کا کوئی مرد نظر نہیں آتا حساب دان ایسے کہ ڈاکٹر سر ضیاء الدین جیسی شخصیت جو دنیا کے مسلمہ ماہرِ ریاضی تھے ان سے ریاضی کے چند ایسے لاینحل عقدے حل کروانے کے لئے جن کے حل کے لئے ڈاکٹر صاحب خود بے بس تھے' پہنچتے نظر آتے ہیں۔ وہ دو قومی نظریے کے اوّلین علمبرداروں میں تھے اور یہ پاکستان کا قیام انہی شخصیات کا مرہونِ منت ہے۔ اعلیٰ حضرت شاعر بھی اتنے بڑے تھے کہ اردو کی نعتیہ شاعری میں حضرت محسن کاکوروی اور اعلیٰ حضرت سے بڑا نام نظر نہیں آتا۔ اردو کی

اس صنف شاعری میں جو نام بھی آتا ہے وہ اعلیٰ حضرت کی نعت کے کمال کو نہیں پہنچ سکا۔ جہاں تک ان کے علم و فضل کے کمالات کا تعلق ہے۔ اس کے لئے اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ جو شخص صرف سترہ برس کی عمر میں مروّجہ متداولہ علوم و فنون سے فارغ التحصیل ہو کر جائیداد کے الجھے ہوئے جھگڑے کے بارے میں پہلا فتویٰ دے سکتا ہو' جس کی مختلف مضامین پر تصنیفات کی تعداد سینکڑوں میں ہو' اس غیر معمولی دماغ کے لئے کوئی غیر معمولی دماغ ہی کچھ لکھ سکتا ہے' میں صرف یہاں ان کی شاعری کے متعلق گفتگو کروں گا۔ اعلیٰ حضرت کو رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم سے جو مخصوص والہانہ محبت و عقیدت تھی وہ طرح طرح سے ان کے کلام میں جلوہ گر ہے۔ ان کے تمام کلام کا وزن' وقار اور حسنِ جمال رسولِ کریم ہی کی گراں مایہ شخصیت کے محور پر گردش کرتا نظر آتا ہے۔ اعلیٰ حضرت کی نعتیہ شاعری کی بڑی خصوصیات یہ بھی ہیں کہ باوجود اس والہانہ عقیدت کے جو ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے تھی آپ کی شاعری شرعی حدود سے کہیں تجاوز کرتی نظر نہیں آتی۔ اور ان کی شاعری پر نظر ڈالیں تو ایک غزل گو شاعر اپنے تبحرِ علمی کے ساتھ تمام تر تعزیراتِ شرعیہ کا خیال رکھتے ہوئے اپنے عشق کے اظہار میں ایک ادائے خاص کے ساتھ نکتہ سرا نظر آتا ہے۔

ایک شعر دیکھئے کتنا تغزل جھلک رہا ہے۔

دل عبث خوف سے پتّا سا اڑا جاتا ہے
پلّہ ہلکا سہی بھاری ہے' بھروسہ تیرا!

ان کی نعت کے دو شعر دیکھئے:

جنت ہے ان کے جلوے سے جو پائے رنگ و بو
اے گل ہمارے گل سے ہے گل کو سوالِ گل
ان کے قدم سے سلعۂ غالی ہوئی جناں
واللہ تیرے گل سے ہے جاہ و جلالِ گل

کتنے معطّر اشعار ہیں آپ نے اندازہ کیا ہوگا کہ اس لفظ گل کی تکرار نے کیا گل کھلائے ہیں۔

دو شعر اور ملاحظہ ہوں

خوش رہے گُل پہ عندلیب خارِ حرم مجھے نصیب
میری بلا بھی ذکر پر ' پھول کے ' خار کھائے کیوں

خرد سے کہدو کہ سر جھکائے گماں سے گزرے گزرنے والے
پڑے ہیں یاں خود جہت کے لالے کسے بتائے کدھر گئے تھے

اور اب سب سے آخر میں عہدِ حاضر کے حوالے سے اردو ادب کی خدمت کرنے والے علماء میں ایک وقیع اور قابلِ ذکر نام ہے صاحبزادہ نصیر الدین نصیرؔ کا جو گولڑہ شریف کے موجودہ سجادہ نشین کے صاحبزادے ہیں ۔

خدا کا شکر زمانے کی قدر دانی ہے
جوان بھی نہ ہوئے تھے کہ پیر کہلائے

قادر الکلام شاعر ہیں روایتی غزل کو حیات نو دینے والے۔ پرانے لہجے میں نئی بات کہنے والے نصیر الدین نصیرؔ ایک منفرد اور ممتاز طرز کے حامل ہیں۔

مرے نزدیک تو عذرِ خطا ' انکار رحمت ہے
خطاکاروں کو اندازِ خطا اب تک نہیں آیا

شباب آیا حجاب آیا ادائیں آگئیں ان کو
نہیں آیا تو اندازِ وفا اب تک نہیں آیا

نصیرؔ اس نے دمِ رخصت نہ کیا کیا کھائی تھیں قسمیں
مگر دیکھو ذرا ! وہ بے وفا اب تک نہیں آیا

"پیمانِ شب" غزلوں کا مجموعہ "دیں ہمہ اوست" نعتوں کا مجموعہ "آغوشِ حیرت" فارسی رباعیات کا مجموعہ چھپ کر منظرِ عام پر آچکے ہیں اور اہلِ نظر اور اہلِ ذوق سے داد پاچکے ہیں۔ اس کے علاوہ نثر میں راہ و رسم منزلہا اور نام و نسب دو کتابیں بڑے معرکہ کی ہیں یہ آج کل مرزا عبدالقادر بیدلؔ پر کام کر رہے ہیں بیدلؔ کے اشعار کا مفہوم' تشریح اور اس مضمون کے دیگر اساتذہ کے اشعار کو یکجا کر رہے ہیں۔ یہ بہت بڑا کام ہے

جو اس دور میں صرف صاحبزادہ نصیرالدین نصیری کر سکتے ہیں۔

مختصراً یہ کہ اردو کی ابتداء بھی علماء و صوفیا کے ذریعے ہوئی اور اس زبان کا ادب انہی بزرگوں کی بدولت پروان چڑھا۔ برصغیر میں علماء و صوفیا کے علم و فضل کے کمالات جہاں دینی اور مذہبی میدان میں ہیں وہاں شعر و ادب کی محافل میں بھی یہی بزرگ صدر نشین نظر آتے ہیں۔

مشکور حسین یاد

اردو زبان اور ہماری تعلیم و تربیت

اردو زبان کو عالمی تناظر میں دیکھا جائے تو ہمیں صداقت پر مبنی تعلقِ انسانی کے ایسے بہت سے انفس و آفاق نظر آسکتے ہیں جن کو دیکھ کر ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہے لیکن ہم اردو بولنے والے کس منہ سے اس طرح کا کوئی دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہم نے اپنے طور پر تو آج تک اپنے جغرافیائی حدود تک میں بھی اردو کی وسیع دامانی سے صحیح معنی میں کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ میری مراد برصغیر ہند و پاک کے اردو بولنے والوں سے ہے۔ چلئے اہلِ ہند کے بارے میں تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ انہیں اپنی غلامی کے دبیز پردوں سے نکلنے کے لئے یعنی اپنی شناخت کے لئے یا اسے بہانہ بنانے کے لئے اردو کو ہندی کہہ کر پکارنا بھی ضروری تھا اور اس میں سنسکرت کے بھاری بھرکم الفاظ داخل کرنا بھی لازم تھا لیکن ہم اہلِ پاکستان کو کیا امر مانع تھا کہ ہم نے تاحال اردو کی وسیع دامانی سے کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا۔ اسی لئے میں نے اپنی بات کو پاکستان تک محدود رکھتے ہوئے اپنی اس آج کی گفتگو کا عنوان اردو زبان اور ہماری تعلیم و تربیت قرار دیا ہے۔ ویسے اردو زبان کی وسیع دامانی کے ضمن میں ایک دعویٰ بلا خوفِ تردید کیا جا سکتا ہے اور اس کی تائید آج کے ہر نوع کے ماہرینِ لسانیات پوری صداقت کے ساتھ کر سکتے ہیں کہ جس طرح اردو زبان دنیا کی دوسری زبانوں کے الفاظ کو ان کی جملہ بنیادی خصوصیات سمیت اپنے دامن میں جذب

کر سکتی ہے اس کی مثال دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی زبان بھی پیش نہیں کر سکتی۔

بہر حال جیسا کہ میں نے ابھی ابھی عرض کیا ہے میرا موضوع تو اردو زبان اور ہماری تعلیم و تربیت ہے اور آپ یہ تو اچھی طرح سے جانتے ہی ہوں گے کہ اگر آپ صحیح معنی میں کسی قوم کا حال احوال معلوم کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے یہ معلوم کریں کہ اس قوم کے افراد کا رویہ اپنی زبان اور تعلیم و تربیت کے ساتھ کس نوعیت کا ہے۔ اور اس طرح سے غور کرتے ہوئے آپ پر یہ حقیقت بھی واضح ہو گی کہ زبان اور تعلیم و تربیت تو ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ آپ کا رویہ اپنی زبان کے ساتھ تو بہت عمدہ ہو لیکن آپ کی تعلیم و تربیت عمدہ نہ ہو۔ یا آپ اپنی تعلیم و تربیت کی طرف تو بہت توجہ دے رہے ہوں لیکن آپ کی زبان آپ کی غفلت کا شکار ہو۔ چنانچہ دیکھ لیجئے جس طرح ہم اہل پاکستان اپنی زبان کی اہمیت کو آج تک نہ سمجھ پائے اسی طرح ہم پر اپنی تعلیم و تربیت کی اہمیت بھی تاحال واضح نہیں ہو سکی اور ستم بالائے ستم خالی چھلکے شور و غل سے قطع نظر ہم نے تعلیم و تربیت کے ضمن میں زبان کی اہمیت کو سنجیدگی کے ساتھ پوری طرح سمجھنے اور برتنے کی کوشش تو کبھی کی ہی نہیں۔ ہمارا یہ رویہ ہماری تعلیم و تربیت اور زبان کے لئے ہی نہیں ہماری پوری قومی زندگی کے لئے کس قدر خطرناک ثابت ہوا اور ہو رہا ہے اس کے بھیانک پن اور ہولناکی کا اندازہ لگانے کی توفیق بھی ہمیں کبھی نہیں ہوئی۔

ہم اپنی زبان سے اس طرح غافل ہیں اور ادھر قرآن پاک کے سورہ روم کی ۲۲ ویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے و من آیتہ خلق السموات والارض واختلاف السنتکم وا لوانکم۔ ان فی ذالک لایت للعالمین یعنی قرآن میں انسانوں کی مختلف زبانوں کو علما اور دانشوروں کے لئے اسی طرح آیاتِ الٰہی قرار دیا ہے جس طرح کہ آسمانوں اور زمین کو آیاتِ الٰہی قرار دیا ہے۔ گویا ہر زبان اپنے بولنے والوں کے لئے ایک آسمان کی طرح ہے یا ایک کہکشاں کی طرح ہے یا ایک نظامِ شمسی کی طرح۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر زبان اپنے بولنے والوں کے لئے ایک الگ سرچشمہ حیات ہے جس کی جگہ کوئی دوسری زبان ہر گز ہر گز نہیں لے سکتی خواہ یہ زبان کتنی بھی عظیم اور کیسی بھی بڑی ترقی یافتہ زبان کیوں

نہ ہو۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ ہر خطۂ ارض کی زبان اس خطّے کے جوہرِ آب و گل کو اپنے اندر جذب کر کے اس خطّے کے لوگوں کے لئے ایک جہانِ معانی فراہم کرتی ہے۔ اور اسی جہانِ معانی پر اس خطّے کے لوگوں کی باوقار زندگی اور گوناگوں ترقی کا انحصار ہوتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی قوم کے افراد کی اپنی کوئی زبان نہیں یا اس قوم کے افراد اپنی زبان کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تو وہ قوم کبھی بھی ترقی یافتہ قوموں میں شامل ہونے کی سعادت حاصل نہیں کر سکتی۔ ترقی یافتہ ہونا تو دور کی بات ہے ایسی قوم کے افراد تو صحیح معنی میں ایک سانس بھی سنبھل کر نہیں لے سکتے کیونکہ ہر خطۂ ارض کی زبان ہی اس خطۂ ارض کے لوگوں کو استحکام کے ساتھ جینا اور مضبوطی کے ساتھ اپنی زمین پر قدم جمانا سکھاتی ہے اور ظاہر ہے جب آپ کے پاؤں مضبوطی کے ساتھ زمین پر جمیں گے اسی وقت آپ آگے کی طرف قدم بھی اٹھا سکتے ہیں۔ اور یوں کسی قوم کی اپنی زبان اس قوم کی عزت و آبرو ہی نہیں ہوا کرتی اس کی سب سے بڑی طاقت اور توانائی بھی ہوا کرتی ہے۔ اسی لئے جس قوم کے افراد اپنی زبان کی عزت اور آبرو کرنا نہیں جانتے اس قوم کے عزائم اور ارادے خواہ کتنے بھی جلیل و جمیل کیوں نہ ہوں کبھی بروئے کار نہیں آسکتے۔ دور جانے کی ضرورت نہیں ہم اہلِ پاکستان اس کی ایک واضح اور بیّن مثال ہیں۔ ہم نے آج تک اپنی زبان کو اس کا صحیح مقام نہیں دیا تو دیکھ لیجئے ہم کس بری طرح سے خراب ہو رہے ہیں بلکہ ہماری خرابی کی کوئی انتہا ہی نظر نہیں آرہی ہے۔ ممکن ہے زبان کی اہمیت کے بارے میں میری یہ بات مبالغہ نظر آرہی ہو لیکن حاضرین کرام ایسی بات ہرگز نہیں اگر آپ ذرا توجہ سے غور فرمائیں تو آپ پر میرے قول کی صداقت واضح ہو جائے۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ آپ دنیا کی ترقی یافتہ سے ترقی یافتہ زبان پر مہارت حاصل کر لیں اسے اپنی روز مرہ زندگی میں رچا بسا لیں جس کے نتیجے میں آپ اس اعلیٰ زبان کے ذریعہ دنیا بھر کے علوم اور معلومات تو یقیناً حاصل کر سکتے ہیں لیکن یاد رکھیے اپنی زبان کو پس پشت ڈال کر آپ اپنے اعلیٰ کردار کی تشکیل ہرگز ہرگز نہیں کر سکتے۔ تشکیل کردار کے لئے ہر معاشرے کے افراد کو اپنی زبان ہی سے فیض حاصل کرنا پڑتا ہے۔ جیسا کہ میں نے ابتدا میں عرض کیا تھا کہ زبان کا تعلق انسان کی تعلیم و تربیت سے

براہ راست ہے اور بہت گہرا ہے لیکن انسان کو ایک غیر زبان خواہ وہ کتنی بھی ترقی یافتہ کیوں نہ ہو محض تعلیم یافتہ بنا سکتی ہے جبکہ اس کی اپنی زبان تعلیم کے ساتھ ساتھ اس کی تربیت بھی کرتی ہے اور یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ جب تک تربیت نہ ہو تعلیم انسان کو ایک اچھا روبوٹ تو بنا سکتی ہے لیکن ایک اعلیٰ انسان نہیں بنا سکتی۔ ہم ابھی تک تعلیم کو تربیت سے الگ دیکھنے کے عادی ہیں اسی لئے تو جب تعلیمی انحطاط کا ذکر آتا ہے تو ہم سب سے پہلے یہ شکایت کرتے ہیں کہ میاں آج کل کا طالب علم تو ایک جملہ بھی ٹھیک طرح نہیں لکھ سکتا۔ اس کرب انگیز حقیقت کی طرف ہماری توجہ ہی نہیں جاتی کہ ہم زبان کے ایک فقرے کی غلطی کو تو دیکھ رہے ہیں لیکن ہمارے طالب علم کی زندگی کی پوری عبارت تو بے معنی ہوئی جا رہی ہے۔ اس پر غور کیوں نہیں ہو رہا۔ قیام پاکستان کے فوراً" ہی بعد ہونا تو یہ چاہئے تھا جس کی تائید بابائے قوم حضرت قائد اعظم نے ایک مخلص راہنما کی حیثیت سے فوراً" ہی کر دی تھی کہ ہم اپنی قومی زبان کو بلا تاخیر اور بلا تکلف کلیدی حیثیت دے ڈالتے لیکن ہماری غلامانہ ذہنیت نے مجموعی طور پر اور ہمارے انگریزی زدہ افراد نے خصوصی طور پر ایسا نہیں ہونے دیا۔ غلامانہ ذہنیت کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہوا کرتی ہے کہ وہ کوئی بڑا مفید اور اہم قدم نہیں اٹھانے دیا کرتی۔ بڑا قدم اٹھانے کے ضمن میں غلامانہ ذہنیت طرح طرح کے حیلے بہانے تراشا کرتی ہے۔ چنانچہ دیکھ لیجئے قومی زبان کے لئے قدم اٹھانا ہم اہل پاکستان کے لئے کس قدر اہم مفید اور بڑا قدم تھا لیکن ہماری غلامانہ ذہنیت نے اس راہ میں ہمارے لئے کیا کیا رکاوٹوں کے پہاڑ کھڑے نہیں کئے اور اردو زبان جو ہمارے تمام صوبوں میں اتحاد پیدا کرنے کا واحد مؤثر ذریعہ تھی اس کو کلیدی حیثیت تو ہم کیا دیتے اس سمت میں ہمیں سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ سوچنے بھی نہیں دیا گیا بلکہ تھڈرلنگ قسم کے مسائل ہمارے سامنے پیش کئے جاتے رہے مثلاً" اردو ٹائپ اور شارٹ ہینڈ کا مسئلہ' اصطلاحات کے تراجم کا مسئلہ' جدید علوم اور ٹیکنالوجی کو سمجھنے اور سمجھانے کا مسئلہ۔ حالانکہ اگر اردو کو فوراً" کلیدی حیثیت دے دی جاتی تو یہ مسئلے بتدریج وقت کے ساتھ خود بخود حل ہوتے چلے جاتے اور ضرورت ایجاد کی ماں ہے کے تحت ہم یہ سارے کام آسانی سے کر لیتے اور اسی طرح تاخیر سے کام نہ لیتے جس طرح

مختلف کمیٹیاں بنا بنا کر ہم نے اپنی غلامانہ ذہنیت کا ثبوت دیتے ہوئے قومی زبان کے مسئلے کو جان بوجھ کر بزعم خود بڑے خلوص کے ساتھ کھٹائی میں ڈال دیا۔ اردو اپنی لسانی فطرت میں ایسی وسیع القلب زبان ہے جس میں برصغیر ہندو پاک کے ہر خطے کی زبان سانس لیتی ہوئی اور دل کی طرح دھڑکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اسی لئے اس زبان میں کیا بلوچی' کیا سندھی' کیا پشتو' اور پنجابی یہ سب زبانیں شیرو شکر ہوتی نظر آتی ہیں۔ لیکن انگریزی زبان کے حامیوں اور ہماری غلامانہ ذہنیت نے اردو زبان کی اس وسیع القلبی کو بھی ہم پر واضح نہیں ہونے دیا بلکہ الٹا ہمیں یہ بتایا گیا کہ اردو زبان کو اگر کوئی اہم حیثیت دے دی گئی تو دوسری زبانوں کو بہت نقصان پہنچے گا۔ گویا اس طرح اردو زبان جو مملکت خداداد کے لئے اخوت اور اتحاد کا بہت بڑا وسیلہ تھی اس کو صوبائی عصبیت اور تنگ نظری پیدا کرنے والی زبان ثابت کرنے کی لغو اور غیر منطقی یعنی خطرناک کوششیں کی جاتی رہیں۔ دوسری طرف اس کے برعکس انگریزی زبان کی تعریف و توصیف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے جاتے رہے۔ حالانکہ جب ہم اپنی قومی زبان کو انگریزی کی جگہ لانے کے لئے چیخ پکار کرتے تھے تو اس سے ہمارا مقصد انگریزی زبان کی تحقیر یا اس کی حیثیت کو کم کرنا ہرگز ہرگز نہیں تھا۔ ہم تو صرف یہ کہنا چاہتے تھے کہ اپنی قومی زبان کے بغیر ہم اپنا کوئی قومی تشخص قائم نہیں کر سکتے وہی بات کہ ایک غیر زبان ہمیں ایک حد تک تو عالم فاضل بنا سکتی ہے لیکن ہم میں اعلیٰ انسانی اقدار پیدا نہیں کر سکتی۔ اعلیٰ انسانی اقدار کے لئے ہر قوم کو اپنی زبان کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ ہر قوم کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے اور اس مزاج کو اس قوم کی اپنی زبان ہی اچھی طرح سمجھتی ہے اور یہ بات تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ جب تک انسان کے مزاج میں نفوذ حاصل نہ کیا جائے اس میں اعلیٰ انسانی اقدار پیدا نہیں کی جا سکتیں۔ البتہ ایک غیر زبان اپنے بولنے والوں کے کردار میں اپنی قوم کے پست اور سطحی کردار کی خصوصیات ضرور پیدا کر سکتی ہے چنانچہ دیکھ لیجئے جس قدر انگریز قوم کے کردار کی پست اور سطحی خصوصیات ہمارے انگریزی زدہ حضرات میں پائی جاتی ہیں اس قدر کسی اور طبقے کے افراد میں نہیں پائی جاتیں۔ مثال کے طور پر انگریز لوگ کتے بہت پالتے ہیں لہٰذا ہمارے یہ صاحب لوگ خود کتے پالتے ہوں یا نہ پالتے ہوں لیکن موقع پڑنے پر یہ اپنی

دم ہلانے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ انگریز ایک ایسے جانور کے ساتھ بھی بہت رغبت رکھتے ہیں جو اپنی بے حیائی میں مشہور ہے۔ سچ سچ بتایئے اس وقت آپ کو ہمارے معاشرے میں ان انگریزی زدہ لوگوں سے بڑھ کر خاص انداز کی بے حیا مخلوق اور کون نظر آتی ہے۔ کیونکہ آپ جانتے ہیں بے حیائی جب اپنی انتہا کو پہنچتی ہے تو غرور و نخوت اور فرعونیت کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ وہی بات کہ مغرور اور متکبر انسان معاشرے کا سب سے زیادہ بے حیا انسان ہوتا ہے۔ یہ تو انگریزی زبان کو اوڑھنا بچھونا بنانے والے حضرات کی چند ظاہرا خصوصیات تھیں باطن کا حال بالکل نہ پوچھئے۔ انگریزی زدہ افراد کی انگریزی زبان سے غلامانہ محبت اور اس محبت کے باعث ان کی فرعونیت ہی کا نتیجہ ہے کہ آج ہمیں آزاد ہوئے نصف صدی گزرنے کو آئی ہے ہم ایک وزیر تک تو جوں توں رسائی حاصل کر سکتے ہیں لیکن ایک صاحب بہادر سے یوں ملاقات نہیں کر سکتے اور اگر اس سے ملاقات ہو بھی جاتی ہے تو اس کے فرعونیت اور اجنبیت سے بھرپور رویے کی وجہ سے یہ ملاقات نہ ہونے کے برابر رہتی ہے۔ ہمارے یہ صاحب بہادر لوگ ہمارے ہی اپنے عزیز' دوست اور اہل وطن ضرور ہیں لیکن ان کی غلامانہ ذہنیت اور ایک غیر زبان سے وابستگی نے انہیں ہم سے اس بری طرح جدا کر رکھا ہے کہ وہ ہماری اس زمین کی مخلوق ہی نظر نہیں آتے اور بات صرف یہیں تک محدود نہیں ان کے اس رویے نے ہمیں اپنی زبان سے بھی الگ کر کے رکھ دیا ہے جس کے نتیجے میں ہمارے کردار کی کوئی تشکیل نہ ہو سکی۔ نہ قومی کردار کی اور نہ شخصی کردار کی اور یوں ہم لوگ بے کردار ہو کر رہ گئے۔ اور یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ بے کردار ہونا دنیا میں سب سے بڑھ کر نادار اور مفلس ہونا ہے۔ بقول قائد :

When Character is lost every thing is lost اور یہی ہماری ساری خرابیوں کی جڑ ہے۔ چنانچہ جب تک ہم اپنی زبان کو کلیدی حیثیت نہیں دے لیتے نہ ہمارے کردار کی تشکیل ہو سکتی ہے اور نہ ہم اچھی طرح تعلیم حاصل کر سکتے ہیں اور نہ ہماری کوئی تربیت ہو سکتی ہے۔ جاپانی لوگ اپنے بچوں کو سب سے پہلے چھ سال تک باقاعدہ جاپانی زبان کی جبری تعلیم دیتے ہیں اور جاپانی زبان ہماری اردو کی نسبت کہیں زیادہ مشکل زبان ہے۔

کس قدر افسوس اور حیرت کی بات ہے دنیا کے سارے ترقی پذیر ملک تو اپنی اپنی زبانیں بول کر ترقی کر رہے ہوں اور ہمارے دل دماغ پر ایک غیر زبان کا بوجھ یہ کہہ کر لاد دیا جائے کہ اس کے بغیر ہم ترقی نہیں کرسکتے۔ اب آپ ہی غور فرمایئے جیسا کہ میں نے اپنی اس گفتگو کے آغاز میں اشارہ کیا تھا کہ اردو زبان کا سب سے بڑا دشمن خود ہم اردو بولنے والوں سے بڑھ کر کون ہو سکتا ہے کہ برصغیر ہندو پاک میں نہ ادھر اردو سے صحیح معنی میں فائدہ اٹھایا جا رہا ہے اور نہ ادھر ورنہ جہاں تک اردو زبان کی وسیع دامانی اور ترقی کے امکانات کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں اردو زبان اس اعتبار سے دنیا کی غالباً" سب سے بڑی زبان کہی جا سکتی ہے۔ مگر ہم اردو بولنے والوں کی غفلت شعاری کے پیچ در پیچ رویوں سے اب یہ سوال بھی پیدا ہو رہا ہے کہ اردو زبان مظلوم ہے یا اردو بولنے والے۔ یا یہ دونوں ہی مظلوم ہیں اور ظالم کوئی تیسری شخصیت ہے میرا خیال ہے اب ہمیں کسی تکلف کے بغیر یہ تسلیم کرلینا چاہئے کہ ظالم اور مظلوم ہم خود ہیں۔

maablib.org

ڈاکٹر انوار احمد
چیئرمین، شعبہ اردو
بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان

پاکستانی کلچر اور اردو زبان

قیام پاکستان کے بعد سے اب تک پاکستانی کلچر اور قومی زبان اردو کے حوالے سے جو نقطہ ہائے نظر پیش کئے جاتے رہے ہیں ان کی وقتاً فوقتاً سرکاری سطح پر پذیرائی یا گوشمالی اور عوامی سطح پر دلچسپی یا عدم دلچسپی، ان کی معنویت یا بے معنویت کو جس طور نمایاں کرتی رہی ہے۔ اس کا مثبت پہلو یہ ہے کہ اب اردو میں ہی کئی تصانیف، جرائد اور کانفرنسوں کی رُودادوں میں ان تمام نقطہ ہائے نظر کا استدلال اور اخلاص اس طرح محفوظ ہے کہ موافقت اور مخالفت کے بیچ وہ مکالمہ ہو سکتا ہے جو کسی قوم اور اس کے کلچر کو زندگی دیتا ہے، ماضی کی تفہیم، حال کے ادارک اور مستقبل کے امکانات پر غور کا موقع اور قوت فراہم کرتا ہے۔

ان میں سے ایک نقطہ نظر تو تحریک پاکستان کی مخالفت کرنے والے مذہبی عناصر کا ہے جنہوں نے پاکستان کی نظریاتی اساس اور ان سے وابستہ اقدار کی حفاظت کے لئے زبان ادب اور تہذیب کے ارضی رجحانات کے خلاف مزاحمت کی اسلامی ہند اور پاکستان کے

مابین تاریخ اور تہذیب کے انقطاع کو مٹانے اور تحریک پاکستان کے موقع پر قائم کیے جانے والے اپنے موقف کی تجدید کی خاطر لال قلعے پر ہلالی پرچم لہرانے کی آرزو کو اپنے مقدس سینوں میں بیدار رکھا۔ دوسرا نقطہ نظر ہندوستان کے ان علاقوں سے ہجرت کرنے والے دانشوروں کا ہے جو نہ صرف اردو زبان و ادب کی حقیقی وراثت کا کلیم (Claim) رکھتے تھے۔ بلکہ اپنی ذہنی و سیاسی بیداری اور پاکستان کی ہیئت حاکمہ میں حقیقی اقتدار کا استحقاق ایک برتر ثقافتی خطے سے وابستگی کی بنیاد پر بھی رکھتے تھے۔ تیسرا نقطہ نظر نفسیات، بشریات اور لسانیات سے دلچسپی رکھنے والوں کا ہے۔ چوتھا نقطہ نظر ہر دور کی سرکاری ترجیحات پاکستان کو امداد دینے والے ملکوں کی منشاء سے ہم آہنگ ہو جانے والا لچکدار موقف ہے جو عملی ذہانت رکھنے والے غرض مند اہل دانش نے اپنایا۔ پانچواں نقطہ نظر وہ ہے جو پاکستان میں سیاسی یا جمہوری سفر کے تعطل، قومی معاملات میں احساسِ شرکت سے اکثریتی طبقے کی محرومی اور ناانصافانہ معاشی اور سماجی نظام کے ردِ عمل میں پیدا ہوا۔

ہم سب بخوبی جانتے ہیں کہ قومی کلچر کسی قوم کے معتقدات، تاریخ اور جغرافیہ کے شعور اور باہم جذباتی ہم آہنگی اور ذہنی رابطوں سے وضع ہونے والی اجتماعی امنگوں سے تشکیل پاتا ہے اور قومی زبان بھی رابطے کا کردار ادا کرنے کے ساتھ ساتھ قومی تاریخ و تہذیب اور طرزِ احساس کی حفاظت اور تسلسل و توسیع کا وسیلہ ہوتی ہے۔ ۸ مارچ ۱۹۴۴ء کو جب بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناحؒ نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔

> "پاکستان اسی دن وجود میں آگیا تھا۔ جب ہندوستان میں پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہاں مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔"

(قائد اعظم کا پیغام مرتبہ سید قاسم محمود، پاکستان اکیڈمی لاہور۔ ص ۵۱)

تو اس حقیقت کا اظہار کیا تھا کہ پاکستان زمین اور آسمان کے ملاپ کا نتیجہ ہے، اگر ہم پاکستان کو محض دھرتی قرار دیں اور اس کے مظاہر کو ثقافتی مظاہر قرار دیں تو نہ صرف تحریکِ پاکستان میں کار فرما فیصلہ کن محرک کو نظرانداز کر رہے ہوں گے بلکہ پاکستان کے

خواندہ ' نیم خواندہ ' اور ناخواندہ طبقات کے مابین سماجی اور معاشی امتیازات کے باوجود محسوسات کے زندہ علاقے کی حقیقت سے رُوگردانی کر رہے ہوں گے' اس طرح جب ہم پاکستان کو محض نظریہ یا آسمان کہتے ہیں تو پھر نہ صرف زندہ لوگوں کی بنیادی ضروریات اور تقاضوں سے بے نیاز ہو جاتے ہیں بلکہ رزق ' رشتے اور عزت کی تلاش میں کسی ملک کی پوری آبادی کی ہجرت پر آمادہ ہونے اور کسی زمین کے آسٹروٹرف میں تبدیل ہونے کا نفسیاتی اور تہذیبی محرک آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا۔ میں قومی ثقافت سے متعلق ہر نقطۂ نظر کے اخلاص کا احترام کرتے ہوئے نہایت ادب سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ پاکستانی تہذیب و ثقافت کی اساس و اقدار متعین بھی ہو سکتی ہیں اور اس سے پھوٹنے والی سرخوشی اور روشنی پاکستانی قوم کے مابین جذباتی اور ذہنی روابط کو مستحکم بنا سکتی ہے۔ جب ہم پاکستان کو خواب ہی نہیں تعبیر بھی' نظریہ ہی نہیں وجود بھی ' آرزو ہی نہیں حاصلِ آرزو بھی یعنی آسمان ہی نہیں زمین بھی سمجھیں اور دینِ متین سے اہلِ پاکستان کی وابستگی کو ریفرینڈم کا سوال بنا کر اقتدار کو ہر قیمت پر طول دینے یا فرقہ واریت کو ہوا دے کر یا حقیقی انسانی ضروریات کے عوض جذباتی نعرے دے کر قومی وجود میں سے تحمل رواداری اور لگاؤ کو خارج نہ کریں۔

جہاں تک اردو زبان کا سوال ہے۔ ماہرینِ لسانیات کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ یہ زبان اصلاً" پاکستان میں موجود علاقوں میں متشکل ہوئی ' البتہ ہندوستان کے ان تہذیبی مراکز میں اس زبان کا ادبی روپ نکھرا۔ جو اب تاریخ و تہذیب سے متعلق پاکستانیوں کی یادداشت میں احساسِ تفاخر کے حوالے ہیں۔ تاہم یہ بھی بنیادی حقیقت ہے کہ معلوم تاریخی و تہذیبی وجوہ کی بنیاد پر قیام پاکستان سے بہت پہلے پنجاب اردو کے ایک بڑے تہذیبی اور ادبی مرکز میں تبدیل ہو چکا تھا۔ ' ہندی اردو تنازعہ نے تحریک پاکستان میں کار فرما دو قومی نظریے کو جس طرح تقویت پہنچائی اور اردو جس طرح پاکستان کو اپنا نصب العین بنانے والوں کے لئے محبوب ٹھہری ' اس سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو' مگر قیام پاکستان کے بعد بعض اہلِ زبان اور اصحابِ اختیار نے اردو پر مقامی لوگوں کی بے غرض اور والہانہ محبت کی قدر و منزلت کی بجائے تلفظ ' روز مرہ محاورے اور سند کی بحث ایک

زعمِ برتری کے ساتھ شروع کی۔ میر' سودا' مصحفی' آتش اور غالب کے کلام پر دلوں کی دھڑکن نوٹ کر کے شاہ لطیف' بچل سرمست' خواجہ غلام فرید' شاہ حسین' باہو' رحمان بابا اور خوشحال خان خٹک کے کلام اور نام پر دھڑکنے والے دلوں کے "وسوسے" ہی نوٹ کیے اور اپنی دانست میں ایک حصار قائم کیا کہ مقامی زبانوں کے شعر و ادب میں کار فرما تلمیحات' علامات' استعارات اور تشبیہات کے انسلاکات کی گرد قومی زبان کے دامانِ عفت پر نہ پڑنے دی جائے' ظاہر ہے کہ یہ رویہ اردو زبان کے لسانی اور تہذیبی مزاج سے ناآشنائی اور اس کی دوستی میں نادانی کا تھا۔ اس تضاد کو بڑھانے میں اس مقتدر اقلیت کے رول کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا جو مراعات یافتہ تعلیمی اداروں' ایک خاص زبان اور وضعِ زیست کے ذریعے اپنی جائیداد کی طرح اپنی کرسی اور دفتر بھی اپنی نسلی یا معنوی اولاد کو منتقل کرنے کی خواہش مند ہے۔ بلاشبہ پاکستان میں ایک ایسا وقت آیا۔ جب انگریزی عربی اور اردو کے علاوہ کسی مادری زبان کو بولنا' لکھنا یا اس کے شعر و ادب سے لطف اندوز ہونا قومی کلچر اور قومی زبان کے خلاف سازش قرار پایا۔ تاہم اگر یہ میری خوش فہمی نہیں تو میں یہ عرض کروں کہ اب پاکستان میں بالعموم اس پر اتفاق ہے کہ پاکستان کی تمام علاقائی زبانیں اور اس کا شعر و ادب قومی زبان کے سرمائے اور توقیر و اعتبار بڑھانے میں اپنا کردار ادا کر سکتا ہے۔ اردو میں تلفظ' روزمرہ اور محاورے کے مسائل کو پاکستان میں اردو بولنے والے کی صوتی سہولت یا عادت اور تہذیبی نظام کے حوالے سے سمجھنا چاہئے۔ اردو لغت بورڈ نے یہ بہت اہم فیصلہ کیا ہے کہ پاکستان میں علاقائی زبانوں کے وہ تمام الفاظ اردو کے ذخیرہ الفاظ میں شامل ہیں جنہیں اردو شاعری میں برتا گیا ہے۔ اس طرح لوک ورثے کے قومی ورثے نے نہ صرف پاکستان کی تمام زبانوں کے اہم شاعروں کے کلام کے بیشتر حصوں کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ بلکہ ان زبانوں کے لوک ادب کو بھی قومی زبان میں محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے اور پاکستان کے مختلف علاقوں کے رسم و رواج اور علوم و فنون کے بارے میں اردو داں طبقے کو مانوس کرنے کی کوشش کی ہے۔

بھارت میں اردو سے محبت رکھنے والے جب اس زبان کو اب بھی مشترکہ تہذیب کے حوالے سے دیکھتے اور دکھاتے ہیں اور اس زبان کے سیکولر کردار پر زور دیتے ہیں تو

ان کے موقف کا محرک قابلِ فہم ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مستقبل میں پاکستانی اردو اور بھارتی اردو کے امتیازات نمایاں ہونے کے امکانات ہیں اور ہمارے خیال میں پاکستان میں مستقبل کا بڑا شاعر اور ادیب وہی ہے جو سرائیکی' سندھی' پشتو' بلوچی یا براھوی میں لکھتے اور پڑھتے ہوئے بھی قومی سطح پر اپنے ابلاغ کے دائرے کو بڑھانے اور قومی ثقافتی روایت کے دھارے میں شمولیت کے لئے اردو کو تخلیقی اظہار کا وسیلہ بنائے گا۔

maablib.org

کتابیات

1- آزاد کوثری، پاکستانی کلچر کی مختلف جہتیں، دی ری پبلکن بکس لاہور 1988ء

2- اقبال خان، اردو اور سیکولر ازم، نگارشات لاہور 1989ء

3- جمیل جالبی ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد 1987ء

4- حامد حسین ڈاکٹر (مرتب) اردو ہندی دانشوروں کی نظر میں۔
انجمن ترقی اردو، نئی دہلی 1983ء

5- حمید احمد خان پروفیسر، تعلیم و تہذیب، مجلس ترقی ادب لاہور 1975ء

6- خالد سعید بٹ ڈاکٹر (مرتب) قومی تشخص اور ثقافت،
ادارۂ ثقافت پاکستان 1983ء

7- فرمان فتح پوری ڈاکٹر، ہندی اردو تنازع، نیشنل بک فاؤنڈیشن 1977ء

8- فیض احمد فیض، (مرتب شیما مجید) پاکستانی کلچر اور قومی تشخص کی تلاش،
فیروز سنز 1988ء

9- قاسم محمود سید (مرتب) قائد اعظم کا پیغام، پاکستان اکیڈمی لاہور، طبع اول

10- کامل قریشی ڈاکٹر (مرتب)، اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب،
اردو اکادمی دھلی 1987ء

11- محمد اجمل ڈاکٹر، مقالات اجمل، ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور 1987ء

12- وحید عشرت، ڈاکٹر، پاکستانی ثقافت کی تشکیل، پاکستان فلسفہ اکادمی
لاہور 1976ء

maablib.org

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

اردو میں ترجمے کی روایت

ایک یونانی مقولہ ہے کہ "ترجمہ ہمیشہ ایک بھنی ہوئی سٹرابیری ہی رہے گا" یعنی ترجمے کے دوران اصل چیز کے ذائقے میں فرق ضرور پڑے گا۔"

کچھ یہی سبب ہے کہ ڈاکٹر سیموئل جانسن شاعری کے ترجمے کو ناممکن قرار دیتے ہیں اور جے۔ ایچ فریئر کو ترجمے کی زبان قابل التفات دکھائی نہیں دیتی۔ حد یہ ہے کہ مشہور مترجم ایڈورڈ فٹز جیرالڈ 'زندہ کتے کو' مردہ شیر سے بہتر قرار دیتے ہیں۔

ترجمے کے فن سے متعلق یہ آراء تو 19 ویں صدی تک کی ہیں' جبکہ 20 ویں صدی میں دو مکتبہ ہائے فکر سامنے آتے ہیں۔ پہلا گروہ مخالفین کا ہے:

گرانٹ شاورمین کریلی کے خیال میں: "ترجمہ کرنا ایک گناہ ہے"

پروفیسر البرٹ گیرارڈ کے نزدیک: "ترجمہ' نام ہے ایک سعی نامشکور کا' جس کے صلے میں شدید مشقت کے بعد صرف حقارت ملتی ہے۔"

جب کہ عملی سطح پر دیکھیں تو پتا چلتا ہے کہ ارنسٹ فینولوسا' ایزرا پاؤنڈ اور آرتھرویلی نے ترجمے ہی کے ذریعے قدیم مشرقی شاعری کو شرق و مغرب کی حال کی شاعری میں بدل دیا' اور پاؤنڈ نے جب بھگت کبیر کے چند دوہوں کے ترجمے کے بعد کینٹوز کہے تو اس کی شاعری میں "بھگت کبیر" کی گونج نمایاں تھی۔ یوں ترجمہ بھماں کا ممکن ہے۔ اور یہ کام کچھ لوگ کر گزرے۔ جنہیں نمک حرام اور غدار تک کہا گیا۔ اس میں پہلا نام 250 قبل مسیح کے

لیویوس اینڈرونیکس (Livius Andronicus) کا ہی لیا جائے گا۔ جس نے اول اول ہومر کی "اوڈیسی" کو لاطینی زبان میں ترجمہ کیا اور تو دیرگمنامی سے نباہ کیا۔ انگریزی میں بائبل کے اولین مترجم ولیم ٹنڈیل کی ساری عمر جلاوطنی میں گزری وہ 1935ء میں گرفتار ہوا 1936ء میں پھانسی پائی اور اس کی لاش کو آگ میں جھونک دیا گیا خود ہمارے ہاں ترجمۂ قرآن کے بعد نذیر احمد دہلوی سے عالمانہ مذہبی تقدس بھی چھن گیا۔

شاید اسی لئے ترجمے کی دیومالا نے مترجم کی حالتِ زار کو "سسی فس" سے تشبیہ دی ہے' جو انتہائی بااختیار ہونے کے باوجود بے بس اور قابل رحم ہے۔

اب آیئے اردو میں ترجمے کی روایت کی طرف۔

صراحت پہلے کروں کہ یہ مقالہ صرف مغربی ادبیات کے تراجم کے جائزے تک محدود ہے۔ نیز اردو میں ترجمے کے اولین نمونوں / بائبل اور اناجیل کے اولین مترجمین ولیم کیری' ہنری مارٹن' رام رام باسو اور پنڈت مرتونجے ودیا النکار کے کام کا جائزہ یہاں پیش نہ کروں گا

ہمارے ہاں ادبی تراجم کی تاریخ میں "راسلس" از ڈاکٹر سیموئل جانسن کے ترجمہ "تواریخ راسلس' شہزادہ حبش کی" از سید محمد میر لکھنوی مطبوعہ: آگرہ طبع اول 1839ء کی اہمیت اس اعتبار سے ہے کہ بلا کسی شک و شبہ کے' مغرب کی کسی بھی زبان سے اردو میں ہونے والا کتابی صورت میں یہ پہلا ادبی ترجمہ ہے۔ اس سے قبل ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے اپنی کتاب "ہندوستانی زبان کے قواعد" مطبوعہ: کلکتہ: طبع اول 1796ء میں ولیم شیکسپیئر کے دو ڈراموں "ہملٹ" اور "ہنری ہشتم" کے دو چیدہ اقتباسات کا اردو ترجمہ پیش کیا تھا۔ واضح رہے کہ ہمارے اولین دیسی مترجم سید محمد میر لکھنوی' ریورنڈ چارلس کی چھ جلدوں میں کیمسٹری سے متعلق کتاب کا ترجمہ 1828ء میں طبع کروا چکے تھے' اور یہی وہ زمانہ ہے جب میرامن دلی والے نے "باغ و بہار" اور "گنج خوبی" کے بعد ایورنڈ چارلس کی سات جلدوں پر مشتمل کتاب "ستیہ جیسہ" کا ترجمہ غلام محی الدین متین حیدرآبادی' مسٹر جونس اور موسیو تنڈرس کے ساتھ مل کر مکمل کیا۔[1]

1857ء کی ناکام جنگ آزادی کے ہنگام تک صرف علمی تراجم سامنے آئے' جن کی

تفصیل وقت چاہتی ہے۔ لیکن یہی وہ زمانہ ہے جب علمی اور ادبی سطح پر ہمارے ہاں ایک داخلی کشمکش دکھائی دی۔ اس دور کے ادباء و شعراء کے ایک گروہ کے خیال میں پیروی مغرب ہی زندہ رہنے کی واحد صورت تھی، اور دوسرا گروہ مغرب کے پیچھے کا زیر بار احسان رہتے ہوئے ابن العربی اور ابن رشیق پر گزارا کرنا چاہتا تھا۔ جب کہ تیسرا گروہ مغرب سے بھی صاحب سلامت کا خواہاں تھا اور مشرق تو تھا ہی اپنا۔ سو 19ویں صدی عیسوی کے نصف آخر اور 20ویں صدی کے نصف اول میں ہم مشرق اور مغرب کے فکری ابعاد کے درمیان ڈگمگاتے پھرے۔

لیکن یہ دو طرفہ آگ تھی۔ ہمارا ادیب ترجمے کی معرفت، مغرب کی سمت تجسس کے ساتھ دیکھ رہا تھا اور مغرب نے مشرق لبادہ اوڑھنے کی کوشش کی تھی۔

مغرب میں اس میلان کے ابتدائی نقوش مارلو اور شیکسپیئر کے ڈراموں میں دکھائی دیتے ہیں جبکہ ہمارے ہاں 1880ء کے قریب رڈیارڈ کپلنگ اپنے مشرقی حوالوں کے ساتھ ابھرا۔ یہ الگ قصہ ہے کہ باطنی سطح پر اس نے انگریز راج کے ہی تصور کو تقویت بہم پہنچائی۔[۲]

کپلنگ سے پہلے میکنزی نے 1885ء میں مسز مشروم اور کرنل میڈوز ٹیلر نے امیر علی ٹھگ کی ذات کے حوالے سے ہندوستان کے باسیوں کا خوب خوب مضحکہ اڑایا اور ہمارے رتن ناتھ سرشار نے اصل حقیقت سے ناواقفیت کی بنا پر میکنزی کی کتاب "اعمال نامہ روس" کا ترجمہ کیا۔ سو کہا جا سکتا ہے کہ کپلنگ کی ذہنیت پیدا کرنے کو 1785ء سے زمین ہموار کی جا رہی تھی۔ آگے چل کر بقول محمود ہاشمی: "ایزرا پاؤنڈ" میگنا کارٹا کے ساتھ ساتھ مشرقی فلسفے اور مشرقی شاعری کے تراجم اور حوالوں کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اسی لئے ایلیٹ اپنے "خرابے" اور "افکار تسبیح" کے خوابوں کے بعد "اوم شانتی شانتی کی منزل تک آتا ہے۔ اسی لئے سارتر، بدھ سے قریب دکھائی دیتا ہے۔ اسی لئے بیشتر نئے مغربی ادیب مہرست بن گئے تھے۔ اسی لئے ایلن جنسبرگ (Allen Ginsberg) امریکہ سے ہندوستان کا سفر کرتا ہے اور امریکہ میں رہتے ہوئے اپنی نظم میں اس خواہش کا اظہار کرتا ہے کہ:[۳]

" (America) When Will Send Your Eggs To India."

یہ تو تھی مجمل صورت حال، البتہ اردو میں مغربی زبانوں سے ادبی تراجم کا جائزہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ اردو زبان و ادب کی وسعت اور تکنیکی سطحوں پر گہرائی و گیرائی میں اخذ و ترجمے کا خاصا اہم کردار رہا ہے۔ مثلاً یہ کہ تراجم نے نئے اسالیبِ بیان کو جنم دیا، نئے طرزِ احساس کو ابھارا، پیرائیہ بیان میں صلابت، متانت اور استدلال کو بڑھاوا دیا اور پیرایۂ اظہار کے نئے نئے سانچے فراہم کیے۔ یوں اردو ادب میں تذکرہ کی جگہ تنقید، داستان اور تمثیل کی جگہ ناول، رہس اور نوٹنکی کی جگہ ڈراما اور کہانی کی جگہ افسانہ جیسی جدید اصناف نے لے لی، اور ادبیاتِ عالم کے ساتھ قدم بہ قدم چلنے کا خواب ہم نے پہلی بار دیکھا۔ اور یہ سب اس وقت ہوا، جب ہم نے سو سے زائد آپ بیتیاں، ڈیڑھ سو افسانوی مجموعے، درجنوں ادبی تاریخ سے متعلق کتب، دو سو پچاس ڈرامے سے متعلق کتب، ساٹھ سفرنامے، ایک سو اٹھارہ سوانحی کتب اور ڈیڑھ ہزار ناول کتابی صورت میں نہ صرف ترجمہ کر لئے بلکہ یہ سب کچھ کتابی صورت میں شائع ہوا۔

قصے، رزمیے، کہانیاں، روزنامچے، مضامین، خطوط، تنقیدی کتب اور شعری مجموعوں کے تراجم اس کے علاوہ ہیں۔[۶]

نیز مستقبل میں ترجمہ شدہ غیر مدوّن مواد طباعت کے وقت کئی لاکھ صفحات گھیرے گا۔

ابتداء میں ادبی سطح پر، ترجمے کی معرفت ہیئت، تکنیک اور موضوعی کروٹوں سے آشنائی نئی نئی تھی اور مغربی ادبیات کی روایت کا شعور تقریباً ناپید تھا۔ جس کے نتیجہ میں تراجم ہوئے تو لیکن انتہائی بے سلیقگی کا مظاہرہ بھی دیکھنے میں آیا۔ قاری کی دلچسپی کو مدنظر رکھتے ہوئے ترجمے کے نام پر کاٹھ کباڑ کے ڈھیر لگا دیے گئے۔

ایسے تراجم کا بڑا نقص یہ ہے کہ علاوہ غلط اور غیر معتبر ہونے کے، وہ مستند اور اہم کتب کے ترجمے نہیں تھے۔ مثلاً جارج ولیم - ایم رینالڈز کے کتابی صورت میں پچپن سے زائد ترجمے ہوئے اور مختلف مترجمین نے کیے۔[۷] اور اس پر غضب یہ کہ ترجمہ در ترجمہ ہوئے اور مترجمین نے اصل متن دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ یہی صورت "آزاد ترجمہ" میں سامنے آئی اور ہمارے مترجمین نے "ڈان کیخوتے" کو ترجمہ کرتے ہوئے ہسپانیہ کے بازاروں میں جمن حلوائی اور لکھنؤ کے بانکوں کو جدی پشتی وہیں کا ثابت کر دیا۔ کرداروں کے

نام اور جگہوں کے آثار تو تبدیل ہوئے ہی' ان کی عادات و خصائل تک بدل گئے۔ ابتدائی مترجمین کی ترجمے کے فن سے ناواقفیت اور تن آسانی نے تراجم میں ایک نیا طرزِ تحریر بھی ایجاد کیا' جس کے لئے انگریزی میں Journalese کی اصطلاح موجود ہے۔ یعنی ایک ایسی ناقص زبان لکھی گئی' جو نہ تو خیالات کے اظہار پر قادر تھی اور نہ ہی معنی کی ترسیل پر۔ یہ اس لئے بھی ہوا کہ مشرق میں 'لفظ' خاصیت یا داخلی شیشت کا نمائندہ ہے۔

○

محمد حسین آزاد نے "آبِ حیات" میں لکھا تھا کہ:

"------ ہاں یہ کام ہمارے نوجوانوں کا ہے' جو کشورِ علم میں مشرقی اور مغربی' دونوں دریاؤں کے کناروں پر قابض ہو گئے ہیں۔ ان کی ہمت آبیاری کرے گی۔ دونوں کناروں سے پانی لائے گی۔"

اس رائے پر تبصرہ کرتے ہوئے مہدی جعفر لکھتے ہیں:

"ملحوظ خاطر رہے کہ بات پانی لانے کی ہے' کناروں پر تیرتے ہوئے الفاظ اکٹھا کرنے کی نہیں۔ تخلیق اور ترجمے میں بہر حال فرق ہے۔ خیر مغرب والوں نے تو اپنے پانی سے اپنے ہم مزاج الفاظ نکالے ہیں۔ ہم نے ترجمے کے ذریعے انھیں الفاظ سے شعبدہ بازی یا چونکانے کا کام لیتے ہوئے بے اعتقادی کا ثبوت دیا ہے۔"[۶]

مہدی جعفر نے محولہ بالا مضمون میں مشرق اور مغرب کے مزاجوں کی سطح پر فرق کو کیمیا گری اور "کیمیا دانی" کا فرق قرار دیا ہے۔ اور ادب کو تراجم کی معرفت کیمیا گری سے "کیمیا دانی" کی طرف لانے کا کام یوں تو فورٹ ولیم کالج میں ہونا قرار پایا تھا لیکن اس باب میں بھی سرسید احمد خاں بازی لے گئے۔ انھوں نے اردو ادب کو جس ذہنیت کا تحفہ دیا اس کی بنیادیں عقلیت' اجتماعیت' مادیت اور حقائق نگاری پر تھیں۔[۷]

سرسید احمد خان کی معرفت مشرق کے لئے مغرب کی اس عطا کی کھوج میں نکلیں تو پتا چلتا ہے کہ "لفظ" کی سطح پر ہم "داخلیت" سے اسی زمانے میں دست کش ہونا شروع ہو گئے تھے جب سے یورپی اقوام نے ہمارے ساحلوں پر اول اول قدم رکھا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ "نئے" اور "جدید" ادب تک آتے آتے نہ ہماری زمینی بو باس اپنا پتا دیتی ہے اور نہ ہی ہمارے ہاں

کے معاشرتی' سیاسی اور اقتصادی حوالوں کا نشان ملتا ہے۔ اردو میں مغربی تراجم کے زیر اثر ہمارے افسانوی ادب کو مخصوص نوع کی مغربی روش کا سامنا رہا جس کے باعث ہمارے افسانوی ادب کا بیشتر حصہ ایسا ہے کہ اسے بڑی آسانی سے "اینگلو انڈین ادب" کے کھاتے میں ڈالا جا سکتا ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ ہمارے ادباء کو اوائل 20 ویں صدی کی قومی تحریکوں کا ہمنوا بن کر ہی ترجمے کی طرف آنا چاہیے تھا بلکہ مقصد یہ ہے کہ ہمیں زرق برق مغربی تہذیب اور انگریزی ادبیات کا مطالعہ مخصوص معاشرتی اور سیاسی حوالوں' ذہنی رویوں' ضرورتوں اور انگریزی زبان نیز مغربی ادبیات کے پس منظر میں رکھ کر کرنا چاہیے تھا' اور یہ بھی کہ اردو زبان کے نئے عہد سے مطابقت رکھنے والی لسانی تشکیل اور اسلوبیاتی دائرہ عمل کے بارے میں منصوبہ بندی کی ضرورت تھی۔

محمد حسن عسکری نے مذکورہ بالا عوامل کا تجزیہ کرتے ہوئے اردو ترجمے کی روایت کو کھنگال ڈالا۔ اور اس کا رد عمل خود ان کے تراجم ہیں۔

اردو میں ترجمہ نگاری کے مروّجہ چلن پر عسکری صاحب نے سب سے بڑا اعتراض یہ کیا ہے کہ مجموعی طور پر ترجموں کے ذریعے ہمارے تخلیقی ادب کو زیادہ فائدہ نہیں پہنچا۔ جس کی سب سے بڑی وجہ یہ رہی کہ ہمارے مترجمین' ترجمے کی اہمیت سے ناواقفیت کی بنا پر اسے تخلیقی مسئلہ نہیں سمجھتے۔ ترجمے کا جواز محض موضوع یا کہانی کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنا نہیں۔ اصل بات تو ترجمے کے ذریعے ترقی یافتہ زبانوں کے اسالیب کو اپنی زبان میں ڈھالنے اور رائج کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔[9]

بات دراصل یہ ہے کہ خواہ رتن ناتھ سرشار کا سروانتیس سے ترجمہ "خدائی فوجدار" ہو یا قیسی رام پوری کا رینالڈز سے ترجمہ "فسانۂ لندن" ' ہمارے ہاں آزاد ترجمے کی روایت نے بڑے بڑے گل کھلائے ہیں اور ترجمے کے مذاق کو خراب کرنے میں ان ہی آزاد ترجموں کا ہاتھ رہا ہے۔ پھر اردو نثر اور بالخصوص افسانے پر آسکر وائلڈ اور دیگر مغربی جمال پرست ادباء کے غالب اثر کی مذمت کی جاتی ہے اور اسے اردو نثر کی اسلوبیاتی روایت کے لئے نقصان دہ قرار دیا جاتا ہے۔ یہ بات مکمل طور پر قبول نہیں کی جا سکتی۔ جہاں تک تراجم کے

زیر اثر زبان کو بڑھاوا دینے کا معاملہ ہے تو اس میں مولانا حامد علی خاں، لطیف الدین احمد، جلیل قدوائی، مجنوں گورکھپوری اور خواجہ منظور حسین جیسے جمال پرست ادیبوں کی عطا سے انکار کیسے ممکن ہے؟

مجموعی طور پر دیکھیں تو پریم چند کے فوراً بعد مسز عبد القادر اور حجاب امتیاز علی کے افسانوں میں ایڈگر ایلن پو کے زیر اثر تحیر اور اسرار کی جو انوکھی فضا بندی دیکھنے میں آتی ہے وہ تیکنیکی اور موضوعی حوالوں کے ساتھ اسلوبیاتی سطح پر بھی خاصے کی چیز ہے۔ جبکہ مجنوں کے افسانے جہاں اسلوبیاتی سطح پر فکر محض کی زبان کو اردو فکشن میں پہلی بار متعارف کروانے کے سلسلے میں یادگار ہیں، وہیں پر ان کی گہری سنجیدگی اور محسوسات کے بیان پر قدرت، انگریزی اور دیگر مغربی ادبیات سے گہرے شغف پر دال ہے۔ خیر یہ تو ہوئیں اثر و قبول کی دو ایک مثالیں۔ لیکن جہاں تک اسلوبیاتی سطح پر رَدّ و قبول کا معاملہ ہے تو ہمارے ہاں کے مترجمین نے ہمیشہ روانی اور سلاست، کی ہی تمنا کی ہے اور ہمارے اکثر ناقدین نے اسی روانی اور سلاست کو ترجمے کی خوبی گنوایا ہے۔ حالانکہ بڑا مترجم وہ ہے جو متمول زبانوں سے ترجمہ کرتے وقت یہ کوشش کرتا ہے کہ اس کی اپنی مفلس زبان کے رہے ہوئے کھانچے بھر جائیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے محمد حسن عسکری نے فلابیر اور محمد سلیم الرحمٰن نے ہومر ——کو ترجمہ کرتے وقت گنجلک اور طویل جملوں کو اردو جیسی قدرے نئی زبان میں منتقل کرنے کا جتن کیا ہے۔

حیران کن بات یہ ہے کہ ہمارے بیشتر مترجمین نے روانی اور سلاست کی دوڑ میں یہ نہیں سوچا کہ اردو نثر کا بڑا مسئلہ تو طویل اور پیچیدہ جملہ لکھنے کا ہے۔ اور اگر کسی ترقی یافتہ زبان کے فن پارے میں تخلیق کار نے پیچیدہ تر احساسات و جذبات کو لفظوں میں منتقل کرتے وقت یہ کارنامہ انجام دیا ہے تو کوشش کر کے اسے ان ہی قواعد و ضوابط کے ساتھ اردو میں کیوں نہ منتقل کر لیا، اس سے ہماری زبان میں بھی اسلوبیاتی سطح پر کوئی نئی راہ سوجھنے کا امکان پیدا ہوتا۔ یہ اس کے باوجود ہے کہ اردو نثر میں گنجلک تجربات اور پیچیدہ جذبات و تجربات کو سہارنے کی قوت نہ ہونے کے برابر ہے۔ "اور" "مگر" "لیکن" وغیرہ لگا کر جملوں کو جوڑتے چلے جانے سے بڑا جملہ نہیں بنتا ہے۔ سو کہا جا سکتا ہے کہ ہماری زبان اور ادبیات نے ترجمے کے ایک عظیم جوکھم سے نبرد آزما رہنے کے باوجود خاطر خواہ حد تک فائدہ نہیں اٹھایا۔

اب آیئے سرسری طور پر یہ بھی دیکھتے چلیں کہ ہماری مختلف اصناف ادب نے ترجمہ کے زیر اثر کیا کچھ منفی اور مثبت اثرات قبول کیے۔

ناولوں کے سینکڑوں تراجم ہو چکنے کے باوجود شروع شروع میں ہمارے ہاں داستان، تمثیل اور ناول میں فرق مٹا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ایک مدت تک نذیر احمد دہلوی کے تمثیلی قصوں کو ناول قرار دیتے رہے اور نذیر احمد دہلوی کے سَر اولین ناول نگار ہونے کا سہرا باندھتے رہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب مغربی ناول نگاروں خصوصاً وکٹر ہیوگو، الگزینڈر ڈوما، زولا، بالزاک، اناطول فرانس اور اسکاٹ وغیرہ کے تتبع میں نذیر احمد دہلوی کے ساتھ رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، شاد عظیم آبادی، سجاد عظیم آبادی، راشد الخیری، اور مرزا ہادی رسوا اردو میں ناول نگاری کے چلن کو عام کرنے میں مصروف تھے۔

نذیر احمد دہلوی کی تمثیلیں اسٹی ون سن کے "ٹریژر آئی لینڈ" کی طرح ہر قسم کی بداخلاقی حتیٰ کہ حسن و عشق سے بھی خالی ہیں۔ نذیر احمد پر دوسرا بڑا اثر جارج ایلیٹ کے ناولوں کا تھا خصوصاً "کردار کی پیش کش میں نفسیاتی تجزیہ نگاری جو جارج ایلیٹ ہی سے مخصوص ہے۔ جبکہ "بنات النعش" ٹامس ڈے کا چربہ ہے۔ رتن ناتھ سرشار کا "فسانہ آزاد" اور "خدائی فوجدار" ہر دو تحریریں سروانتیس کے "ڈان کیھوتے ڈی لامانشا" سے جنم لیتی ہیں اور کچھ یہی معاملہ سجاد حسین کے "حاجی بغلول" کا ہے۔

ہمارے باقاعدہ اولین ناول نگار عبدالحلیم شرر کی تاریخی ناولوں کی تمام تر عمارت سر والٹر اسکاٹ اور رچرڈسن کی بنیادوں پر کھڑی ہے۔ جبکہ انہوں نے ایک باقاعدہ ترجمہ رینالڈز کے ناول کا "خوبیٔ قسمت" کے نام سے بھی کیا! اسلوبیاتی سطح پر شرر نے بے قافیہ شاعری کرتے ہوئے مصرعوں کو ایک آزاد تسلسل میں مربوط رکھنے کا جتن کیا ہے جو سراسر اسکاٹ سے مخصوص ہے۔ سر والٹر اسکاٹ کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ اسلوبیاتی سطح پر اسکاٹ کے اثرات شرر سے حکیم محمد علی خاں تک پہنچے، جنھوں نے ناول کو "ادب لطیف" بنانے کی کوشش کی۔

مرزا ہادی رسوا نے ماری کوریلی کے پانچ جاسوسی ناولوں کو "خونی بھید" "خونی جورو" "خونی مصور" "خونی عاشق" اور "بہرام کی رہائی" کے نام سے 1928ء تک ترجمہ کر کے طبع

بھی کروا دیا تھا' یہ الگ قصہ ہے کہ انھوں نے اپنی طبع زاد فکشن میں جاسوسی عنصر کو شامل نہیں ہونے دیا۔ البتہ جاسوسی ادب سے اثر پذیری' ظفر عمر کے ہاں باقاعدہ سراغرسانی کے ادب میں ڈھل گئی۔ اور تیرتھ رام فیروز پوری کے طبع زاد ناول اس سے اگلا قدم ہیں۔ جبکہ بطور مترجم تیرتھ رام فیروز پوری نے ایک سو دس ناولوں کے تراجم مطبوعہ کتابی صورت میں یادگار چھوڑے۔ مغرب کے معروف ناول نگاروں میں آر۔ ایل اسٹیونسن (مترجم: مولانا عبدالمجید سالک) ارنسٹ ہمنگوے (مترجم: اشفاق احمد۔ ابن سلیم۔ بشیر ساجد) اروِنگ سٹون (مترجم: سید قاسم محمود) اسٹیفن کرین (مترجم: انتظار حسین) اشروڈ اینڈرسن (مترجم: محمد حسن عسکری) آگنات ہرمن (مترجم: حمید اختر) البرتو موراویا (مترجم: ایس۔ اختر جعفری) آلبیر کامیو (مترجم: بشیر چشتی۔ ڈاکٹر افضل اقبال۔ محمد عمر میمن۔ انیس ناگی) الفرڈ نیومین (خواجہ عبدالکریم) الگزینڈر ڈوما (مترجم: تیرتھ رام فیروز پوری) اناطول فرانس (مترجم: مولوی عنایت اللہ دہلوی۔ عبدالرزاق ملیح آبادی) او۔ ہنری (مترجم: ابن انشاء' سلیم صدیقی) ایڈگر ایلن پو (مترجم: ابن انشاء) ایڈگر رائس (مترجم ایم۔ بے عالم) ایرچ سیگل (مترجم ستار طاہر) ایرک میریا ریمارک (مترجم احسن طاہر) ایف ایل گرین (مترجم ابو سعید قریشی) ایف۔ ایل۔ گرین (مترجم: ابو سعید قریشی) الیزبتھ کوٹس ورتھ (مترجم: مولانا عبدالمجید سالک) ایمائل زولا (مترجم: سید حسن رضوی) ایوان بُنین (مترجم: نذر صدیقی) بالزاک (مترجم: سیدہ نسیم ہمدانی۔ یوسف عباسی) پرل۔ ایس۔ بک (مترجم: اختر حسین رائے پوری۔ ابو سعید قریشی۔ قمر نقوی۔ احسان علی۔ یوسف ظفر) ٹامس ہارڈی (مترجم: مجنوں گورکھپوری۔ رئیس احمد جعفری۔ شفیق بانو منہاج) جارج ایلیٹ (مترجم: محمد سعید) جارج ولیم ایم رینالڈز (مترجم: تیرتھ رام فیروز پوری' مولانا ظفر علی خاں' عبدالحلیم شرر' امیر حسن کاکوروی' کندن لال شرر' صدیق احمد' اثر لکھنوی' نوبت رائے نظر' بابو پرشاد' شمیم بلھوری' لالہ دینا ناتھ) جان سٹین بک (مترجم: ابن انشا' ممتاز شیریں' زہرہ سیدین' مظہر انصاری) جان ماسٹرز (مترجم: سید قاسم محمود) جوہان ہنرج پستالوزی (مترجم: غلام حسین) پی۔ جے وڈ ہاؤس (مترجم: ستار طاہر) جیک شیفر (مترجم: شان الحق حقی' غلام حسین) چارلس ڈکنز (مترجم: خان احمد حسین خان' فضل الرحمان) ڈی۔ ایچ۔ لارنس (مترجم: سیدہ نسیم ہمدانی) رڈیارڈ کپلنگ (مترجم: مولانا ظفر علی خان' مولوی عنایت اللہ

دہلوی) ساؤمنگ (مترجم: محمد خلیق) ستاں دال (مترجم: محمد حسن عسکری) سمرسٹ ماہام (مترجم: ڈاکٹر سید محمد عقیل) سنکلیئرلوئیس (مترجم: عابد علی عابد) سروانتیس (مترجم: رتن ناتھ سرشار، سجاد حسین) شارلٹ برانٹے (مترجم: سیف الدین حسام) فرانسوا ساگاں (مترجم: ستار طاہر) گستاؤ فلابیئر (مترجم: محمد حسن عسکری، مولوی عنایت اللہ دہلوی) فیلکن سالٹن (مترجم: ظہور الحسن ڈار) کرسٹوفراشروڈ (مترجم: محمد حسن عسکری) کلیئرنس ڈے (مترجم: جاوید شاہین) کینتھ رابرٹس (مترجم: سید قاسم محمود) گوڈفرے لیوس (مترجم: شاہد احمد دہلوی) گوئٹے (مترجم: میاں محمد افضل) لوئیزا اسکاٹ (مترجم: حجاب امتیاز علی تاج، اشرف صبوحی) لوئیس برومفیلڈ (مترجم: مولوی عنایت اللہ دہلوی) لوئیس، سنکلیر (مترجم: عابد علی عابد) مس کون کوئسٹ (مترجم: صادق الخیری) موپاساں (مترجم: سید قاسم محمود، نصیر حیدر، نوح فاروقی، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، طاہر قریشی) میتھوز ٹیلر (مترجم: محمد رئیس الزماں خاں رئیس) نیتھینیل ہاتھورن (مترجم: سیدہ نسیم ہمدانی) نٹ ہمسن (مترجم: عشرت رحمانی) سروالٹراسکاٹ (مترجم: عبدالحلیم شرر) وکٹرہیوگو (مترجم: سعادت حسن منٹو، رام سروپ شرما، بشارت انور) والٹیئر (مترجم: سجاد ظہیر، بشیر ساجد) ولیم سرویاں ان۔م راشد، شفیق الرحمان، سید رضی ترمذی) ہال کین (مترجم: ایم۔ اسلم) ہاورڈ فاسٹ (مترجم: ایس اعظمی، احسن علی خاں) ہرمن میلول (مترجم: محمد حسن عسکری) ہنری جیمز (مترجم: قرۃ العین حیدر) رائیڈر ہیگرڈ (مترجم: سلمیٰ تصدق، مولانا ظفر علی خاں، مظہر الحق علوی، آغا اقبال، بشیر احمد اختر، منشی خلیل الرحمٰن، عاصم صحرائی، ثریا اقبال، مولوی عنایت اللہ دہلوی) ہیرلڈ لیم (مترجم: عزیز احمد، گلزار احمد، احمد یوسف عباسی، جمیل نقوی، اختر عزیز اختر، غلام رسول مہر، وزیر الحسن عابدی، سید ہاشمی فرید آبادی، محمد ہادی حسین)

یہ چند ایسے نام ہیں جن کے اردو میں ترجمے سے ہمارے ہاں نہ صرف یہ کہ ناول کا چلن عام ہوا بلکہ ناول سے عناصر ترکیبی کو بھی سمجھنے میں مدد ملی۔

اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کوشش میں معروف شاعر یوسف ظفر کا بھی حصہ ہے۔ جن کا ترجمہ ''امی میں تمہاری ہوں'' (از پرل ایس بک) کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوا اور اس کتاب پر ناشر نے ن۔م راشد کا نام شائع کرنا مناسب خیال کیا۔ واضح رہے کہ یہ ترجمہ یوسف ظفر کا ہے نہ کہ ن۔م راشد کا۔

پارسی اسٹیج کے فروغ کے ساتھ ہی انگریزی سے اسٹیج ڈراموں کو اردو میں منتقل کرنے کا کام شروع ہوا اور ولیم شیکسپیئر کی عالمگیر شہرت سے باکس آفس پر کامیابی کا تصور بندھا لیکن افسوس کہ شیکسپیئر کے بیشتر تراجم ناقص ہیں۔ ان میں پلاٹ کی تبدیلیاں کی گئیں۔ مقامی رنگ میں اس قدر رنگ دیا گیا کہ پہچان مشکل ہو گئی یہاں تک کہ تجارتی ضروریات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے بڑے پیمانے پر کانٹ چھانٹ بھی کی گئی اور اس فعل قبیح میں ڈرامے کا اولین دیسی مترجم احسان اللہ بھی شامل تھا' جس نے شیکسپیئر کے "اوتھیلو" کا ترجمہ 1890ء میں شائع کروایا اور آغا حشر بھی۔ حشر کا کیا ہوا "King Lear" کا ترجمہ "سفید خون" [12] اس کی ایک نمایاں مثال ہے۔

سو ڈراما کے باب میں ہمارا پہلا قدم ہی غلط پڑا۔ کہا جا سکتا ہے کہ باکس آفس پر کامیابی سوائے جولیئس سیزر" کے دو ترجموں از عزیز احمد اور سید فیضی' "رومیو جولیٹ" کے دو ترجموں از عزیز احمد اور مولوی عنایت اللہ دہلوی' "اوتھیلو" کے ایک ترجمے از عزیز حامد مدنی اور "انطونی و قلوپطرہ" کے ایک ترجمے از شان الحق حقی کے کسی ترجمے کی داد نہیں دی جا سکتی جبکہ شیکسپیئر کے ہمارے ہاں دو سو سے زائد ترجمے ہوئے' اور مارس میٹر لنک کے ترجموں کی بھی کم و بیش یہی صورت ہے دیگر ڈراما نگاروں کے ترجموں میں "فاؤسٹ" از گوئٹے (مترجم: ڈاکٹر عابد حسین) "بگڑے دل" از مولیئر (مترجم: محمد عمر و نور الٰہی) "سلمیٰ" از آسکر وائلڈ (مترجم: انصار ناصری) "ظاہر و باطن' از شیریڈن (مترجم: فضل الرحمٰن) چند ایسے ترجمے ہیں' جن کے طفیل آگے چل کر اردو ڈرامے کو رفیع پیر' خواجہ معین' اشفاق احمد اور بانو قدسیہ جیسے ڈراما نگار مل گئے۔

دیگر معروف ڈراما نگاروں میں آسکر وائلڈ (مترجم: مجنوں گورکھپوری' تمکین کاظمی' شاہد محمد دہلوی' سعادت حسن منٹو و حسن عباس) آندریف (مترجم: ابو سعید قریشی) تھارنٹن وائلڈر (مترجم: انتظار حسین' عشرت رحمانی) ٹالسٹائی (مترجم: مجنوں گورکھپوری) جارج برنارڈ شا (مترجم: مخدوم محی الدین و مولوی میر حسن' مجنوں گورکھ پوری' محمد اکبر وفا قانی' خورشید نگہت) جان گالزوردی (مترجم: سید قاسم محمود' منشی جگت موہن لال رواں' دیانرائن نگم) جے۔ بی پریسٹلے (مترجم: انتظار کاظمی' محمد خلیق) آرچرڈ (مترجم: مخدوم محی الدین) دوستوفسکی (مترجم: کمال احمد

رضوی) رچرڈ ماشتین (مترجم: بدر جہاں آرا) سمرسٹ ماہام (مترجم: محمد اکبر وفا قانی) سوتوف (مترجم: عبداللہ ملک) سوفوکلیز (مترجم: شاہدہ حمید خاں) شلر (مترجم: محمد عمر و نور الٰہی) گوئٹے (مترجم: شاہد احمد دہلوی' منشی جوالا پرشاد برق' عبدالقیوم خان باقی' منور لکھنوی' عزیز احمد) لیسنگ (مترجم: منشی جگت موہن لال رواں' منشی محمد نعیم الرحمان) مارس میٹر لنک (مترجم: نور الٰہی و محمد عمر' مجنوں گورکھپوری' وحشی محمود آبادی' شاہد احمد دہلوی) ماس ہارٹ و جارج الیس کافمین (مترجم: سید رضی ترمذی' کمال احمد رضوی) مولیئر (مترجم: وہاج الدین' محمد عمر و نور الٰہی) میری چیز (مترجم: کمال احمد رضوی) ہنرک ابسن (مترجم: عبدالشکور' فضل الرحمٰن' عزیز احمد' محمد صفدر) ہنری رائیڈر ہیگرڈ (مترجم: آغا اقبال) کے تراجم قابل ذکر ہیں۔

افسانے کی صنف میں تین نام بہت ترجمہ ہوئے یعنی چیخوف' موپاساں اور رابندر ناتھ ٹیگور ——— ٹیگور کو انگریزی کی معرفت اردو میں متعارف کروانے میں پریم چند پیش پیش تھے اور یہ سلسلہ منٹو تک چلا آیا۔ منٹو نے چیخوف اور موپاساں کو نہ صرف ترجمہ کیا بلکہ ان کے طرز تحریر کو عام کرنے میں حصہ لیا۔ اسی طرح ٹالسٹائی اور گورکی بھی منٹو کی معرفت اردو میں متعارف ہوئے۔

چیخوف' موپاساں اور مارس میٹر لنک کے ترجموں کی عطا راجندر سنگھ بیدی' منٹو اور غلام عباس ہیں۔ ایڈ گر ایلن پو اور او۔ ہنری کو بھی ہمارے ہاں خصوصی توجہ دی گئی۔ یہی سبب ہے کہ ایڈ گر ایلن پو کے ابتدائی تراجم کے فوراً بعد اسی طریقہ کار کی جھلک مسز عبدالقادر اور حجاب امتیاز علی کے ہاں دیکھنے کو ملی۔

سمرسٹ ماہام جیسے دوسرے درجے کے افسانہ نگار کو ہمارے ہاں سادہ زبان اور سہل انداز نگارش کے باعث مقبولیت حاصل ہوئی۔ ماہام سے اثر پذیری کی سب سے بڑی مثال کرشن چندر کے افسانے ہیں۔ روسی افسانہ نگاروں کا واضح اثر پروفیسر محمد مجیب کے اولین افسانوی مجموعے "کیمیا گر اور دوسرے افسانے" (مطبوعہ 1932ء) میں دیکھنے کو ملا' لطیف الدین احمد اور جلیل قدوائی ترجمہ اور طبع زاد افسانے کی ملی جلی صورتیں سامنے لاتے رہے۔[14] اختر حسین رائے پوری کا افسانوی مجموعہ "محبت اور نفرت" واضح طور پر روسی افسانوں کے اثر کے تحت لکھا گیا اور افسانوں کی انتھالوجی "انگارے" (مرتبہ: احمد علی میں جیمز جوائس'

ڈی۔ایچ۔لارنس اور گستاؤ فلابیئر کے اثرات بہت نمایاں ہیں۔ اختر شیرانی نے شہرت تو رومانی شاعر کے طور پر سمیٹی لیکن ان کا سب سے اہم کام انتھالوجی "دھڑکتے دل" میں شامل آسکر وائلڈ' موپاساں اور گالزوردی کے افسانوی تراجم ہیں۔ معروف افسانہ نگاروں میں اسٹیفن کرین (مترجم: جاوید صدیقی) ایڈگرایلن پو (مترجم: ابن انشاء) اینڈرسن (مترجم: ریاض جاوید) سروانتیس (مترجم: رحیم) پرل ایس بک (مترجم: قمر نقوی' یوسف ظفر' ٹامس ہارڈی (مترجم: مجنوں گورکھپوری) جیک لنڈن (مترجم: انور عنایت اللہ) رابندرناتھ ٹیگور (مترجم: منصور احمد حامد اللہ افسر' پرتھوی راج نشتر) اسٹیفن کرین (مترجم: جاوید صدیقی) موپاساں (مترجم: نصیر حیدر) مورسل لیول (مترجم: امتیاز علی تاج) واشنگٹن اروِنگ (مترجم: نیاز فتح پوری' غلام عباس' سید وقار عظیم) کے کتابی صورت میں مطبوعہ تراجم نمایاں ہیں۔

سفرنامہ کی صنف ہمارے ہاں نئی نہیں اور نہ ہی ہمارے ہاں مغربی سفرناموں کے تراجم خاطر خواہ حد تک ہوئے۔ لیکن ہمارے سفرنامہ لکھنے والوں پر مغربی سفرنامے کے اثرات نمایاں ہیں۔ شاید اس کی ایک وجہ جدید سفرناموں کی مغربی فضا بھی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آج کا اردو سفرنامہ اپنی قدیم روایت کے مقابلے میں سفرنامہ کم اور ویڈیو کارڈ زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ مغربی سفرناموں کی طرح کا تہذیبی مزاج ہمارے سفرناموں میں تاحال پیدا نہیں ہوسکا' اتنا بھی نہیں جتنا جیا مراو. اور مارجری کیمپ کی تحریروں میں تھا حالانکہ وہ سفرنامے میں ان کے ابتدائی نام ہیں۔ ہمارے ہاں زیادہ سے زیادہ مستنصر حسین تارڑ کی طرح "ڈان جوآن" بننے کی کوشش میں کتاب کو بیسٹ سیلر بنانے کی فکر کی گئی۔

اردو میں ترجمہ ہونے والے سفرنامہ نگاروں میں جنرل گارڈن' ڈاکٹروی میکنزی' ہنری۔ ایم اسٹینلے' کالیر' جے۔بی ٹیونیر' لیڈی ڈفرن (مترجم: محمد مظہر) رسل اروِن (مترجم: مرتضیٰ احمد خاں میکش) پروفیسرومبری' مسز میکس طہ (مترجم: سید رشید الدین) سرآردل آسٹن (مترجم: سید محمد اعظم فہمی) آر۔ ایف برٹن (مترجم: محمد انشاء اللہ) ایڈمنڈ اسٹیونسن' لیڈی ایولن کیولڈ زینب (مترجم: محسن شبیر) پرنس البرٹ (مترجم: بشمبرناتھ) موسیو تھیونیو' جان بنین (مترجم: ٹی ہیری ویونس سنگھ) جان لوئی برکھارٹ' میجر جنرل جان میلکم (مترجم: محبوب عالم) جولڑوران اور میجر ولیم گفرڈ وغیرہ کے نام کتابی تراجم میں نمایاں ہیں۔

○

اردو میں منظوم تراجم کی روایت بھی اتنی ہی مضبوط ہے جتنی منثور ترجمے کی' البتہ کتابی صورت میں بہت کم یکجا ہو پائی۔ اس خصوص میں الطاف حسین حالی کو اولیت حاصل ہے۔ "دیوان حالی"[13] میں انگریزی اشعار کا ترجمہ کے عنوان سے ایک نظم کا ترجمہ ملتا ہے' البتہ شاعر کا نام درج نہیں۔[15] بہاری لال "منتخب انگریزی نظموں کے منظوم تراجم" 1869ء میں منظر عام پر لائے۔ 1878ء میں حالی نے "زمزمۂ قیصری" کے عنوان سے ایک معاصر برطانوی شاعر اسٹوک کی طویل نظم (جو دربارِ قیصری منعقدہ 1878ء میں پڑھی گئی) کا ترجمہ کیا۔[16] اسی طرح آلیور گولڈ سمتھ کی نظم "ڈزرٹیڈ ویلیج" کا منثور ترجمہ بھی حالی سے یادگار ہے۔

اکبر الہ آبادی نے رابرٹ ساؤدے اور ٹینی سن کو پہلی بار اردو دنیا سے متعارف کروایا۔ ٹینی سن کی نظم "برک" کا ترجمہ ہمیشہ یاد رہے گا' لیکن منظوم تراجم کے باب میں جو شہرت گرے کی "گور غریباں" کے حوالے سے نظم طباطبائی نے پائی' اس کا توڑ آج بھی ممکن نہیں۔ طباطبائی نے یہ ترجمہ عبدالحلیم شرر کی فرمائش پر کیا' جو پہلی بار جولائی 1897ء کے "دلگداز" میں شرر کے تعارفی نوٹ کے ساتھ شائع ہوا۔

اس ترجمے کی بے پناہ مقبولیت کے پیش نظر نظم طباطبائی نے کئی ایک ترجمے اور کیے۔ جن میں "زمزمۂ فصل بہار" (گرے) اور "دولت خداداد افغانستان" (سر الفرڈ لائل) نے شہرت پائی۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں منظوم تراجم کی تحریک عبدالحلیم شرر کی تھی۔ طباطبائی کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے ضامن کنتوری نے منظوم تراجم کا مجموعہ "ارمغان فرنگ" 1901ء میں شائع کروایا' جس میں ارل آف آکسفورڈ' مسز الزبتھ بیرٹ براؤننگ' ولیم کوپر' ورڈزورتھ' کولرج' الگزینڈر پوپ' آلیور گولڈ سمتھ' جارج لٹن' جیمز مونٹگمری' ٹامس ہڈ' لانگ فیلو' شیلے' اسکاٹ اور ولیم شیکسپیئر جیسے شعراء کے ساتھ پہلی بار ایک جرمن شاعر کی نظم کا ترجمہ "صلائے عام" کے عنوان سے شامل کتاب ہے۔ یاد رہے کہ ضامن کنتوری کا ایک اور کارنامہ ٹامس مور کی مثنوی "لالہ رخ" کا منظوم ترجمہ ہے۔ بعد میں "لالہ رخ" کا ایک منثور ترجمہ ل۔ احمد اکبر آبادی نے کیا۔

یوں شرر کے رسالہ "دلگداز" کی تحریک نے زور پکڑا' اور جب اپریل 1901ء میں "

مخزن" کا پہلا شمارہ شائع ہوا تو اس کے اغراض و مقاصد میں سے ایک یہ بھی تھا:

"انگریزی نظموں کے نمونے پر طبع زاد نظمیں، انگریزی نظموں کے بامحاورہ ترجمے شائع کرنا تاکہ متقدمین کی تقلید کرنے والے جدید مذاق سے آگاہ ہوں۔" سو "مخزن" کے پہلے ہی شمارے میں علامہ اقبال کی نظم "ہمالہ" سے متعلق سر عبدالقادر نے لکھا کہ شاعر نے ملک الشعرائے انگلستان، ورڈز ورتھ کے رنگ میں کوہ ہمالہ سے مکالمہ کیا ہے۔ یاد رہے کہ اسی شمارے میں مولانا ظفر علی خاں نے ٹینی سن کی نظم "ندی کا راگ" کا ترجمہ پیش کیا تھا۔ مولانا نے بعد میں ورڈز ورتھ کی ایک نظم "وفا" کو بھی اردو میں منتقل کیا۔

علامہ اقبال نے متعدد ترجمے کئے، جن میں ایمرسن کی "پہاڑ اور گلہری"، ٹینی سن کی "عشق اور موت" اور "رخصت اے بزم جہاں"، لانگ فیلو کی "پیام صبح"، ولیم کوپر کی "ہمدردی"، "پرندے کی فریاد"، اور "ماں کی تصویر دیکھ کر" نمایاں ہیں۔ اسی طرح اقبال نے فرانسیسی شاعر گاتیر کی نظم "آفتاب" کا بھی ترجمہ کیا۔[۱۷]

سرسری طور پر دیکھیں تو متقدمین سے "اندھی پھول والی کا گیت" از لارڈ لٹن اور "بہار کا آخری پھول" از ٹامس مور (مترجم: محمد حسین آزاد)، "ترانۂ محبت" اور "موسم بہار کا آخری پھول" از ٹامس مور (مترجم: حسرت موہانی)، "مئی کا جوان چاند" از ٹامس مور (مترجم: عزیز لکھنوی)، "تربتِ جاناں"، "مقصدِ الفت"، "عالمِ پیری اور یادِ ایام"

"انجامِ محبت"، "جانِ شیریں" از معاصر برطانوی شعراء (مترجم: غلام بھیک نیرنگ)، "مرحومہ کی یاد میں"، "گزرے زمانے کی یاد" از ٹامس مور (مترجم: نادر کاکوروی)، "کوئل" از ورڈز ورتھ (مترجم: عظمت اللہ خان)، "ممی سے خطاب" از ہوریس اسمتھ (مترجم: محی الدین قادری زورؔ) "نغمات از شیکسپیر، "کوئل" از ورڈز ورتھ، "یونان کے جزیرے" از لارڈ بائرن، "عقب" از ہارڈی (مترجم: تلوک چند محروم)، "شیب و شباب" از رابرٹ براؤننگ (مترجم: وقار احمد)، "آسمانی صیاد" (نوحے) از فرانسس تھامسن (مترجم: ہادی حسین)، "مجھے دے دے رسیلے ہونٹ" از رابرٹ براؤننگ (مترجم: فیض احمد فیض) اور "سکائی لارک" از شیلے (مترجم: فاخر ہریانوی) یادگار ترجمے ہیں۔

منظوم تراجم کی پہلی انتھالوجی "منتخب انگریزی نظموں کے منظوم تراجم" مرتبہ: بہاری

لال (1869ء) اور ضامن کنتوری کی "ارمغان فرنگ" (1901ء) کے بعد باقاعدہ انتھالوجیز میں نادر کاکوروی کی کتاب "جذباتِ نادر" (مطبوعہ: 1910ء) غلام محی الدین کی "دو آتشہ" (1924ء) فاخر ہریانوی کی انتھالوجی مطبوعہ عطر چند کپور اینڈ سنز، میر حسن (حیدر آبادی) کی "ورڈز ورتھ اور اس کی شاعری" (1932ء)، "قریہ ویراں" از اولیور گولڈ سمتھ (مترجم: سید راحت حسین)، "شعرائے فرنگ" (مترجم: ڈاکٹر عبدالوحید خان) 1932ء اور "رنگ بست" (مترجم: جعفر علی خاں اثر) 1942ء کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

خیر یہ تو ہوئیں متقدمین کی مثالیں، متوسطین کے لخت لخت تراجم کے علاوہ جب عزیز احمد نے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی زندگی میں ہی ان سے باقاعدہ مشورہ کر کے "ویسٹ لینڈ" کا ترجمہ "خراب آباد" کے عنوان سے پیش کیا[18] اور میراجی نے "مشرق و مغرب کے نغمے" مرتب کی تو جدید مغربی شاعری کی طرف دریچے وا ہو گئے۔ اب جہاں شوکت واسطی نے ملٹن کی "پیراڈائز لاسٹ" کا ترجمہ "فردوسِ گم گشتہ"، کرسٹو فر مارلو کی "ٹریجک لائف آف ڈاکٹر فاسٹس" کا ترجمہ "المیہ حکیم فسطاس"، دانتے کی "ڈیوائین کامیڈی" اور ہومر کی "ایلیڈ" کے چھ دفتر ترجمہ کیے، وہیں مغرب کے اہم نظریہ ساز شعراء از قسم بودلیئر، رین بو اور طاہر بن جلون کو شفیق بابری نے ترجمہ کر دیا۔ یہاں تک کہ ایزرا پاؤنڈ، لورکا، رابن داریو، پابلو نرودا، بریخت، سلویا پلاتھ، خورخے لوئیس بورخیس اور اوکتاویو پاز تک نئے اور اہم نام ترجمہ ہو چکے[19] انتھالوجیز کی سطح پر شان الحق حقی کی مرتب کردہ "درپن درپن" آخری قابل ذکر چیز ہے۔

یہ تو ہوا ایک مختصر جائزہ۔ تفصیل میں جائیں گے تو بقول فراق، یہ قصہ طولانی ہے۔ ادبیات عالم میں ترجمے کے ذریعے اخذ و استفادے کا انقلاب آفریں سلسلہ جاری و ساری ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم ترجمے کے تمدن کے ہمہ گیر اثرات کو کس طرح قبول کرتے ہیں۔ پیرویٔ مغرب بھی بہت ہو چکی۔ مغربی پیسے کے زیر بار احسان ہوئے ایک زمانہ بیت گیا۔ کیا ہم اب بھی ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ ہمیں کیمیا دانی سے کیمیا گری کی طرف جانا ہے؟

○

حوالہ جات و حواشی:

(۱) ریوری انٹ چارلس کے سات سائنسی رسائل مطبوعہ: 1818ء لندن کا ترجمہ "مستہ شمسیہ" 8/5 کی تقطیع پر 1256ھ مطابق 1840ء میں شمس الامراء ثانی نواب محمد فخرالدین خاں نے اپنے ذاتی سنگی چھاپہ خانہ شمس الامراء حیدر آباد دکن سے شائع کیا۔

(۲) رڈیارڈ کپلنگ کے 1891ء تک افسانوں کے چار مجموعے سامنے آئے' جن میں چھیانوے افسانے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک افسانہ بھی ایسا نہیں' جس میں ہندوستان کی آزادی کی طرف اشارہ ہو۔ "Naulakha" اور "KIM" دو ناول ہیں اور ان میں بھی ہندوستانی فکر کی صحیح عکاسی نہیں کی گئی۔

(۳) بہ حوالہ: "ایک خطرناک میلان" از محمود ہاشمی' مطبوعہ: "اوراق" لاہور' شمارہ نمبر 4 بابت 1966ء' ص 119

(۴) تفصیلات کے لئے دیکھئے: "مغرب سے نثری تراجم" از مرزا حامد بیگ' مطبوعہ: مقتدرہ قومی زبان' اسلام آباد' طبع اول: مئی 1988ء

(۵) رینالڈز کے چند تراجم: "گردش آفاق" "نظارہ پرستان" ' "فسانہ لندن" ' "فریب حسن" (مترجم: تیرتھ رام فیروز پوری)' "فسانہ لندن" ایک جلد (مترجم: مولانا ظفر علی خان)' "مسٹریز آف لندن" (مترجم: کندن لال شرر)' "فسانہ الہ دین و لیلیٰ"' "فریب حسن"' "فسانہ لارنس ورتھ" (مترجم: امیر حسن کاکوروی)' "روز البرٹ" (مترجم: اثر لکھنوی)' "باپ کا قاتل" (مترجم: شمیم بلھوری)' "چاک گریبان" (مترجم: بابو پرشاد)' "شام جوانی" (مترجم: نوبت رائے نظر لکھنوی)' "جھیل کی معشوقہ" (مترجم: لالہ دینا ناتھ)

(۶) بہ حوالہ: "اردو افسانے کے افق" ' از مہدی جعفر مطبوعہ "اوراق لاہور مئی - جون 1983ء' ص 357

(۷) دیکھئے: "سرسید کا اثر ادبیات اردو پر" از ڈاکٹر سید عبداللہ' مشمولہ: "بہترین ادب" مرتبہ: میرزا ادیب' مطبوعہ: مکتبہ اردو' لاہور: 1955ء ص نمبر 11

(۸) عسکری کے تین مضامین: "گر ترجمے سے فائدہ اخفائے حال ہے"" مطبوعہ "ماہ نو" کراچی، بابت: فروری 1954ء ___ "کچھ ترجمے کے بارے میں"، مطبوعہ "ماہ نو" لاہور، عسکری نمبر، بابت: مارچ 1978ء ___ "کچھ اردو نثر کے بارے میں" مشمولہ: "ستارہ یا بادبان" از محمد حسن عسکری۔

(۹) "خدائی فوجدار" مطبوعہ نو لکشور پریس، لکھنؤ: 1903ء

(۱۰) "افسانۂ لندن" (Mysteries Of London) ترجمہ شدہ دس جلدیں، طبع اول: نرائن دت سہگل، لاہور۔ طبع دوم: 13 جلدیں۔ صفحات 1700) ایشیا بکڈپو، لاہور: طبع اول: 1927ء

(۱۱) "فسانہ آزاد" مطبوعہ: نو لکشور پریس، لکھنؤ، طبع اول: 1880ء آخری ایڈیشن 1934ء

(۱۲) "سفید خون" ترجمہ: آغا حشر کاشمیری، طبع اول: 1906ء

(۱۳) دیکھیے افسانہ: "بیوی" از۔ ل۔ احمد اکبر آبادی (لطیف الدین احمد) مطبوعہ: "نقوش" لاہور۔ یہ افسانہ روسی افسانہ نگار P.Romanov سے بحذف و اضافہ مستعار ہے۔

(۱۴) "دیوان حالی" مطبوعہ نامی پریس، کانپور۔ ص نمبر 214

(۱۵) حالی کے ترجمے سے ایک شعر ملاحظہ ہو:

وہ دلربا امیدیں، جن پر کہ تو ہے شیدا
جب دور تیرے دل سے ہو جائیں گی سراپا

(۱۶) تین حصوں پر مشتمل حالی کی اس ترجمہ شدہ نظم کے پہلے بند کو دیکھیے:

پھر ہوا اسلام کے اقبال کا تارا بلند
جانب ہندوستان محمود نے ہانکا سمند
وہ مسلمانوں کے حق میں ابر رحمت تھا مگر
ہندوؤں کے دل رہے اس کے ستم سے دردمند
وہ پہنچتا تھا جہاں ہوتی تھی واں آفت بپا
اور چلتا تھا جلو میں اس کے آسیب و گزند

(۱۷) گا تیر کے اس ترجمے سے ایک شعر ملاحظہ ہو:

آفتاب، روحِ روانِ جہاں ہے تو
شیرازہ بندِ دفترِ کون و مکاں ہے تو

(۱۸) ایلیٹ کی نظم "ویسٹ لینڈ" کے اب تک تین ترجمے سامنے آچکے ہیں۔ عزیز احمد کے بعد محمد صفدر نے ایک حصے کا ترجمہ کیا۔ دوسرا مکمل ترجمہ رفیق خاور کا ہے۔

(۱۹) نئے دور کے مترجمین میں شمس الرحمٰن فاروقی، مقبول الٰہی، محمد سلیم الرحمٰن، انور زاہدی، سہیل احمد، سہیل اختر، انیس ناگی اور اجمل کمال بہت نمایاں ہیں۔

maablib.org

ڈاکٹر محمد امین

اُردو اور ہمارا قومی تشخّص

میں اپنی سہولت کے لئے عنوان کی ترتیب کو الٹتا ہوں اور اسے یوں دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں' ہمارا قومی تشخّص اور اردو زبان' کہ شاید اسی طرح اس موضوع پر زیادہ بامعنی گفتگو ہو سکے۔ قومی تشخّص سے کیا مراد ہے؟ اس تصوّر میں کیا کیا مفاہیم پوشیدہ ہیں؟ اور علماء کی اس سلسلے میں کیا کیا آراء ہیں؟ یہ ایک طویل بحث ہے اور میں اس بحث میں الجھنا نہیں چاہتا۔ میری ناقص رائے میں قومی تشخص کی اصطلاح ثقافتی پس منظر میں زیادہ بامعنی طور پر مستعمل ہے اور معاصر ادب میں تہذیب و ثقافت ہم معنی اور مترادف الفاظ کے طور پر رائج ہیں۔ میں زیرِ نظر مقالے میں اس حوالے سے بات کروں گا۔

قومی تشخص کا سب سے بڑا مُظہر قومی ثقافت ہے۔ دنیا میں جتنی بھی ثقافتیں موجود ہیں۔ ان کی بنیاد اسطوراتی' دیومالائی' مابعد الطبیعاتی' نیم مذہبی یا توہماتی ہے۔ کوئی ایک ثقافت بھی ایسی نہیں۔ جسے ان عناصر سے معرّا قرار دے سکیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ قومی تشخص مابعد الطبیعاتی تصور ہے۔ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے۔ بقول ڈاکٹر علی شریعتی نظریہ ہی معاشرے کی بنیاد ہے پاکستان کی بنیاد لا الہ الا اللہ پر ہے۔ کلمہ طیّبہ کا یہ جزو اول بہت سی مابعد الطبیعاتی تشریحات کا حامل ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان کے قومی تشخص کی بنیاد مابعد الطبیعاتی ہے ہمارے قومی تشخّص کی فکری اساس مجدّد الف ثانی' شاہ ولی اللہ اور علامہ اقبال نے فراہم کی ہے۔ ہم کثرت میں وحدت کو تلاش کرتے

ہیں اور کثرت کو وحدت میں سمیٹتے ہیں۔ جبکہ ہماری معاصر ثقافتیں وحدت کو کثرت میں بکھیرتی ہیں۔ یہی اختلاف ہماری مملکت کی تشکیل کا باعث بنا۔

اب ہمارے قومی تشخص کے عناصر ترکیبی کیا ہیں؟ علامہ اقبال نے "رموزِ بے خودی" میں ملتِ اسلامیہ کے رُکن اساس کا ذکر کرتے ہوئے دو ارکان پر ملتِ اسلامیہ کی بنیاد رکھی ہے۔ پہلا رکن توحید اور دوسرا رکن رسالت ہے۔ ہمارا قومی تشخص بھی ان ہی پر مبنی ہے۔ توحید سے مراد یہ ہے کہ اس کائنات میں جس میں لامحدود کائناتیں شامل ہیں' کا حاکمِ اعلیٰ ایک خدا ہے۔ اور حکم دینے کا صرف اسے ہی اختیار حاصل ہے۔ وہی ہر شے کا منبع ہے۔ وہی اخلاق کا سرچشمہ ہے۔ اور وہی تہذیب و ثقافت کا مصدر ہے اور رسالت سے مراد یہ ہے کہ علوم کے منابع میں سے ایک معتبر ترین ذریعہ علم وحی ہے۔ جو انسان کی ہدایت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اور یہ ذریعہ قدیم ترین ہونے کے ساتھ ساتھ نتائجیت کے اعتبار سے تاریخ میں ہمیشہ مفید اور انقلاب آفریں رہا ہے۔

زندگی مسلسل حرکت کا نام ہے۔ معاشرے میں تبدیلی ناگزیر ہے۔ اور ثقافتی عمل جامد نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں اجتہاد سے کام لیا جاتا ہے۔ اقبال نے اسے اصولِ حرکت کہا ہے۔ اور میں اسے تہذیبی و ثقافتی عمل کہتا ہوں۔ ہم انجذاب کی بجائے اجتہاد کے قائل ہیں اجتہاد ایک شعوری عمل ہے۔ یعنی ہم رَدّو قبول عقل و شعور کی روشنی میں کرتے ہیں۔

میرے خیال میں توحید' رسالت اور اجتہاد یہ تین اساسی تصورات ہیں۔ جن سے ہمارا قومی تشخص متشخص ہے۔ ہماری ثقافت میں ان کے مظاہرات موجود ہیں۔ ان کی نشاندہی میرے مضمون کے مبحث سے خارج ہے۔ کیونکہ یہ امور کلچر اور ثقافت کی ذیل میں آتے ہیں۔ مگر آپ یہ سوال کرسکتے ہیں کہ اس کی کوئی عملی مثال پیش کی جائے۔ ہاں پچھلے دنوں پاکستان نے کرکٹ میں ورلڈ کپ جیتا۔ ہر پاکستانی ٹیم کی فتح کے لئے دست بدعا رہا۔ منتیں مانی گئیں۔ دعائیں مانگی گئیں۔ تسبیحیں پڑھی گئیں۔ یہ سب ہماری ثقافت کا حصہ ہے اور یہی ہمارا قومی تشخص ہے۔ جس لمحے پاکستانی ٹیم کی فتح کا اعلان ہوا۔ پاکستانی اپنے گھروں سے باہر نکل آئے۔ سب سے پہلے انہوں نے جو نعرہ بلند کیا۔ وہ تھا اللہ اکبر

یہ اللہ اکبر کہاں سے آگیا اور اس کا کرکٹ کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ یہ اسی اجتماعی لاشعور کا اظہار ہے۔ جو توحید پر یقین رکھتا ہے۔ اور یہی ہمارا قومی تشخص ہے۔

بعض حلقوں کی جانب سے یہ سوال اٹھایا جاتا ہے۔ کہ یہ تو مسلم اُمّہ کا تشخص ہے۔ پاکستانی تشخص کیا ہے؟ اس کی کیا خصوصیات ہیں۔ اور پاکستانی قوم کا تشخص مسلم اُمّہ کے تشخص سے کس طرح مختلف ہے۔ پاکستان کا قومی تشخص اس کے ثقافتی مظاہر میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ پاکستانی ثقافت' عرب ثقافت اور ایرانی ثقافت سے مختلف ہے۔ پاکستانی ثقافت ایک خاص جغرافیائی محل وقوع میں ایک مخصوص تاریخی عمل کے تسلسل میں تشکیل پائی ہے۔ بقول ابن خلدون جغرافیہ سب سے بڑا ثقافتی عامل ہے۔ چونکہ پاکستان کا جغرافیہ مختلف ہے۔ اس کے ثقافتی مظاہر بھی مختلف ہیں۔ اور یہی اس کی قومی شخصیت کی پہچان ہے۔ اس کے بعض عناصر معاصر تہذیب و ثقافت سے مماثل ہونے کے باوجود بھی مختلف اور ممتاز ہیں۔ جو ہماری قومی شخصیت کی پہچان بنتے ہیں۔ تہذیب معاشرے کی بنیادی ساخت ہے۔ اور بقول اسپنگلر معاشرے کی بقا و فنا اسی سے وابستہ ہے۔ ہماری بقاء و فنا بھی ہمارے قومی تشخص کے ساتھ وابستہ ہے۔

پاکستانیت کی تشریح کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ نے کہا ہے۔ کہ پاکستانیت سے مراد ایک مجموعی مسلم مزاج ہے جو اپنی ہزار سالہ تاریخ میں کُل مسلمانانِ ہند نے ایک بین الاقوامی اسلامیت کے تحت ڈھالا اس سلسلے میں علامہ اقبال کا یہ اقتباس بہت اہم ہے۔

"قومیت کا مسئلہ مسلمانوں کے لئے ان ممالک میں پیدا ہوتا ہے۔ جہاں وہ اقلیت میں ہیں۔ اور جہاں قومیت کے مغربی تصور کا تقاضا ہے۔ کہ مسلمان اپنی ہستی مٹا دیں۔ جن ممالک میں مسلمان اکثریت میں ہیں۔ اسلام قومیت سے ہم آہنگی پیدا کر لیتا ہے کیونکہ یہاں اسلام اور قومیت عملاً ایک ہی چیز ہیں۔ جن ممالک میں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ مسلمانوں کی یہ کوشش کہ ایک تہذیبی وحدت کی حیثیت سے خود مختاری حاصل کی جائے۔ حق بجانب ہوگی۔ دونوں صورتیں اسلام کے بالکل مطابق ہیں۔"

(حرف اقبال)

یہاں ہمیں قومی تشخص اور ریاستی تشخص میں فرق کرنا پڑے گا۔ قومی تشخص تبدیل نہیں ہوتا۔ اس کے بنیادی عناصر قطعی اور اٹل ہوتے ہیں۔ جبکہ ریاستی تشخص تغیر پذیر ہوتا ہے۔ ریاستی تشخص نسبتاً" مادی اور سیکولر ہوتا ہے۔ جبکہ قومی تشخص مابعد الطبیعیاتی ہوتا ہے۔ اس کی مثال روس کی حالیہ تبدیلیوں سے دی جا سکتی ہے۔ دراصل اجتماعی تشخص کی تین سطحیں ہیں۔ انسانی' قومی/نسلی اور ریاستی' انسانی سطح پر انسان کا اجتماعی لاشعور کردار کی بنیادی مثالوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ آفاقی اور عالمگیر ہوتا ہے۔ مثلاً" بحوالہ ژونگ' قربانی کا تصور تمام تہذیبوں میں ملتا ہے۔ نسلی یا قومی تشخص کسی خاص قوم یا نسل سے متعلق ہوتا ہے۔ جو مختلف تعصبات و توہمات اور اجتماعی عادات و رسوم یا بعض تصورات و عقائد کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ ریاستی تشخص جغرافیائی اور عمرانی ثقافتوں یا کسی معاہدے یا کسی نظریے کے زیر اثر تشکیل پاتا ہے۔ ان تینوں سطحوں میں نظریہ ہی ربط پیدا کر سکتا ہے۔ اور پاکستان میں یہ تینوں سطحیں نظریاتی طور پر مربوط ہیں۔ نظریے کا تعلق فکر سے ہے۔ اور فکر و زبان لازم و ملزوم ہیں۔ اس لئے ہیڈیگر زبان کو وجود کا مسکن کہتا ہے۔ زبان ہی قومی تشخص کا سب سے بڑا مظہر ہے۔

لسانیات کے جدید ماہرین نے زبان کو نفسیاتی' عمرانی اور بشریاتی پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ بعض ماہرین لسانیات زبان کو عضویاتی تفاعل سمجھتے ہیں۔ اور بعض اسے حیاتیاتی عمل سے تعبیر کرتے ہیں۔ امریکی ماہر لسانیات چومسکی لسانیات کے مطالعے میں نفسیات اور فلسفے کی دوئی کا قائل نہیں۔ لسانیات کے مطالعے میں نفسیات اور فلسفہ ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اس کے خیال میں انسانی ذہن کے مطالعے کے لئے لسانیات اہم خدمت سرانجام دے سکتی ہے۔ پس زبان کسی قوم کے مزاج کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ زبان کی صوتیات و ساختیات سے اس قوم کی عضویاتی ساخت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ہمارا عمومی کردار لسانی تلازمات کے ساتھ مشروط ہے۔ اس لئے زبان ہی سے قومی شخصیت کی عکاسی مؤثر طور پر ہو سکتی ہے۔ اور اردو اس قومی تشخص کی مشترک بنیاد ہے۔

زبان خدا کی ودیعت کردہ صلاحیت تسمیہ کا اظہار ہے۔ اس لئے اسلام میں لسانی تعصب کی کوئی گنجائش نہیں۔ اور مسلمانوں نے اپنے عروج کے دور میں کسی بھی زبان کو

ختم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بہر حال کسی بھی قوم کی پہچان اس کی زبان سے ہوتی ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں شکست کے بعد شہنشاہ جاپان ہیروہیٹو نے دستاویزات پر دستخط کرنے سے پہلے امریکی حکام کے سامنے یہ شرط رکھی کہ جاپانی جاپان کی قومی و سرکاری زبان رہے گی۔ اور اس میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔ امریکی حکام نے یہ شرط تسلیم کر لی۔ جاپانی بڑی مشکل زبان ہے۔ مگر جاپانی اسے تبدیل کرنے پر رضامند نہیں۔ وہ اپنا رسم الخط بھی تبدیل نہیں کرنا چاہتے جو اس زبان کی تحصیل میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ ایک جاپانی طالب علم کو صرف جاپانی زبان کی تحصیل پر ہی عمر کا ایک حصہ صرف کرنا پڑتا ہے۔ مگر وہ زبان کو اپنے قومی تشخص کا مظہر سمجھتے ہیں اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی یا ترمیم کو قومیت کے لئے خطرہ سمجھتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ زبان قومی تشخص کا اظہاری پیکر ہے۔ زبان اور قومی تشخص کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہ لازم و ملزوم ہیں کسی بھی قوم کے تشخص میں زبان اہم کردار ادا کرتی ہے۔ قوموں کی امتیازی علامت زبان میں ہے۔ بعینہٖ قومی تشخص بھی زبان کی تشکیل اور ترویج میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ الفاظ بہت بڑی طاقت ہیں۔ ہر لفظ اپنا ثقافتی سیاق و سباق اور تصوراتی پس منظر رکھتا ہے۔ جو اس کے مفاہیم متعین کرنے میں مدد دیتا ہے۔ یہ مفاہیم ایک خاص معاشرت و ثقافت میں جنم لیتے ہیں۔ جو کسی بھی دوسری زبان سے مختلف ہوتے ہیں۔

اردو ہمارے قومی تشخص کی پہچان ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ اردو سے ہمارا قومی تشخص ہے، تو بے جا نہ ہو گا۔ یہ قومی تشخص کسی بھی دوسری زبان میں خواہ وہ کتنی ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہو۔ نہیں ابھر سکتا۔ یہ تاریخی تسلسل کی مجبوری ہے جو اب ہمارے اجتماعی لاشعور کا حصہ بن چکی ہے۔ مثلاً لفظ خدا یا رب سے جو تصور کسی بھی ذہن میں ابھرتا ہے وہ لفظ God سے نہیں ابھارا جا سکتا۔ اسی طرح نماز کے لفظ سے جو تصور جنم لیتا ہے وہ لفظ Prayer سے کسی صورت بھی پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تو عام الفاظ کی مثالیں ہیں۔ زیادہ پیچیدہ صورت میں تو اور بھی الجھن پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً نبوت اور رسالت کے لئے انگریزی میں صرف ایک ہی لفظ ہے Prophecy یا prophet hood حالانکہ نبوت اور رسالت میں فرق ہے۔ اور ہمارے یہاں ہر پاکستانی اس فرق کو بخوبی جانتا

ہے۔ ہاں ایک طویل عرصے کے بعد شاید یہ ممکن ہو کہ ہم ان انگریزی الفاظ کے ساتھ اپنے تصورات وابستہ کر سکیں۔ مگر تاریخ کے پہیے کو اپنی مرضی سے گھمانا بہت مشکل ہے۔

زبان کا تعلق صرف ذہن اور زبان ہی سے نہیں۔ بلکہ آنکھ سے بھی ہے۔ لسانی ادراک ایک نفسیاتی حقیقت ہے جو اپنے تلازمات و التباسات رکھتا ہے۔ میرے نزدیک رسم الخط اور املاء عقیدے کا مسئلہ ہے۔ جب تحریر کا آغاز ہوا۔ تو انسان کے مابعد الطبیعیاتی تصورات نے تحریر کی تشکیل و ساخت میں اہم کردار ادا کیا۔ شاید اسی لئے فرانسیسی ساختیاتی مفکر دریدا (انگریزی تلفظ) نے تحریر کو بولنے پر مقدّم قرار دیا ہے۔ چینی اور جاپانی زبانیں اوپر سے نیچے اور دائیں سے بائیں جانب لکھی جاتی ہیں۔ اس میں ان کے عقیدے کا اظہار ہوتا ہے انگریزی اور بہت سی یورپی زبانیں بائیں سے دائیں جانب لکھی جاتی ہیں۔ عربی' فارسی' اردو اور پاکستان کی دیگر قومی زبانیں دائیں سے بائیں جانب لکھی جاتی ہیں۔ اس طرزِ تحریر میں یہ عقیدہ شامل ہے کہ سیدھے ہاتھ میں برکت ہے۔ اس لئے دائیں سمت اور دائیں رخ کو ترجیح حاصل ہے۔ دائیں سے بائیں جانب لکھنا پھیلاؤ کا عمل ہے۔ جبکہ بائیں سے دائیں جانب لکھنا سکیڑنے کا عمل ہے۔ یہ رسم الخط اور املاء ہماری ثقافت کی دو بڑی ماخذ زبانوں عربی اور فارسی سے مماثل ہے۔ یہ رسم الخط اور املا قرآن سے مماثل ہے۔ جو ہماری الہامی کتاب ہے۔ اردو کا ایک اچھا طالب علم اگر قرآن نہیں پڑھا ہوا تو وہ تھوڑی سی کاوش سے قرآن پڑھ سکتا ہے۔ اگر اردو کا یہ رسم الخط نہ ہو۔ تو یہ سہولت ختم ہو جائے گی۔ اسی لئے اردو کے لئے دیوناگری اور رومن رسم الخط دونوں کو مسترد کر دیا گیا تھا۔ ترکی میں ترکی کے رسم الخط کی تبدیلی نے ایک طرف الفاظ کے ثقافتی اور تصوراتی ادراک کو بدل کر رکھ دیا اور دوسری طرف نئی نسل ثقافتی ورثے سے نابلد رہی۔ اس لئے اردو ہی ہمارے قومی تشخص کے اظہار کے لئے بہترین ذریعہ ہے۔ اس رسم الخط کے ساتھ مابعد الطبیعیاتی تصورات بھی وابستہ ہیں۔ چینی اور جاپانی مزاجا" مقرون سے مجرّد کی طرف جاتے ہیں۔ یا تصویر سے خیال کی طرف سفر کرتے ہیں۔ ہم مسلمان ایمان بالغیب کے قائل ہیں۔ ہم مجرد سے مقرون کی طرف

آتے ہیں اور خیال سے تصویر کی طرف سفر کرتے ہیں۔ اردو الفاظ کی شکلوں کے ساتھ ہماری بہت سی ذہنی کیفیات بھی وابستہ ہو چکی ہیں۔ جن سے ہم حظ اٹھاتے ہیں۔ فن خطاطی ہمارے جمالیاتی ذوق کی تسکین کا ذریعہ ہے۔

برصغیر کی جدوجہد آزادی میں اردو مسلمانوں کی زبان کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئی۔ ہندی اردو تنازعے کی طویل داستان میں اردو مسلمانوں کی شناخت بن گئی۔ اس لسانی تنازعے سے سرسید احمد خان نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ہندوستان میں دو بڑی قومیں آباد ہیں۔ ہندو اور مسلمان۔ ہندی اردو تنازعہ ہی دو قومی نظریے کی بنیاد بنا۔ اور تحریک پاکستان میں مسلمانوں نے اردو ہی کو اپنے قومی تشخص کی علامت بنایا۔

اردو پاکستانیوں کے لئے ثانوی دینی زبان کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ ہمارے تہذیبی' ثقافتی اور دینی ورثے کا بہت سا سرمایہ اردو میں موجود ہے۔ اور دینی سرمائے کو اردو میں منتقل کرنا آسان ہے۔ بیشتر اسلامی کتب قرآن و حدیث' تفسیر و فقہ اور تاریخ وغیرہ کا اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے اور بعض بہت اہم کتابیں اردو ہی میں لکھی گئی ہیں۔ یوں اردو دین کی تفہیم کا ایک آسان ذریعہ ہے۔ اردو قاری ہمارے تہذیبی' ثقافتی اور دینی ورثے سے باآسانی روشناس ہو سکتا ہے۔

پاکستان ایک ایسی سرزمین ہے۔ جہاں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ یہ سب ہماری قومی زبانیں ہیں۔ اور ہمارے قومی تشخص کے زاویے کرنوں کی شکل میں مختلف لسانی پیکروں میں ڈھلتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں رابطے کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ یہ فریضہ اردو ہی سرانجام دے سکتی ہے۔ اردو ہمارے لئے رابطے کی زبان ہے۔ اردو ہی ہمارے درمیان وحدت' ہم آہنگی اور یکجہتی پیدا کر سکتی ہے۔ اردو ہمارے قومی تشخص کی پہچان ہونے کے ساتھ ساتھ ریاستی تشخص کی بھی ضامن ہے۔

maablib.org

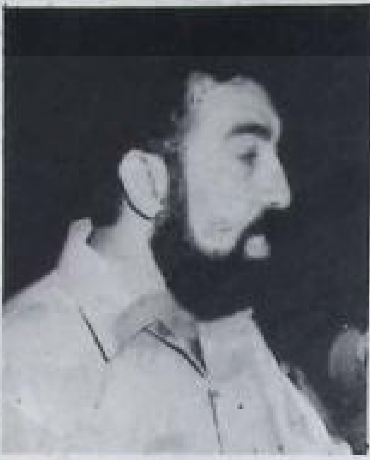

آقائے شاہ رخ عرب شاہی

ایران میں اردو

معمول ہے کہ ہر ایرانی اردو زبان و ادب کے متعلق بات کرتے وقت اردو اور فارسی زبان و ادب کے گہرے قدیم تعلقات اور ان کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ لیکن یہاں موجودہ موضوع کے تقاضے کے تحت میرا ارادہ نہیں ہے کہ ان تعلقات کو جو میرے خیال میں اردو زبان کی اساس اور تبدیلیوں کی شناخت میں بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں کی طرف اشارہ کروں بلکہ ایک بین الاقوامی ثقافتی تعلقات کے ایک نمائندہ کے طور پر چاہتا ہوں کہ بین الاقوامی ثقافتی تعلقات میں اردو زبان و ادب کے مقام کی طرف مختصر طور پر اشارہ کروں۔

ہر ملک کی زبان اور اس کا ادب اس ملک کے بیرونی ثقافتی مفاہیم کی منتقلی کے اہم ترین وسائل میں سے ایک ہوتا ہے۔ زبان و ادب فکر و خیال کے اظہار کے لئے ایک بہت موثر وسیلہ ہے، انسانی مکاتب کے بہت سے مکاتب نے زبان و ادب کے ذریعے ہی وسعت پائی ہے۔ حتیٰ کہ مکاتب الٰہی میں فکر و خیال کو پھیلانے میں اس وسیلے کی اہمیت پر زور دیا ہے اور شاید کہا جا سکتا ہے کہ قرآنی ادب ہی اسلامی ثقافت کی اشاعت کے موثر عوامل میں سے ایک ہے لیکن اردو زبان و ادب کے سلسلے میں وہاں سے جہاں یہ زبان کسی

نہ کسی طرح پاکستان کی ثقافتی شناخت سے مربوط ہے۔ پاکستان کے خارجی ثقافتی تعلقات کی درست حکمت عملیوں کے سلسلے میں ایک مؤثر وسیلے کے طور پر قابل استفادہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اردو زبان و ادب پاکستان کی ثقافتی شناخت سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ زبان' زبان شناسی کے نقطہ نظر سے ایک زبان معیار کے طور پر پہچانی جاتی ہے اور جیسے کہ اساتذہ کرام جانتے ہیں زبان معیار تعلقات کے لحاظ سے معاشرے کی تمام وحدتوں مختلف زبانوں اور آوازوں کے ساتھ ایک دوسرے سے وابستہ ہے۔

زبان معیار یا تو قدرتی طور پر اس مقام پر پہنچتی ہے یا دانستہ معیار کے طور پر واقع ہوتی ہے لیکن اردو زبان و ادب کی اس سلسلے میں ایک غیر معمولی اہمیت ہے' کیونکہ فطری اعتبار سے بھی اور دانستہ آگاہی کی صورت میں بھی پاکستانی معاشرے کی زبان معیار کے طور پر آئی ہے۔ اردو زبان و ادب وقت گزرنے پر برصغیر پاک و ہند کے مسلمان معاشرے کی زبانی صورتوں میں سے ایک صورت اپنی تمام تاریخ میں مشترک اور زبان معیار کے مرحلے پر برصغیر کے مسلمان معاشرے میں پہنچتی ہے اور آگاہانہ انتخابی نقطہ نظر سے پاکستانی معاشرے کی تاسیس میں اردو زبان و ادب آگاہانہ صورت میں اور منصوبہ بندی کے ساتھ پاکستانی معاشرے کی زبان معیار کے طور پر منتخب کی گئی لہٰذا اردو زبان و ادب کے معیار قرار پانے پر پاکستانی معاشرے کا باتوجہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ یہ زبان و ادب پاکستانی معاشرے کی تاسیس کے بعد اپنی زندگی کے ایک جدید مرحلے میں داخل ہو گئی ہے۔ بہرحال اسی نقطہ نظر سے اردو زبان و ادب کو پاکستانی معاشرے میں زبان معیار کے طور پر پیش کیا گیا ہے نیز پاکستان کی ثقافتی شناخت کے ساتھ اس کا تعلق ہے اور باوثوق فیصلے کی بنا پر اس زبان کا فطری ہونا ہی زبان معیار ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ زبان و ادب پاکستان کے خارجی ثقافتی تعلقات کی تنظیم میں ایک بہت ہی مؤثر وسیلے کار بن سکتا ہے اس مقصد کے لئے ہر اقدام سے قبل ضروری ہے کہ پاکستان کے ادبی معاشرے سے آشنائی ہو تاکہ معلوم ہو سکے کہ یہ کن ارکان پر مشتمل ہے۔ جب تک اس قسم کے ادبی معاشرے کا وجود واضح نہ ہو جائے اردو زبان و ادب کو تنہا بین الاقوامی ثقافتی روابط کی

پالیسیوں میں صرف نہیں کیا جا سکتا حتیٰ کہ اس کو ادبی تعلقات کے سلسلے میں خارجی ثقافتی روابط کے ایک شعبے کے طور پر بھی استعمال نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن اس بارے میں کہ پاکستان کا ادبی معاشرہ افراد کے کس گروہ سے تعلق رکھتا ہے؟ شاید کہا جا سکتا ہے کہ اردو زبان کے ادباء و شعراء کے ساتھ ساتھ پاکستان کے فارسی زبان کے شعراء و ادباء بھی پاکستان کا ادبی معاشرہ بنانے والوں میں شامل ہیں۔

پاکستان کے ادبی معاشرے سے شناسائی حاصل کرنے کے بعد اور خارجی ثقافتی تعلقات کے پس منظر میں ہر قسم کے پروگرام کے اہتمام سے پہلے اردو زبان اور اردو ادبیات کی دو معنی تقسیم ناگزیر نظر آتی ہے۔ اس تقسیم کے ساتھ ان ذرائع کو جو اردو زبان و ادب کے الہام دہندہ ہیں بھرپور بنایا جا سکتا ہے۔ یہ تمام چیزیں اردو زبان کے ساتھ رابطہ میں ضروری ہوں گی تاکہ پاکستان کا ادبی معاشرہ زبان شناسی کی دریافتوں سے بہرہ مند ہو یا اردو ادب کے ساتھ رابطہ میں، ضروری ہو گا کہ پاکستان کا ادبی معاشرہ معاشرتی موضوعات کی طرف زیادہ متوجہ اور مائل ہو زبان شناسی کی دریافتوں کے قطعی استعمال اور خودی کے معاشرتی موضوعات کی مکمل معلومات اور تمام معاشروں کے معاشرتی موضوعات کے ساتھ ان کا مقابلہ اور موازنہ پاکستان کے ادبی معاشرے کے ساتھ کیا جائے تو اردو زبان و ادب بین الاقوامی روابط کے ضمن میں خصوصاً" ادبی خارجی روابط کو بہت زیادہ کامیاب بنائے گا۔

تیسرا مرحلہ، اردو زبان و ادب کے طریق اظہار کے ذریعے خارجی ثقافتی تعلقات کی حکمت عملی کے اجراء اور تنظیم سے پہلے مناسب ہو گا کہ ضروری تحقیقی موضوعات کے عنوانات کا ایک حصہ ملحوظ خاطر رکھیں۔ میں یہاں چند عنوانات کی طرف جو میرے ذہن میں آئے ہیں اشارہ کرتا ہوں۔

1- اردو زبان و ادب کے خارجی اثرات کا مطالعہ اور تحقیق
2- برصغیر میں اسلامی ثقافت کی اشاعت پر اردو زبان و ادب کے اثرات
3- مکانیزم کا انکشاف۔ معاشرتی تبدیلیوں اور اردو زبان و ادب کی تبدیلیوں کے ایک دوسرے پر اثرات

4- اردو زبان و ادب علمی مسائل و مفاہیم کے روبرو
5- پاکستان میں اردو زبان و ادب پر انگریزی زبان و ادب کے اثرات کا مطالعہ و تحقیق۔
6- اردو زبان و ادب پر تمام معاشروں کے لسانی' ادبی اور ثقافتی اثرات کا مطالعہ و تحقیق
7- ہندوپاکستان میں اردو زبان و ادب کی اہمیت کا موازنہ
8- اردو زبان و ادب پر سیلائٹ ٹیلی وژن کے اثرات کی تحقیق
9- پاکستان میں افغان مہاجرین کے ذریعے افغانستان میں اردو زبان و ادب کی ترویج
10- ثقافتی وحدت میں اردو زبان و ادب کے اثرات اور اہمیت کا مطالعہ' مقامی زبانوں کے ساتھ تعلق' تمام عورتوں اور بچوں کا طرح طرح کے گروہوں کے ساتھ رابطہ' نشرواشاعت کے گروہ یعنی ریڈیو' ٹیلی وژن اور لٹریچر کے ساتھ رابطہ' پاکستان میں اور خاص طور پر اردو زبان و ادب کی معاشرہ شناسی یعنی پاکستانی معاشرے کی تاسیس سے پہلے اور بعد اردو زبانداںوں کے ساتھ اردو کے ادبی اور لسانی تعلقات۔

میں یہاں یہ اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان تحقیقی عنوانات میں سے اکثر عنوانات کے لئے فارسی زبان و ادب کی مدد لینا ناگزیر ہے۔ خصوصاً فارسی زبان و ادب اردو زبان و ادب کی توانائی میں فرہنگ اسلامی کی اشاعت کے سلسلہ میں خارجی اثرات کے تحت پاکستان کے ادبی معاشرے کا مددگار اور دوست تھا اور رہے گا۔

اس سلسلے میں میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ایران میں اردو زبان و ادب کی صورت حال کی طرف مختصر طور پر اشارہ کروں۔

1956ء میں تہران یونیورسٹی میں اردو ڈیپارٹمنٹ کی بنیاد رکھی گئی اور اس شعبہ نے 1980ء تک ثقافتی انقلاب نامی تحریک کے زمانے تک ایرانی یونیورسٹیوں میں اپنی سرگرمیاں دکھائیں اس کے بعد کچھ عرصے تک ایرانی یونیورسٹیاں بند رہیں اور دوبارہ کھلنے کے بعد نئے سرے سے یونیورسٹیوں نے بتدریج مختلف تعلیمی شعبوں کو اسلامی قدروں سے روشناس کروایا۔ یہاں تک کہ 1986ء میں آیت اللہ خامنہ ای کے پاکستان کے دورے کے موقع پر نئے ثقافتی معاہدوں کی توثیق کی بنیاد پر اس شعبہ نے اپنی

سرگرمیاں دوبارہ شروع کر دیں اور اب تہران یونیورسٹی کے علاوہ علامہ طباطبائی یونیورسٹی میں بھی اردو زبان و ادب پڑھایا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ فارسی زبان و ادب کے تعلیمی شعبوں میں بھی اختیاری طور پر 30 یونٹ اردو پڑھانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایران میں بہت سی کتب اردو میں ترجمہ اور تالیف ہوئی ہیں یہاں تک کہ کیہان نامی ایک اخبار اردو میں شائع ہو رہا ہے۔

دیکھا جاتا ہے کہ ایران میں نہ صرف اردو زبان و ادب سے محبت کی بناء پر برصغیر کے علاقے میں اسلامی ثقافت کی اشاعت میں اس زبان کی اہمیت کو چار چاند لگے بلکہ بین الاقوامی روابط میں اس زبان کے کردار کے اعتبار سے اس کی وسیع آموزش کی طرف توجہ دی جا رہی ہے اور بہتر ہے کہ پاکستان کا ادبی معاشرہ اس سلسلے میں نہ صرف ایرانی یونیورسٹیوں میں اردو زبان و ادب کے ان تعلیمی شعبوں کو لٹریچر کی ترسیل کے ذریعے راہنمائی کر کے ممد ومعاون ثابت ہو سکتا ہے بلکہ ایران کے مختلف شہروں میں بھی اس زبان کی وسعت کے طلب گار موجود ہوں گے' بعینہٖ اسلامی جمہوریہ ایران کی جانب سے پاکستان کے مختلف شہروں میں فارسی زبان و ادب کی آموزش کا اہتمام کیا گیا ہے۔

آخر میں پاکستان کے ادبی معاشرے کے عالمی ادبی معاشرے سے تعلقات کے پیش نظر تجویز کرتا ہوں کہ بلند پایہ حکمت عملیوں کے تحت موجودہ سیمینار جیسے سیمینار منعقد ہونے چاہئیں تاکہ خارجی ثقافتی روابط میں اردو زبان و ادب کی کارسازی کے مختلف پہلوؤں کی تحقیق کا کام احسن طریق سے انجام پائے۔

میں اساتذہ کرام اور بزرگان محترم کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے وقت دیا تاکہ میں اپنے خیالات کا اظہار کر سکوں۔

"والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ"

maablib.org

یوان وے شوائے

چین میں اردو

زبان انسانی جذبات کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ لوگوں کے مابین میل جول کا آلہ ہے ملکوں کے درمیان تعلقات کو آگے بڑھانے اور دوستی میں اضافہ کرنے کا پل ہے۔ اردو ایک ایسی زبان ہے۔ جو دنیا کے ہر گوشے میں بولی جاتی ہے۔

اردو پاکستان کی قومی زبان ہے۔ پاکستان چین کا پڑوسی اور دوست ملک ہے۔ اس لئے چینی عوام اردو پر بڑی توجہ دیتے ہیں۔ ریڈیو بیجنگ میں اردو سروس ہے۔ پاکستان کے وقت کے مطابق رات کے نو بجے سے دس بجے تک اردو پروگرام نشر کیا جاتا ہے۔ بیجنگ میں ایک غیر ملکی اشاعت گھر ہے۔ جس میں ہر قسم کی اردو کتابیں چھاپی جاتی ہیں۔ چین میں ایک اردو رسالہ بھی نکلتا ہے۔ جس کا نام "چین باتصویر" ہے۔ بیجنگ یونیورسٹی میں اردو کا شعبہ ہے۔ جہاں پاکستانی ماہر پڑھاتے ہیں ایک بہت بڑی لائبریری ہے جس میں ہر قسم کی اردو کتابیں رکھی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ بیجنگ لائبریری میں اُردو کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ اس وقت چین میں ایک سو سے زاید افراد اردو بول سکتے ہیں وہ چین کی وزارت ثقافت بیجنگ یونیورسٹی' ریڈیو بیجنگ' غیر ملکی زبانوں کے اشاعت گھر اور دوسرے محکموں میں کام کرتے ہیں۔ ان افراد نے چین اور پاکستان کے عوام کے درمیان مفاہمت اور دوستی کے لئے بڑی خدمت کی ہے۔

چینی عوام اردو ادب سے اجنبی نہیں ہیں۔ پریم چند' علامہ اقبال' سعادت حسن

منٹو، فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی چین میں بہت مشہور ہیں۔ اقبال کی شاعری اور احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کا ترجمہ پانچویں عشرے میں چینی زبان میں ہوا، لیکن انگریزی اور روسی سے۔ براہ راست اردو سے چینی میں ترجمہ کرنا ساتویں عشرے میں شروع ہوا۔ امراؤ جان ادا، باغ و بہار، اداس نسلیں، خدا کی بستی، آنگن، ایسی بلندی ایسی پستی اور دوسری کتابیں چینی زبان میں چھپ گئی ہیں۔ جنہیں چینی عوام بہت پسند کرتے ہیں۔

جہاں تک میرا تعلق ہے۔ میں نے قائد اعظم محمد علی جناحؒ، اداس نسلیں، مجاہد، زمین، ایسی بلندی ایسی پستی، منٹو کے افسانے، پاکستانی کی لوک کہانی کا ترجمہ کیا، اردو انگریزی چینی لغت ترتیب دی اردو میں کتاب "چین کے مشہور ادیب و شاعر" لکھی اور "سفر دوستی کا" چینی سے اردو میں ترجمہ کیا۔

میرے خیال میں اردو ایک پیاری اور میٹھی زبان ہے اور جاندار اور ترقی پسند زبان بھی ہے۔ وہ دوسری زبانوں کی خوبیاں اپنے لئے لے لیتی ہے۔ اس لئے مجھے بہت پسند ہے۔ میں پاک چین دوستی میں اضافہ کرنے کے لئے کوشش کرتا رہوں گا۔ اور اپنی زندگی اردو کی خدمت میں وقف کروں گا۔

پاک چین دوستی زندہ باد!

جمشید مسرور

ناروے میں اردو

سکینڈے نیویا کے ممالک بالخصوص ناروے' ڈنمارک اور سویڈن میں پاکستانی ہم وطنوں کی کافی تعداد بطور تارکین وطن رہائش پذیر ہے۔ ان میں پاکستان کے سارے خطوں اور بولیوں کی نمائندگی موجود ہے' لیکن بہت بڑی تعداد بہر حال پنجاب کے اضلاع گجرات اور سیالکوٹ کے شہری علاقوں سے کم کم اور دیہاتی علاقوں سے زیادہ تعلق رکھتی ہے' ان میں اصولاً نیم خواندہ اور غیر پیشہ ورانہ مہارت کے لوگوں کی ایک کثیر تعداد پاکستان کی نمائندگی کرتی ہے لیکن ساتھ ہی یہ امر باعث اطمینان ہے کہ صورت حال کو بہتر بنانے کے لئے خواندہ لوگوں کی ایک مخصوص تعداد بھی مل جاتی ہے۔

میرا تعلق چونکہ ناروے سے ہے' اس لئے میں یہاں ناروے کے حالات پر ہی تبصرہ کروں گا' جو اپنی جگہ پورے سیکنڈے نیویا پر بھی لاگو ہو سکتا ہے۔ پچھلے عرصہ میں چند حیرت انگیز رپورٹیں شائع ہوئیں جن میں ناروے میں دنیا بھر سے آنے والے تارکین وطن کی اوسط تعداد کو مقامی لوگوں کی اوسط تعداد کے مقابلے میں زیادہ تعلیم یافتہ پایا گیا۔ یہ بات تو ضمنی ہے۔ لیکن وہاں بسنے والے ہم وطنوں کی نئی نسلوں کے لئے اسے باعث فخر بھی قرار دیا جائے گا اور وہ سر اٹھا کر کہہ سکیں گے۔ ہم بھی تعلیم یافتہ لوگوں کی اولاد ہیں۔

ناروییجئن حکومت ایک مکمل جمہوری حکومت ہے اور ناروے کے عوام اس

جمہوریت کے پھل کھاتے ہیں۔ محکمہ تعلیم کی سفارشات پر نارو یجین سکولوں میں نارو یجین زبان کے علاوہ تارکین وطن کے بچوں کے لئے ثانوی زبان کے طور پر ان کی مادری زبان کی تدریس کو لازمی قرار دیا گیا تاکہ بچے اپنی مادری زبان میں بھی تعلیم حاصل کر سکیں' اور نئی مقامی زبان نارو یجین بھی سیکھ سکیں جب اس سلسلے میں اساتذہ اور استانیوں کی ضرورت پڑی تو عموماً غیر تربیت یافتہ لوگوں کو مادری زبان کے استاد کی نوکری مل گئی۔ یہ لوگ اردو سے معمولی شُدبُد رکھنے والے لوگ تھے۔ جن کے پاس استاد بن سکنے کی اہلیت کی بالعموم کوئی سند نہ تھی۔ ایسے استاد کی اپنی تربیت اور استعداد اور ایک نارو یجین استاد کی تربیت اور استعداد میں زمین و آسمان کا فرق تھا یہ وہی لوگ تھے جو ایک عام پاکستانی استاد کے عام رجحانات بھی ساتھ رکھتے تھے۔ یعنی بچوں پر بلاوجہ نکتہ چینی اور ان کی ذہنی اٹھان کو جا و بے جا احکام سے دبائے رکھنے کا رجحان۔ اس کے برعکس نارو یجین استاد کی تربیت اسے بچوں سے سلوک کا ایک بالکل الگ سبق دیتی ہے۔ بچوں نے اردو پڑھنا شروع کی۔ تو محکمہ تعلیم نے جس پاکستانی فرد سے رائے مانگی۔ اس نے ٹیکسٹ بک بورڈ کے منظور شدہ قاعدہ کی سفارش کی بجائے خود ایک قاعدہ ترتیب دے ڈالا۔ جہاں مثلاً ع سے عینک کی بجائے ع سے عالم ایسے لفظ کو استعمال کیا۔ بغیر فن استعداد اور ضروری شرائط کی عدم موجودگی میں بعض نے اردو نارو یجین ڈکشنریاں تک غلط سلط الفاظ سے پر کر کے ترتیب دے ڈالیں۔ اسی اثناء میں کچھ نیم خواندہ افراد نے علماء کے نام سے اپنی اپنی مساجد بنا لیں۔ حکومت نے دل کھول کر امداد دی۔ تو انہوں نے ساتھ ہی مدرسے بھی بنا ڈالے اور وہاں اردو پڑھانے لگے اور اردو میں حساب کتاب سکھانے کا بندوبست بھی کیا۔ بچوں کو معاشرے کی مرکزی لہر سے جدا کرنے میں ایسی تنظیموں کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ ایسے بچے اور ان کے والدین ذہنی اور جسمانی طور پر اب بھی ناروے میں آباد نہیں۔ اپنے اپنے گاؤں میں آباد ہیں۔ ایک مسئلہ یوں بھی پیدا ہوا کہ مادری زبان کے خانے میں تو بچوں نے مثلاً پنجابی لکھا۔ لیکن تعلیم کے خانہ میں اردو لکھا گیا۔ جو نارو یجین حکام کے لئے ایک پیچیدہ مسئلہ بنا رہا۔

اب پاکستانی بچے بالعموم سکول میں نارو یجین میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ان کے

لئے اردو سیکھے بغیر بھی چارہ نہیں۔ انگریزی چوتھی جماعت کے بعد لازمی ہے۔ قرآن شریف کے حوالے سے پڑھنے کی حد تک عربی سیکھنا بھی ضروری ہے۔ اس کے علاوہ ایک آدھ یورپی زبان بھی سیکھنا پڑتی ہے جو یورپ میں زندہ رہنے کے لئے ضروری ہے۔ کیونکہ یورپ کی سرحدیں ختم ہوتی جا رہی ہیں اور یورپی مشترکہ منڈی کے طفیل ربط و ضبط کے مواقع ملنا آسان تر ہوتا جا رہا ہے۔

کسی بھی ملک میں زبان کے پنپنے کا دارومدار کُلّی طور پر اس زبان کی معاشرے میں افادیت پر ہے اردو کو پاکستان کی قومی زبان کا درجہ حاصل ہے۔ اس لئے بظاہر زمین سے براہ راست تعلق نہ ہونے کے باوجود اردو پاکستان میں بولی لکھی اور پڑھی جا رہی ہے اور اردو میں علم و ادب کسی بھی مقامی بولی سے زیادہ تخلیق ہو رہا ہے۔

اس کے برعکس سیکنڈے نیویا میں اردو جاننے والے افراد کی ایک بڑی تعداد موجود ہونے کے باوجود اردو ایک اقلیتی زبان ہے۔ جس میں لکھنے پڑھنے کا کام صرف وہی افراد کرتے ہیں اور کر سکتے ہیں۔ جنہیں تارکین وطن کی پہلی کھیپ کا نام دیا جاتا ہے۔ تارکین وطن کی دوسری نسل کے بچے مقامی زبان کو اپنی عام رابطے کی زبان کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ جبکہ ان کے ماں باپ اپنی اپنی قومی اور مادری زبان ہی استعمال کرتے ہیں۔ اگر ایسے بچے اردو کا بہتر علم حاصل کر بھی لیں۔ تو اصولاً لاحاصل ہے۔ کیونکہ انہیں علم ہے کہ وہ اس زبان کو اپنے دفاع میں استعمال نہیں کر سکتے۔

زبان قوت ہے۔ باہر سے آنے والے تارکین وطن ناروے اور سیکنڈے نیویا میں یا تو معاشی ہجرت کر کے آتے ہیں۔ یا سیاسی پناہ لے کر۔ اس سارے عمل میں درخواستوں اور انتظار کے ایک طویل عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس دوران ایک تارک وطن کو اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ اگر ناروے میں رہنا ہے۔ تو نارویجین ہی بولنا‘ پڑھنا اور لکھنا پڑے گی۔ شروع کے معمولی وقتوں میں آپ انگریزی یا کسی دوسری زبان کا نہایت عارضی سہارا لے سکتے ہیں لیکن بہت جلد آپ سے مطالبہ شروع کر دیا جاتا ہے کہ "نارویجین بولئے"

ناروے میں ہماری اگلی نسلوں کے لئے بہرحال اردو کی افادیت سے مکمل انکار نہیں

کیا جا سکتا۔ اگر ملاقات پر بچے پاکستان آئیں گے۔ تو "گراس رُوٹس" پر ابلاغ کے لئے اور نئے دوست بنانے کے لئے انہیں اردو کا تھوڑا بہت علم ہونا ضروری ہے۔ اس ضمن میں اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ جو سیکنڈے نیوین افراد اٹھارھویں صدی کے آخر میں امریکہ کی طرف ہجرت کر گئے تھے۔ ان کے گھرانوں میں آج بھی نارویجین بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اگرچہ انہیں امریکی بنے زمانہ گزر چکا ہے۔

اجنبی معاشروں میں انسان کے اکائی کے طور پر گم ہو جانے کے شدید امکانات ہوتے ہیں۔ ہر تارک وطن اپنے نئے ملک میں انفرادی ردعمل کا مظاہرہ کرتا ہے۔ بہت معمولی تعداد میں نیم خواندہ افراد نئے معاشرے سے وفاداری ظاہر کرنے کے لئے مذہب بھی تبدیل کر سکتے ہیں۔ کچھ اپنے گھروں میں بھی مکمل طور پر نئی زبان اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے برعکس دیگر افراد ردعمل میں الرجک بھی ہو جاتے ہیں اور ہر اس بات سے بیزاری کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔ جو نئے معاشرے میں موجود ہو۔ مثلاً زبان' ثقافت' رنگ اور نسل لیکن اگر نئے معاشرے میں رہنا ہی ہے اور آئندہ نسلوں کے لئے کوئی واضح پروگرام بھی موجود نہیں تو اس "ڈائیلما' سے صرف متوازن ردعمل کا مظاہرہ ہی کسی قدر حفاظت کر سکتا ہے اور متوازن ردعمل یہی ہو گا کہ اپنی جڑوں سے کٹنے کی بجائے نئے ماحول میں کسی قدر انفرادیت کا مظاہرہ کیا جائے۔ اور نئے معاشرے کی اچھی اقدار کو اپنایا جائے۔ ان میں سب سے بڑا ہتھیار بہرحال زبان ہو گی۔ جس کا سہارا لے کر نئے معاشرے کے افراد اپنی طاقت بھی برقرار رکھتے ہیں۔ اور برتری بھی' نوکریاں بھی انہیں ملتی ہیں اور سہولتیں بھی انہی کے لئے۔ تاآنکہ تارکین وطن اپنی اہلیت ثابت کریں۔ یہ اہلیت مقامی زبان سیکھنے میں ہی مضمر ہو گی۔

جو تارکین وطن وہاں اپنی ثقافت کو قائم رکھنے کے لئے فکری سطح پر جدوجہد کرتے ہیں۔ وہ ادیب اور شاعر حضرات ہیں۔ وہاں اپنے وطن سے مختلف ادباء اور شعراء کو دعوت دے کر بلایا جاتا ہے۔ فنکاروں اور قلمکاروں کو بلا کر پرانی اور نئی نسل کی تفریح طبع کا سامان کیا جاتا ہے۔ اور اس طرح اردو کے لئے دلچسپی اور ماحول مہیا کیا جاتا ہے۔ جس میں اردو کے پنپنے رہنے کے امکانات روشن ہو جاتے ہیں۔

اس لئے بیش قیمت انفرادی کوششوں کے علاوہ حکومت پاکستان کو بھی چاہئے کہ وہ ایسے کاموں میں بیرون ملک رہنے والے سنجیدہ کام کرنے والوں کی سرپرستی بھی کرے۔ یہاں میں حکومت ناروے کا بہترین الفاظ میں ذکر کرنا چاہوں گا جو تمام تر اجنبیت کے باوجود اردو کی سرپرستی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔ بات یہاں تک پہنچی ہے کہ عام تقریبات میں امدادی کاموں کے علاوہ حکومت ناروے نے مجھے یہ کام سونپا کہ میں اپنے رسالے "بازگشت" کا اردو کا عالمی ادبی نمبر نکالوں جو برصغیر سے باہر اپنی طرز کا تقریباً 450 صفحات پر مشتمل واحد ضخیم شمارہ ہے اور اپریل کے آخر تک لاہور میں شائع ہو کر تیار ہو جائے گا۔ اس میں حکومت ناروے کے علاوہ ایک پرائیویٹ Eckbos legacy، Adv. نارویجین رائٹرز گلڈ اور نارویجین کلچرل کونسل نے بھی بھرپور تعاون کیا۔ اس طرح ایک اور بڑے اردو پراجیکٹ کے لئے تینوں بڑے سیکنڈے نیوین ممالک یعنی ناروے، سویڈن اور ڈنمارک کی مشترکہ کونسل "دی ناردرن کونسل" نے مجھے خطیر رقم کی پیش کی ہے۔ یہ حکومت پاکستان کے لئے ایک چیلنج ہے۔ ملتان کی آج کی تقریب کے حوالے سے میں امید کرتا ہوں کہ حکومت پاکستان دوسرے برّاعظموں میں بھی اردو کی ترویج کے لئے کام کرتی رہے گی۔

maablib.org

عالمی اردو کانفرنس اور قراردادیں

عالمی اردو کانفرنس نے حکومت پاکستان کو نفاذ اردو کے سلسلے میں جو قرار دادیں بھجوانے کا فیصلہ کیا ان کی سفارشات کے لئے حسب ذیل کمیٹی تشکیل دی گئی تھی۔

ڈاکٹر جمیل جالبی چیئرمین مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد' ڈاکٹر وحید قریشی سیکرٹری بزم اقبال لاہور' ڈاکٹر سلیم اختر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور' ڈاکٹر طاہر تونسوی پرنسپل گورنمنٹ کالج سول لائنز ملتان'

دس قرار دادوں کا مسودہ تیار کیا گیا اور انہیں عالمی اردو کانفرنس کی دوسری نشست میں منظوری کے لئے ایوان کے سامنے پیش کیا گیا۔ قراردادیں یہ ہیں۔

(۱)

نفاذ اردو کو آئینی حیثیت اختیار کیے ہوئے ایک طویل مدت گزر چکی ہے۔ ہر شعبہ زندگی میں اردو کا نفاذ ایک اہم قومی ضرورت بھی ہے اور قوم کا پرزور مطالبہ بھی۔ عالمی اردو کانفرنس کا یہ اجلاس حکومت اور ارباب اختیار سے پرزور مطالبہ کرتا ہے کہ اردو کو پاکستان کے دفاتر' عدالتوں بنکوں اور تعلیمی اداروں میں بلا تاخیر نافذ کر کے قومی امنگوں اور ملک کے آئینی تقاضوں کو پورا کیا جائے۔

(۲)

اردو پاکستان کی قومی زبان ہے۔ اس کے ذریعے روز مرہ زندگی کے تقاضوں سے بہرہ مند ہونا ہر پاکستانی کا قانونی اور آئینی استحقاق ہے۔ عالمی اردو کانفرنس کا یہ اجلاس حکومت اور ارباب بست و کشاد سے مطالبہ کرتا ہے کہ عوام کے لئے جاری ہونے والے دفتری اعلانات، مراسلات، فارم وغیرہ لازمی طور پر اردو میں جاری کئے جائیں تاکہ پاکستان کا ہر شہری اس کے فوائد سے بہرہ مند ہو سکے۔ اور قومی زبان کے متن کو قانونی درجۂ استناد حاصل رہے۔

(۳)

پاکستان کے نوے فیصد عوام قومی زبان کے شعور سے بہرہ مند ہیں۔ انھیں اس بات سے سخت تشویش ہے کہ اس ملک کا سرکاری گزٹ قومی زبان کو نظر انداز کرتے ہوئے کسی ایسی زبان میں شائع ہو جس سے صرف چند فی صد لوگ استفادہ کریں۔ عالمی اردو کانفرنس کا یہ اجلاس حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ پاکستان کا سرکاری گزٹ اردو میں شائع کیا جائے تاکہ یہ گزٹ قومی تشخص کو اجاگر کر سکے۔

(۴)

قومی زبان میں فنی اور دفتری مہارت حاصل کرنا ہر باشعور اور باعزت قوم کا بنیادی حق ہے۔ عالمی اردو کانفرنس کا یہ اجلاس حکومت سے پر زور مطالبہ کرتا ہے کہ سول سروس کے تمام تعلیمی و تربیتی اداروں میں اردو بطور لازمی مضمون پڑھائی جائے اور دفتری ضروریات کے لئے اردو مختصر نویس اور ٹائپ کار کو انگریزی مختصر نویس اور ٹائپ کار کے برابر درجہ دے کر سو۔(۱۰۰) روپے ماہوار خصوصی الاؤنس بھی دیا جائے۔

(۵)

دنیا کے ہر باوقار ملک میں حکومت کا انتظامی ڈھانچہ قومی زبان کے ذریعے تشخص حاصل کرتا ہے۔ پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاکستان کے انتظامی ڈھانچے میں شہ رگ کی حیثیت رکھتا ہے۔ عالمی اردو کانفرنس کا یہ اجلاس حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ وفاقی

پبلک سروس کمیشن میں اردو کو امتحان اور انٹرویو کا ذریعہ قرار دیا جائے۔ نیز سب امیدواروں کے لئے ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے اردو کا پرچہ شامل نصاب کیا جائے جس کے کم از کم سو (۱۰۰) نمبر ہوں۔

(۶)

مملکتِ خدا دادِ پاکستان ایک فلاحی اسلامی مملکت ہے جس میں ہر شہری کو بِلا امتیاز سہل الحصول انصاف مہیا کیا جانا چاہئے۔ عوام اسی صورت میں انصاف اور دادرسی سے مطمئن ہو سکتے ہیں جب عدالتی کارروائی قومی زبان میں ہو۔ عالمی اردو کانفرنس کا یہ اجلاس حکومت سے پُرزور مطالبہ کرتا ہے کہ پاکستان کی تمام عدالتوں میں کارروائی قومی زبان میں ہو اور عدالتی فیصلے اردو میں جاری کئے جائیں تاکہ انصاف کی روح سے پاکستان کا ہر شہری بہرہ مند ہو سکے۔

(۷)

جب تک کسی قوم کا ذریعۂ تعلیم اس کی اپنی زبان نہ ہو اس پر علم کے بنیادی تصورات واضح نہیں ہوتے اور اس کی تخلیقی صلاحتیں بیدار نہیں ہوتیں۔ غیر زبان میں تحصیلِ علم طلبہ کو یک جہتی اور قومی سوچ سے محروم رکھتی ہے۔ عالمی اردو کانفرنس کا یہ اجلاس حکومت سے پُرزور مطالبہ کرتا ہے کہ پاکستان کے تعلیمی نظام میں قومی زبان کو تعلیم کے اعلیٰ ترین درجوں تک ذریعۂ تعلیم بنایا جائے اور جامعات میں ڈگری کلاسوں تک اردو ذریعۂ تعلیم فوری طور پر نافذ کر کے پاکستان کے تمام شہریوں کو تعلیم کے مساوی حقوق اور مواقع فراہم کئے جائیں۔

(۸)

ہمارے معاشرے میں ساری تہذیبی' سماجی اور فکری خرابیاں انگریزی کو ذریعۂ تعلیم کے طور پر اختیار کرنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ انگریزی ذریعہ تعلیم سے نہ صرف معیارِ تعلیم گر رہا ہے بلکہ طلبہ میں حصول علم کا ذوق بھی ماند پڑ رہا ہے۔ انگریزی ذریعۂ تعلیم سے دو

متوازی نظامِ تعلیم اور دو طبقے پیدا ہو گئے ہیں جو تیزی سے خطرناک صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ پاکستان میں انگریزی زبان کی افادیت سے کسی باشعور فرد کو انکار نہیں۔ عالمی اردو کانفرنس کا یہ اجلاس حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ انگریزی کو بطور ایک زبان' لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھایا جائے' اس کی تدریس کا معیار بلند کیا جائے لیکن اسے ذریعہ تعلیم ہرگز نہ بنایا جائے۔

(۹)

پاکستان میں نفاذِ اردو کے تمام اداروں میں مقتدرہ قومی زبان کو اپنے دائرہ کار کے سبب مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ عالمی اردو کانفرنس کا یہ اجلاس حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ نفاذ اردو کے سلسلے میں مقتدرہ قومی زبان کو بااختیار اور وسیع تر ادارہ بنایا جائے۔ اصطلاحات' تراجم' دفتری' عدالتی اور تعلیمی امور میں مقتدرہ کی معیار بندی کو پورے ملک میں بطور نمونہ اور معیار نافذ کیا جائے۔

حکومت پنجاب سے استدعا ہے کہ وہ!

(ا) مقابلے کے ان سب امتحانات میں جو پنجاب پبلک سروس کمیشن کے دائرہ کار میں آتے ہیں' فوری طور پر قومی زبان میں امتحانات کے انعقاد کا انتظام کرے۔

(ب) جملہ سرکاری اور نیم سرکاری دفاتر میں قومی زبان کو رائج اور اختیار کرنے کا اہتمام کرے۔

(ج) تعلیمی اداروں میں قومی زبان کو ذریعہ تعلیم اور امتحان قرار دے۔

عالمی اردو کانفرنس خطوط اور تحریروں کے آئینے میں

(ا) تحریری آراء

ملتان میں پہلی عالمی اردو کانفرنس اور دوسرے عالمی مشاعرے کے منتظمین بھرپور مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے نہ صرف ایک نہایت ہی کامیاب عالمی مشاعرہ کا اہتمام کیا بلکہ اس تقریب میں پاکستان ' بھارت ' چین ' برطانیہ ' امریکہ ' ناروے ' اور دوسرے ممالک سے معروف شعراء کرام کی شرکت اس مشاعرے کی کامیابی کا منہ بولتا ثبوت بنی ہے مجھے امید ہے کہ زندہ دلانِ ملتان کے شعری ذوق کا یہ سلسلہ مزید خوشگوار روایات اور تسلسل کے ساتھ ادبی حلقوں سے دادِ ستائش حاصل کرتا رہے گا۔

(غلام حیدر وائیں وزیر اعلیٰ پنجاب

ملتان کی عالمی اردو کانفرنس تاریخی اقدام ہے

(ڈاکٹر گوپی چند نارنگ دہلی)

اردو کانفرنسیں ملک میں بھی دیکھیں اور ملک سے باہر بھی۔ان میں مندوب نمائندے اور تماشائی کی حیثیت سے شرکت بھی کی لیکن جس "اپنے پن" کا احساس ملتان کی اردو کانفرنس میں ہوا اس کا تجربہ پہلے ہمیں نہیں ہوا۔ شرکائے کانفرنس نے جس محبت اور خلوص کے ساتھ اردو سے اپنی یگانگت کا اظہار کیا اسی سے ایک امید بندھی کہ اب

لوگوں میں محبت مساوات اور انسان دوستی کا چلن عام ہوگا اور یہ اس زبان کے حوالے سے اور اس زبان کی طاقت سے عمل میں آئے گا۔

(اشفاق احمد)

عالمی اردو کانفرنس ملتان نے قومی زبان کے حوالے سے ایک ایسا مثبت کام کیا ہے جو ہمیشہ یاد رہے گا۔

(ڈاکٹر جمیل جالبی)

ملتان کی عالمی اردو کانفرنس اور مشاعرے میں شرکت کر کے دلی مسرت ہوئی دنیا کے مختلف ملکوں سے آئے ہوئے ادیبوں سے ملاقات ہوئی۔ ان کے ملکوں میں اردو کی صورتِ حال سے واقفیت ہوئی۔ اسی طرح کی عالمی کانفرنس کسی نہ کسی ایک ملک میں ضرور ہونی چاہئے تاکہ ایک طرف مختلف ملکوں کے ادیبوں کی حوصلہ افزائی ہو اور دوسری طرف ہم ایک دوسرے کے مسائل سے واقف ہوسکیں۔ میں ایسی شاندار اور کامیاب عالمی کانفرنس کے لئے منتظمین حضرات کو دلی مبارکباد دیتا ہوں۔

(ڈاکٹر خلیق انجم (دہلی))

اردو عالمی کانفرنس کا انعقاد ایسا خوش آئند اقدام ہے جس سے اردو کے فروغ اور نفاذ کا عمل بجا طور پر تیز ہوجائے گا۔

(ڈاکٹر وحید قریشی)

ملتان جیسے تاریخی شہر میں عالمی اردو کانفرنس کا انعقاد ایک نیک فال ہے مجھے امید ہے کہ اس کانفرنس سے اردو کی ترقی و ترویج کے لئے نئے راستے سامنے آئیں گے۔

(اطہر نبی لکھنؤ)

عالمی اردو کانفرنس منعقد کرنا اردو کو فروغ دینے کے لئے بہت فائدہ مند ثابت ہوگا۔

(لیوان وے شوائے۔ چین)

مدینتہ الاولیائؒ ملتان میں عالمی اردو کانفرنس کا انعقاد اس وقت ہو رہا ہے جب ملک میں لسانی تعصبات کے شعلے ہوا پکڑ رہے ہیں۔ لہٰذا یہ کانفرنس اہلِ پاکستان کو اس حقیقت کا احساس کرا سکتی ہے کہ پاکستانی عوام میں اگر اخوت، محبت اور خلوص کی کوئی بات ہو سکتی ہے تو وہ صرف اردو ہی سے ہے۔

(ڈاکٹر سلیم اختر)

عالمی اردو کانفرنس ہر اعتبار سے کامیاب اور مستقبل میں منعقد ہونے والے اردو کے عظیم اجتماعات کے لئے سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے یہ کانفرنس دنیا میں ہونے والے اردو کے اجتماعات کے لئے چراغ منزل ثابت ہوں گے۔

(دلکش آفریدی مراد آباد بھارت)

ملتان میں جو پہلی عالمی اردو کانفرنس ہو رہی ہے بڑی اہمیت کی حامل ہے مجھے بے انتہا خوشی ہوئی شرکت کر کے۔ اس طرح کی کانفرنس کا فائدہ یہ ہے کہ اردو والوں کے اندر جو باہمی رشتہ ہے وہ استوار ہوتا ہے اور اردو کے عالم گیر مسائل پر گفتگو کرنے کا موقع ملتا ہے جہاں تک آج کے مقالات پڑھے گئے اور مسائل پر گفتگو ہوئی اس سے اندازہ ہوا کہ جو اردو کے مسائل پاکستان میں ہیں تقریباً وہی بھارت میں ہیں۔

(کیف عظیم آبادی پٹنہ بھارت)

شہرِ اولیاء میں عالمی اردو کانفرنس کا انعقاد ایک تاریخی واقعہ ہے اور اس کے لئے مجلسِ تقریبات ملی ملتان کے عہدہ داران خاص طور پر ڈپٹی کمشنر جناب شوکت علی شاہ جو خود بھی ایک ادیب ہیں اور محقق و نقاد جناب ڈاکٹر طاہر تونسوی مبارکباد کے مستحق ہیں جنہوں نے عالمی سطح کی اس کانفرنس کے انعقاد اور عالمی مشاعرہ کے لئے دنیا بھر کے شعراء

اور دانشور اور محقق مدعو کئے ہیں۔ ملتان شہر میں اتنا بڑا ادبی واقعہ اس بات کی دلیل ہے کہ اردو زبان اور اردو ادب کی ترقی و ترویج کے راستے دنیا کی کوئی طاقت بند نہیں کر سکتی

(ایوب خاور)

مجلسِ تقریباتِ علی نے عالمی اردو کانفرنس کا انعقاد کر کے ایک کارنامہ انجام دیا ہے اردو کو ہر صورت میں پاکستان کی سرکاری زبان ہونا چاہئے کہ اس صورت میں ایک زور آور گروہ کا زور توڑا جا سکتا ہے۔

(عطاء الحق قاسمی)

اس کامیاب کانفرنس میں سبھی طے شدہ واضح اور متنازع مسائل پر گفتگو کی گئی اور ایک دوسرے کو یاد دلایا گیا کہ اردو کے بارے میں کئی مثبت فیصلوں پر عمل درآمد میں تاخیر باعث فکر ہے بات ہو گی تو پھیلے گی۔ کہی جائے گی تو سنی بھی جائے گی اور اس کا رد عمل بھی ہو گا۔ ہم اس کانفرنس سے بہت اچھے نتائج کی توقع رکھتے ہیں۔

(ڈاکٹر عرش صدیقی)

عالمی اردو کانفرنس کا انعقاد ملتان کا اعزاز تو ہے ہی' لیکن پاکستان اور اہل پاکستان کے لئے بھی یہ ایک سعادت ہے ہمارا قومی تشخص اسی زبان سے منسلک ہے یہ ایک سنگ میل ہے جو مستقبل میں ہماری پاکستانی زبانوں اور ثقافت کے استحکام و ترویج کے راستے سے ہماری قومی پہچان کی منزل تک پہنچنے میں معاون ثابت ہو گی۔ اس کانفرنس کے منتظمین خصوصاً" شوکت علی شاہ اور ڈاکٹر طاہر تونسوی تو بہرحال مبارک باد کے مستحق ہیں لیکن میں تو ایک ایک شریک محفل کو قابل مبارکباد سمجھتا ہوں۔

(اعزاز احمد آذر)

اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو دنیا کی بہت بڑی زبان ہے اور اپنے اندر تمام علوم و

فنون کے شائقین کے تمام پہلو جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے مگر اردو بولنے والے احساس کمتری کا شکار ہیں جس کی بنا پر ہم اردو کو وہ موقع نہیں دیتے جس کی وہ مستحق ہے۔ یہ عالمی کانفرنس ایک نہایت کامیاب قدم ہے اس منزل کی طرف جس کا خواب ہمارے بزرگوں نے دیکھا ہے خدا کرے کہ اس طرح کی کانفرنسیں ہوتی رہیں تب تک ہوتی رہیں جب تک ہم لوگ انگریزی کے سحر سے نہیں نکل جاتے۔

(اعجاز احمد اعجاز برطانیہ)

ملتان میں منعقد ہونے والی عالمی اردو کانفرنس میں شریک ہو کر دلی مسرت ہوئی مقالوں کے اجلاس بہت مفید رہے اس عالمی اردو کانفرنس کے عمدہ اور کامیاب انعقاد پر میں بھی تمام منتظمین کو یہی خراج تحسین پیش کرتا ہوں کہ ان سادہ سے لفظوں میں بہت سے بھاری بھرکم مضامین سے زیادہ خلوص اور وزن ہے۔

(امجد اسلام امجد)

عالمی اردو کانفرنس (ملتان) میں شرکت کا موقع ملا اردو ادب کے فروغ کے لئے اہل ملتان کی خدمات پہلے بھی کسی سے کم نہ تھیں اور اب بھی یہاں کے اہل علم حضرات اس جہاد میں پیش پیش ہیں اللہ کرے یہ جذبہ قائم و دائم رہے۔

(ضیاء الحق قاسمی)

عالمی اردو کانفرنس اور مشاعرہ ایک نثر نگار کے خلوص و عمل کی شاعری ہے اور اس نثر نگار کا نام ہے سید شوکت علی شاہ ـــــ یہ معتبر نام ملتان کی ادبی ثقافتی تاریخ کا حصہ تو بن ہی چکا لیکن میرا خیال کہ ان کے ہاتھوں لگایا ہوا یہ درخت آگے چل کر ایسے ایسے لذیذ پھل پیدا کرے گا جو اہل ملتان ہی نہیں پورے پاکستان کو اپنے باغبان کی یاد دلاتے رہیں گے۔

(قتیل شفائی)

ملتان کی عالمی اردو کانفرنس اور عالمی مشاعرے میں شرکت کا موقع نصیب ہوا۔ دلی مسرت ہوئی۔ کانفرنس اور مشاعرہ دونوں بے حد کامیاب رہے جملہ اراکین قابل صد ستائش ہیں۔ میری دلی دعائیں ان حضرات کے ساتھ ہیں۔

(خمار بارہ بنکوی۔ بھارت)

عالمی کانفرنس اور مشاعرے میں حاضر ہو کر یہ احساس ہوا کہ "ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں" دنیا کے مختلف گوشوں سے یوں اہل قلم کو جمع کرنا اور پورے خلوص کے ساتھ پذیرائی کرنا واقعی ناقابل فراموش ہے۔ منتظمین کی انتظامی صلاحیتوں کا قائل ہونا پڑتا ہے اور ان اصحاب کی بھی داد دینا پڑتی ہے جس کے صدقہ میں فکرو نظر کی ضیافت کا وہ انتظام ہوا جو ملتان کی ادبی تاریخ کا حصہ بن کر رہے گا۔

(پروفیسر وسیم بریلوی بھارت)

اردو شعرو ادب کی سرحدیں کس قدر وسیع ہو گئی ہیں اس کا خاطر خواہ اندازہ ملتان کی عالمی اردو کانفرنس اور مشاعرے سے ہوا۔ جس میں دنیا کے مختلف ممالک کے شعراء ادباء اور دانشور شریک ہوئے۔ ملتان شہر میں عالمی اردو کانفرنس اور مشاعرے کا انعقاد ایک تاریخی اقدام ہے۔

(اعجاز پاپولر میرٹھی۔ بھارت)

عالمی اردو کانفرنس اور عالمی مشاعرہ ایک خواب کی تعبیر کی صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں ہم قیام پاکستان کے بعد جس بے عملی کا شکار ہوئے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم نے اپنی زبان کی تشکیل میں غیر ذمہ دارانہ رویہ اختیار کیا اور اس تماشش کروار نے ہمیں فکری اعتبار سے کئی خانوں میں تقسیم کر کے رکھ دیا اور ہم نے علاقائی 'لسانی' بے بنیاد سماجی اور بے نتیجہ سیاسی تحریکوں کے ذریعے خود کو تماکر لیا اس سے ایک طرف تو ہم اپنے قومی

کردار سے محروم ہوتے چلے گئے اور دوسری طرف تعصّب نے ہم سے ہماری پہچان چھین لی ملتان میں عالمی اردو کانفرنس کی گونج پورے برصغیر میں سنی جائے گی اور اس سے ہم اخوت اور محبت کی زبان کی ہمہ گیریت کو محسوس کر سکیں گے۔ سید شوکت علی شاہ ڈپٹی کمشنر ملتان اور طاہر تونسوی قابل احترام ہیں کہ انہوں نے اس کانفرنس سے اردو کے نفاذ کے لئے کم از کم ایک راستہ تو بنا دیا ہے۔

(نوشی گیلانی)

ملتان میں آج ۲۳ اپریل ۱۹۹۴ء کو منعقدہ عالمی اردو کانفرنس بے حد کامیاب رہی اس کانفرنس میں ملک کے گوشے گوشے سے نامور شخصیات نے حصہ لیا۔ امید کرتی ہوں کہ یہ ادبی سلسلہ قائم رہے گا۔

(تاجور سلطانہ الہ آباد بھارت)

عالمی اردو کانفرنس اور عالمی مشاعرہ کا انعقاد یقیناً" ایک خوش آئند اقدام ہے اس طرح کی کانفرنسوں کو منعقد کرنا قطعی آسان سی بات نہیں اور نہ اختیار و بے اختیاری کا معاملہ ہے یہ تو ایک حمیت اور جذبۂ ملّی کی صداقت کی بات ہے یہ تو یگانگت اخوت اور محبت کی بات ہے یہ تو اپنی مٹی کی خوشبو اور اپنی شناخت کی بات ہے جس کی بنیاد صرف اردو ہی فراہم کر سکتی ہے اور اگر اردو کو ملک کے ہر ضلع میں سید شوکت علی شاہ اور ڈاکٹر طاہر تونسوی میسّر آجائیں تو جو کام سینتالیس برسوں میں نہ ہو سکا وہ کام سینتالیس ہفتوں میں ممکن ہو جائے گا۔ میں اس کانفرنس کے اثرات کے تسلسل کے لئے دعا کرتا ہوں۔

(منور جمیل قریشی)

کانفرنس اور مشاعرہ اپنے ادبی معیار اور تہذیبی وقار کے باعث سب کی توجہ کا مرکز رہا وہ سبھی لوگ قابل مبارکباد ہیں جنہوں نے اس تقریب کا اہتمام کیا اور ایسی بزم سجائی

جو مدتوں تک یاد رہے گی۔

(ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد لکھنؤ)

قومی زبان کی محبت میں جوش و جذبے سے اتنا "بھرواں" میلہ چراغاں قیامِ پاکستان کے بعد بعد ملتان ہی میں دیکھا۔ مدت کے بعد منزل کی طرف بڑھتے ہوئے خلوص کی چاپ سنائی دی۔

(سید ضمیر جعفری)

ملتان کی عالمی اردو کانفرنس اپنے معیار اور تنوّع کے اعتبار سے برسوں یاد رہے گی۔ شوکت علی شاہ کی کاوشیں اور ان کے رفقاء کی محنت ہر لحاظ سے قابلِ داد ہے۔ امید ہے آئندہ بھی ایسے کارنامے سرانجام دیتے رہیں گے۔

(جمشید مسرور ناروے)

ملتان کی عالمی اردو کانفرنس ۱۹۹۲ء کی ایک پروقار اور شاندار ادبی تقریب تھی جس میں اہلِ فکر و دانش کی ایک بڑی تعداد نے دنیا کے مختلف علاقوں سے آکر اسے کامیاب و کامران بنایا۔ اردو زبان کو اس کی حیثیت اور منصب عطا کرنے کے لئے جو کوششیں کی جا رہی ہیں۔ وہ بڑی مثبت ہیں مجھے امید ہے کہ ملّت کی اس زبان کو جلد از جلد دفاتر میں سرکاری حیثیت دے کر عوام کے دلی جذبات کی ترجمانی کی جائے گی۔ میں دعا گو ہوں کہ اہلِ ملتان کی یہ ساری کاوشیں کامرانیوں سے ہمکنار ہوں۔

(محسن احسان)

عالمی اردو کانفرنس ملتان کہ جو یہاں کی انتظامیہ کی تحریک اور تنظیم میں منعقد کی گئی ہے ایک اہم اقدام ہے کاش ہمارے ملک کی بالائی انتظامیہ بھی ملک میں اردو کے نفاذ کی ضرورت محسوس کر سکے۔ اس کے علاوہ دیگر شعبہ ہائے زندگی سے متعلق لوگ بھی اس

ذمہ داری کو محسوس کر سکیں۔ کانفرنس ماشاء اللہ بہتر ہے میں اس کے نتائج کے لئے دعا گو ہوں۔

(مرتضیٰ برلاس)

عالمی اردو کانفرنس جب بھارت میں منعقد ہوئی تو ساری کانفرنس کے دوران پاکستانی اہلِ قلم کے دلوں میں ایک احساسِ شرمندگی بھی شامل رہا۔ ہماری قومی زبان اور ہم ہی ایسی کانفرنسوں سے محروم! ملتان کے اہلِ ادب نے آج اس احساس سے نجات دلادی۔ ہر چند کہ یہ نقشِ اوّل ہے مگر آئندہ اس سے بہتر کانفرنسوں کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔ اس کانفرنس میں جو مقالات سنے ہیں وہ رسمی کم اور مسائلی زیادہ ہیں ان مسائل پر ہم پاکستانیوں کو سنجیدگی سے سوچنا چاہئے بہرحال اہلِ ملتان کو اولیت کا شرف مبارک' خدا کرے پاکستان میں اردو کے بڑے مراکز کراچی لاہور اور اسلام آباد میں بھی ایسی کانفرنسیں منعقد ہوں۔

(حمایت علی شاعر)

ملتان میں منعقد ہونے والی عالمی اردو کانفرنس کا انتہائی اہم پہلو یہ ہے کہ اردو کو دنیا کے حوالے سے متعارف کرایا گیا ہے۔ فکر انگیز باتیں سننے میں آئیں اور نہایت عمدہ تجاویز سامنے آئیں۔ مختلف ممالک کے ادیبوں اور شاعروں سے مل کر بہت کچھ حاصل ہوا۔ سارے انتظامات بہت عمدہ تھے میری طرف سے اس کامیاب کانفرنس پر اہل ملتان کو دلی مبارک باد۔

(انور مسعود)

ب) خطوط

عالمی اردو کانفرنس کے انعقاد سے پہلے اور انعقاد کے بعد اہل علم' دانشوروں' شاعروں اور ادیبوں کے جو خطوط موصول ہوئے ان میں سے چند یہاں شامل کئے جا رہے ہیں اس لئے کہ ان سے عالمی اردو کانفرنس کی اہمیت و افادیت پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔

7- اپریل 1992ء

محترمی ڈاکٹر صاحب

السلام علیکم!

عالمی اردو کانفرنس کی طرف سے ایک گشتی مراسلہ موصول ہوا تھا جس میں میرے نام ایک مقالہ "ڈالا" گیا ہے اور مجھے اطلاع دی گئی ہے کہ میں اپنے مضمون کی دو کاپیاں لے کر وقت مقررہ پر حاضر ہو جاؤں میں تعمیل ارشاد کے لئے حاضر ہوں لیکن۔
اگر آپ مجھے یہ اجازت لے دیں کہ میں اپنی معروضات زبانی عرض کر دوں تو میرے لئے زیادہ آسان ہو گا۔ اس واردات کا چونکہ میں اکیلا "صاحب حال" ہوں اس لئے میرے پاس ڈھیر سا گفتنی مواد موجود ہے۔
میں حسب فرمائش مضمون لکھنے کی کوشش بھی کروں گا لیکن میرے جیسا کثیر المقاصد انسان ایسا باولا ہوتا ہے کہ عین وقت پر پہنچ کر وعدہ پورا نہیں کر پاتا۔ اس لئے میں رعایت کا طلبگار ہوں۔
عید کے روز آپ کا فون آیا تھا لیکن میں عزیزوں دوستوں کو سلام کرنے کی غرض سے باہر نکلا ہوا تھا اس لئے آپ سے بات نہ ہو سکی جس کا مجھے آج تک افسوس ہے۔
گشتی مراسلے میں چونکہ آپ کو بھی جواب بھجوایا جا سکتا ہے اس لئے میں آپ ہی سے مخاطب ہوں کہ آپ میری برادری کے ہیں اور مجھ سے قریب تر ہیں۔ سید شوکت علی صاحب کا ان کے دونوں رتبوں کی وجہ سے احترام واجب ہے لیکن ابھی ان کے ساتھ محبت کا تعلق پیدا کرنا باقی ہے۔ ملتان کے ایک ہی چکر میں یہ مرحلہ بھی انشاء اللہ طے ہو جائے گا کہ ہمارا مزاج بھی عقیدت اور محبت کے درمیان شنشنے کرتا رہتا ہے۔

میں انشاء اللہ کل آپ کو فون بھی کروں گا۔

آپ کے لئے بہت ساری دعائیں۔

مکرر آنکہ: ابھی ابھی آپ کا فون مل گیا ہے۔ تحریر کردہ مضمون کی اہمیت سمجھ گیا ہوں انشاء اللہ لکھوں گا۔

والسلام

دعاگو

(اشفاق احمد)

15-4-92

محبِّ عزیز و مکرم۔ سلامِ مسنون

شرمندہ بھی ہوں اور بے بس بھی 23 کی کانفرنس میں میری شمولیت اس صورت میں ناممکن ہو گئی ہے کہ اس روز ایک تو میری مرحومہ اہلیہ کی تیسری جمعرات ہے اور دوم میری ایک سگی بھانجی (عزیزی ظہیر بابر کی بہن) کا چہلم ہے اور یہ دو موقعے ایسے ہیں کہ میں کسی بھی بہانے سے کسی بھی صورت میں حاضر نہیں ہو سکتا۔ آپ سے اور شاہ صاحب سے بے حد عاجزی اور بے بسی کے ساتھ معذرت خواہ ہوں۔

آپ کا

(احمد ندیم قاسمی)

23-4-92

مکرمی جناب--------------سلام مسنون

ملتان کی پہلی عالمی اردو کانفرنس اور عالمی مشاعرہ کی تقریبیں بلاشبہ اپنے معیار علمی و انتظامی کے سبب شرکاء کے لئے ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ پاکستان اور بیرون ملک سے آئے ہوئے

تمام شعراء اور دیگر صاحبانِ دانش و بینش نے تہذیبی اور فکری موضوعات پر اظہار خیال فرمایا وہ لائق تحسین و آفرین ہے۔ ایک خاص بات دیکھنے میں آئی کہ نئی نسل کے نوجوان بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ یقین کیا جانا چاہیے کہ قومی مسئلے کے حوالے سے انہوں نے جو فکری گفتگو سنی وہ یقیناً ان کے لئے مشعلِ راہ بنے گی۔

سید شوکت شاہ اور ان کے رفقائے کار اور خصوصاً ڈاکٹر طاہر تونسوی نے جس لگن، محنت اور خلوص سے اس کانفرنس کو کامیاب کیا ہے وہ ہم سب پاکستانی اہلِ قلم کے لئے افتخار کی بات ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ تہذیبی روایت اسی طرح مستقبل میں بھی جاری رہے گی۔

اس قد و قامت کے صاحبانِ فکر و نظر کو جمع کر لینا اور ایک سنجیدہ علمی موضوع کے حوالے سے بڑا اجتماع چونکہ ایک بڑا کارنامہ ہے۔ اس پر حُسنِ انتظام کے لئے منتظمین کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

افتخار عارف

قبلہ شاہ صاحب

تسلیم!

ملتان میں عالمی اردو کانفرنس کے کامیاب انعقاد پر میری طرف سے دلی مبارک قبول کیجئے مجھے اندازہ ہے کہ ایسے کاموں میں کتنی محنت اور منصوبہ بندی کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر ان کا اجر کیا ملتا ہے کہ ہر وہ شخص جو نہ بلایا جائے، اظہارِ بُغض کے نتیجہ میں کیئے کرائے پر پانی پھیر دیتا ہے جیسا کہ میرزا ادیب نے 27 اپریل کے "نوائے وقت" میں جلے دل کے پھپھولے پھوڑے ہیں یہ کالم پڑھ کر بہت افسوس ہوا کہ جو شخص نقاد نہیں شاعر نہیں وہ کیسے بلایا جا سکتا تھا؟ سنا ہے اہلِ ملتان نے بھی حق مخالفت ادا کر دیا ____ ان حالات میں آپ اور ڈاکٹر طاہر تونسوی کے لئے بڑے کریڈٹ کی بات ہے کہ تندیٔ بادِ مخالف کے باوجود ایسی کامیاب کانفرنس اور مشاعرہ کا اہتمام کر دیا۔

میں 26 تاریخ کو الوداعی ملاقات کے لئے حاضر ہوا تھا مگر آپ کی اس روز 4 بجے میٹنگ تھی لہٰذا ملاقات نہ ہو سکی۔

مزید ایسی ہی کامیاب کانفرنس کی دعا کے ساتھ

نیاز مند

ڈاکٹر سلیم اختر

28-4-92

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

27-4-92

محترم و مکرم جناب سید شوکت علی شاہ صاحب

ڈپٹی کمشنر ملتان

السلام علیکم!

عالمی اردو کانفرنس اور عالمی مشاعرے کی شاندار کامیابی پر میں آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

اردو کے فروغ، ترقی اور ترویج کے سلسلے میں آپ نے جس اعتماد، لگن اور محنت سے ملتان جیسی ثقافتی فضا میں کام کیا ہے وہ دیر تک یاد رکھا جائے گا۔ یہ کانفرنس ایک طرف قومی زبان اردو کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہے اور دوسری جانب اس کے انعقاد سے ملک اور بیرون ملک میں زبانِ اردو سے ہماری جذباتی وابستگی کا پتہ چلے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ جو کام ماضی میں تمام تر وسائل کی موجودگی کے باوجود نہیں ہو سکا آپ کی بصیرت اور پیش قدمی نے کر دکھایا ہے۔

ڈاکٹر طاہر تونسوی ایک متحرک، ہمہ گیر اور علمی شخصیت کے مالک ہیں ناانصافی ہو گی اگر میں کانفرنس اور مشاعرے کی کامیابی پر ان کی مساعی کا اعتراف نہ کروں۔ ڈاکٹر موصوف نے نہایت خلوص اور محنت کے ساتھ اس کے لئے کام کیا ہے۔

بارِ دگر مبارکباد

والسلام

پروفیسر انور جمال
گورنمنٹ کالج سول لائنز ملتان

16-4-92

محترم جناب ڈاکٹر طاہر تونسوی صاحب!

السلام علیکم ورحمتہ اللہ:

ملتان میں عالمی مشاعرے اور اردو کانفرنس کے انعقاد کی خبریں پڑھ پڑھ کر ہم اساتذہ و طلبائے اردو بہت للچا رہے تھے اور سید شوکت علی صاحب اور آپ کی کاوشوں کی تعریف کر رہے تھے میں آپ سے رابطہ کرنے کو تھا کہ آپ کا مکتوب نوید مسرت بن کر پہنچا۔ یاد فرمانے کا بہت بہت شکریہ۔ انشاء اللہ ہم کالج بس میں پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ تمام اساتذہ' طالبات اور طلباء آئیں گے۔ فون پر بھی رابطہ کروں گا۔

والسلام

پروفیسر انوار الحکیم عثمانی

صدر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج ڈیرہ غازی خان

4-جون 1992ء

عزیز گرامی قدر'

السلام علیکم!

کل آپ کا فرستادہ کانفرنس والا فوٹو ملا' اور آج یہ خط اس حسب خواہش ملتانی صاحب کا اجازت نامہ اس مراسلے میں روانہ کر رہا ہوں' مہربانی فرما کر انھیں پہنچا دیجیے گا۔

آپ کی کانفرنس کی دھوم لاہور میں زیادہ رہی کہ جو لوگ اس میں شریک نہ ہو سکے اب تک کف افسوس مل رہے ہیں۔ لیکن کانفرنس کی اس دھوم کو "دھام" میں بدلنے کا سہرا چیف منسٹر کے سر پر ہے کہ وہ جہاں بھی اردو کا ذکر آتا ہے اس کانفرنس کا آنکھوں دیکھا حال ضرور

بیان کرتے ہیں۔

کچھ کچھ کام ہوتے رہنا چاہئے' لیکن فقیری انگ میں۔ ولایت کے 001.فی صد لوگ اسی طرح سے کرتے ہیں باقی کے بلّے گُلّے' ناچ گانے اور مستی بدمستی میں وقت گزارتے ہیں۔ یہ 001. فیصد لوگ اپنی دھن میں مست اپنا اپنا کام کرتے رہتے ہیں اور بدلتی ہوئی حکومتوں اور بڑھتے ہوئے گریڈوں سے ناآشنا رہتے ہیں۔ یہ عمل وہ کس طرح سے کرلیتے ہیں اس کا راز مجھے اب تک معلوم نہیں ہو سکا' شاید آپ اس پر کچھ روشنی ڈال سکیں کہ مدینتہ الاولیاء میں رہتے ہیں۔

دعاگو

(اشفاق احمد)

27 اپریل 1992ء

طاہر تونسوی صاحب! السلام علیکم!

میں خیریت سے دہلی پہنچ گیا۔ آپ نے جس خلوص' محبت اور گرم جوشی کے ساتھ میری پذیرائی کی اس کے لئے تہہ دل سے شکرگزار ہوں۔

کانفرنس کی روداد تیار کر کے مجھے بھیج دیجئے۔ تاکہ میں اسے "ہماری زبان" میں نمایاں کر کے شائع کر سکوں۔

شوکت علی شاہ صاحب کا میری طرف سے شکریہ ادا کر دیجئے اور انھیں میرا سلام کہہ دیجئے۔ ایسے کامیاب اور شاندار سیمینار اور مشاعرے کے انعقاد پر دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔

خدا کرے آپ ہمیشہ خوش و خرم اور تندرست رہیں۔

نیاز کیش

(خلیق انجم)
جنرل سیکرٹری
انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی

22/5/92

محبّ مکرّم ڈاکٹر طاہر تونسوی صاحب!

آپ نے جس سلیقے سے کانفرنس منعقد کی اور اس کے لئے شب و روز جو سعی و جستجو کی اور اسے ہر اعتبار سے جس طرح پُر وقار رکھا اور حد درجہ کامیاب بنایا اس کے لئے آپ نہ صرف ہم سب کے شکریے کے مستحق ہیں بلکہ لائق صد ہزار مبارکباد بھی ہیں۔ خدا آپ کو اپنے ارادوں میں ہمیشہ کامیاب رکھے

آپ نے جو خطوط بھجوائے تھے وہ ڈاکٹر نیر مسعود اور خلیق انجم کو فوراً بھجوا دیے گئے تھے۔

تقریر کا مسودہ بھجوا رہا ہوں، لیکن وہاں تو صورت دوسری تھی اس لئے موقع کے نکات پر تقریر، دوسری ہندی۔ آپ چاہیں تو اس کو بھی شائع کریں مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن اگر آپ کے یہاں Tape ہوا ہو اور آپ کے طلبا میں سے کوئی صاحب TRANSCRIBE کر دیں تو مسودہ مجھ کو بھجوا دیں نظرِ ثانی کر کے بھیج دوں گا۔ گویا اصل تقریر تو آپ کے پاس ہے۔ خدا نے مجھے یہی دولت دی ہے۔ اسی وقت نکات مستحضر ہو جاتے ہیں اور میں عرض کر دیتا ہوں اپنی خیریت اور رسید سے نوازیں۔ گھر میں ہم دونوں کا سلام کہیں امی جان کو آداب

والسلام
مخلص
گوپی چند (نارنگ)

Dated:- 11.05.1992.

محترمی جناب اطاہر تونسوی صاحب:

السلام علیکم!

امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔

آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا۔ مجھے بے حد قلق ہے کہ عالمی اردو کانفرنس میں ہزار کوشش کے باوجود شرکت سے محروم رہا۔ حالانکہ میرا بہت جی چاہتا تھا کہ ایسے اہم موضوع پر از خود دانشوروں کے ساتھ گفتگو کروں۔ میں نے معذرت کے خط کے ساتھ اپنی معروضات تحریری شکل میں آپ کو بھجوائی بھی تھیں۔ بہرحال آئندہ کبھی ایسا موقع میسر آیا تو ضرور حاضری دوں گا۔

آپ کا مخلص

(پروفیسر پریشان خٹک)

پاکستان نیشنل سینٹر

الفلاح بلڈنگ۔ لاہور

محترمی شاہ صاحب!

السلام علیکم! عالمی اردو کانفرنس اور عالمی مشاعرہ کا انعقاد یقیناً ایک بہت بڑا کارنامہ ہے اور آپ یقیناً مبارک باد کے حقدار ہیں۔ لیکن ہر دو کی کامیابی اور ان مراحل سے گذر کر کامیابی حاصل کرنا جس کا ذکر آپ نے بھی (دکھے دل کے ساتھ) کیا اور دوستوں سے بھی تفصیلات سنیں' اس سے بھی بڑا معرکہ ہے جو کہیں زیادہ مبارکباد کا مستحق ہے۔ یہ آپ ہی کا حصہ ہے

یہ مرتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

ہمارے ہاں اپنے سے زیادہ دراز قد یا خوبصورت شخص کو دیکھ کر لوگ حسد کے گھاٹ اتر جاتے ہیں اور اپنے قد کو بڑھانے یا خوبصورتی پیدا کرنے کی بجائے حسد کا کلھاڑا چلا کر اس شخص کو چھوٹا کرنے یا حسد کا تیزاب پھینک کر بد صورت کرنے کا "مشن" اختیار کر لیتے ہیں ــــ یہ یقیناً وہی لوگ ہیں جن کی بصیرت' بصارت پر تالا ڈال دینے کی بشارت اللہ تعالیٰ نے دے رکھی ہے..... ہم ان کے حق میں دعا ہی کر سکتے ہیں......

ایک نیک مشن کے ضمن میں کسی انسان کا اخلاص اور اس کی قلبی سچائی اسے کس قدر حوصلہ مند بنا دیتی ہے اس کی مثال آپ کا "خیر مقدمی خطاب" تھا جس میں آپ نے (سرکاری طور پر) اپنے چیف باس کو بھی یاد دلا دیا کہ یہ وزارتیں اور چیف منسٹری آنی جانی شے ہے..... وغیرہ وغیرہ آپ کے وہ جملے اور ان کی ادائیگی کے وقت آپ کے چہرے پر جو عزم اور اعتماد نمایاں تھا اب بھی یاد آتا ہے تو ایک عجیب طرح کا احساس طمانیت ہوتا ہے۔

؎ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

بہر حال آپ نے ملتان کی تاریخ میں بالخصوص اور ادب میں بالعموم ایک نیا باب رقم کیا ہے اور اصولی بات یہ ہے کہ اگر ہم کسی غلط یا ناپسندیدہ کام پر ناپسندیدگی اور ناراضگی کا اظہار کرنے کا حق رکھتے ہیں تو میرا خیال ہے ایسے تاریخی کارنامہ پر تحسین اور مبارکباد فرض بن جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کے شوقِ فراواں کی نگہبانی کرے (آمین)

والسلام

آپ کا

اعزاز احمد آذر

14-5-92

دہلی 12 اپریل 1992ء

محب گرامی قدر ڈاکٹر طاہر تونسوی صاحب' آداب

آپ کا اور سید شوکت علی شاہ صاحب کا گرامی نامہ' دونوں' تین روز قبل دہلی روانہ

ہونے سے چند لمحے قبل جموں میں ملے۔ تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ میں اس وقت مسلسل سفر میں ہوں۔ یہاں "جوش ملیح آبادی انٹرنیشنل سیمینار" میں اپنا مقالہ پیش کرنے کے بعد علی گڑھ کا سفر ہے اور پھر رانچی کا۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے لیکچر کی دعوت ہے اور رانچی سے مشاعرے کی۔ پھر جموں پہنچوں گا۔ صرف چند لمحوں کے لئے۔ کیونکہ یہاں پاسپورٹ آفس نے بتایا ہے کہ میرا نیا پاسپورٹ جو اسی ہفتے بنا ہے۔ جموں بھیج دیا گیا ہے۔ جموں میں میرے پاس صرف اتنا ہی وقت ہو گا کہ پاسپورٹ اٹھا کے جیب میں رکھوں اور پہلی فلائٹ سے جو ایک گھنٹے کے بعد روانہ ہو گی دہلی پہنچوں تاکہ ویزا بنوا کے آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں ____ آپ نے اتنا شارٹ نوٹس دیا ہے کہ اب گھر جا کر مقالہ لکھنے اور اس کی دو نقول تیار کرنے کا وقت ہی نہیں ہے۔ اس وقت تو دل میں صرف ملتان پہنچنے اور آپ سے ملاقات کرنے کی تڑپ ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ اس وقت ڈاکٹر گوپی چند نارنگ رفیق سفر ہیں ورنہ میرے لئے تنہا تو اس طرح بھاگم بھاگ کا سفر شاید ممکن ہی نہ ہو سکے۔

باقی باتیں ملاقات پر۔ خدا وہ دن کرے جب اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی!
امید کہ آپ ہر طرح خیریت سے ہوں گے

سید شوکت علی شاہ صاحب کی خدمت میں آداب

نیاز مند
جگن ناتھ آزاد

تاریخ: 13-اپریل 1992ء

محترمی ڈاکٹر طاہر تونسوی صاحب السلام علیکم

گرامی نامہ ملا جس کے لئے شکر گزار ہوں۔ ابھی کل ہی سید شوکت علی شاہ صاحب کو میں نے اطلاع دی ہے کہ میں انشاء اللہ کانفرنس میں شریک ہوں گا اور مقالہ بھی پیش کروں گا۔ آنے سے پہلے میں آپ کو فون پر اطلاع کر دوں گا۔ میں اس کانفرنس کی کامیابی کے لئے دعا گو ہوں۔ خدا آپ سب کو صحت مند و سلامت رکھے۔

امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔

آپ کا مخلص
(ڈاکٹر جمیل جالبی)
صدر نشین مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد

ملتان کی عالمی اردو کانفرنس اور مشاعرے میں شرکت کر کے دلی خوشی ہوئی۔ اس کانفرنس کے انعقاد سے ملتان نے اردو زبان اور اس کے عالمی نقشے میں اپنے لئے ایک مقام بنالیا ہے۔ کانفرنس میں اردو کی عالمی صورت حال پر جو روشنی ڈالی گئی اس سے میری معلومات میں بہت اضافہ ہوا۔ میری تمنا ہے کہ ہر سال ہندوستان اور پاکستان میں اس طرح کی ایک کانفرنس ضرور منعقد ہونی چاہئے تاکہ اردو کے مسائل پر تبادلہ خیال ہو سکے۔ اس کامیاب اور شاندار کانفرنس اور مشاعرے کے انعقاد کے لئے میں منتظمین حضرات کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

خلیق انجم
23-4-92

عالمی اردو کانفرنس اور عالمی مشاعرے میں شرکت کرتے ہوئے مجھے انتہائی مسرت ہو رہی ہے۔ ملتان کا اولیاء اللہ کی سرزمین اور دنیا کے نہ صرف قدیم ترین شہروں میں شمار کیا جاتا ہے بلکہ اپنے ثقافتی اور تہذیبی ورثے کی وجہ سے ایک تاریخ ساز شہر بھی تسلیم کیا جاتا ہے ایسے شہر میں عالمی اردو کانفرنس اور مشاعرہ کا انعقاد کیا جانا ایک نیک فال ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ نہ صرف بھارت اور پاکستان کے ممتاز ادیب و شاعر اس تقریب میں شرکت کر رہے ہیں بلکہ دوسرے ممالک سے بھی اہل قلم شریک ہو رہے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ یہ کانفرنس اُردو زبان کی ترقی و ترویج کا پیش خیمہ ثابت ہو گی۔ مشاعرے بھی ہماری تہذیبی روایت بن چکے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ مشاعرے اردو زبان کو خواص کی محفلوں سے نکال کر عوام تک پہنچانے میں ایک اہم رول ادا کر رہے ہیں

اطہر نبی

maablib.org

امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔

آپ کا مخلص

(ڈاکٹر جمیل جالبی)

صدر نشین مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد

ملتان کی عالمی اردو کانفرنس اور مشاعرے میں شرکت کر کے دلی خوشی ہوئی۔ اس کانفرنس کے انعقاد سے ملتان نے اردو زبان اور اس کے عالمی نقشے میں اپنے لئے ایک مقام بنالیا ہے۔ کانفرنس میں اردو کی عالمی صورت حال پر جو روشنی ڈالی گئی اس سے میری معلومات میں بہت اضافہ ہوا۔ میری تمنا ہے کہ ہر سال ہندوستان اور پاکستان میں اس طرح کی ایک کانفرنس ضرور منعقد ہونی چاہئے تاکہ اردو کے مسائل پر تبادلہ خیال ہو سکے۔ اس کامیاب اور شاندار کانفرنس اور مشاعرے کے انعقاد کے لئے میں منتظمین حضرات کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

خلیق انجم

23-4-92

عالمی اردو کانفرنس اور عالمی مشاعرے میں شرکت کرتے ہوئے مجھے انتہائی مسرت ہو رہی ہے۔ ملتان کا اولیاء اللہ کی سرزمین اور دنیا کے نہ صرف قدیم ترین شہروں میں شمار کیا جاتا ہے بلکہ اپنے ثقافتی اور تہذیبی ورثے کی وجہ سے ایک تاریخ ساز شہر بھی تسلیم کیا جاتا ہے ایسے شہر میں عالمی اردو کانفرنس اور مشاعرہ کا انعقاد کیا جانا ایک نیک فال ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ نہ صرف بھارت اور پاکستان کے ممتاز ادیب و شاعر اس تقریب میں شرکت کر رہے ہیں بلکہ دوسرے ممالک سے بھی اہل قلم شریک ہو رہے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ یہ کانفرنس اُردُو زبان کی ترقی و ترویج کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔ مشاعرے بھی ہماری تہذیبی روایت بن چکے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ مشاعرے اردو زبان کو خواص کی محفلوں سے نکال کر عوام تک پہنچانے میں ایک اہم رول ادا کر رہے ہیں

اطہر نبی

maablib.org

maablib.org